وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

سیرت سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم

حصّہ سوم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ
عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (الصف ۶۱:۹)

وہی ذات ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ
بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک برا منائیں۔

سیرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم

(شبہات اور اعتراضات کے جوابات)

حصہ سوم

(جزاوّل)

مصنف

پروفیسر (ر) غلام رسول چیمہ

ایم۔اے، ایل ایل بی

PUBLISHERS

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 042-37233909-37243055
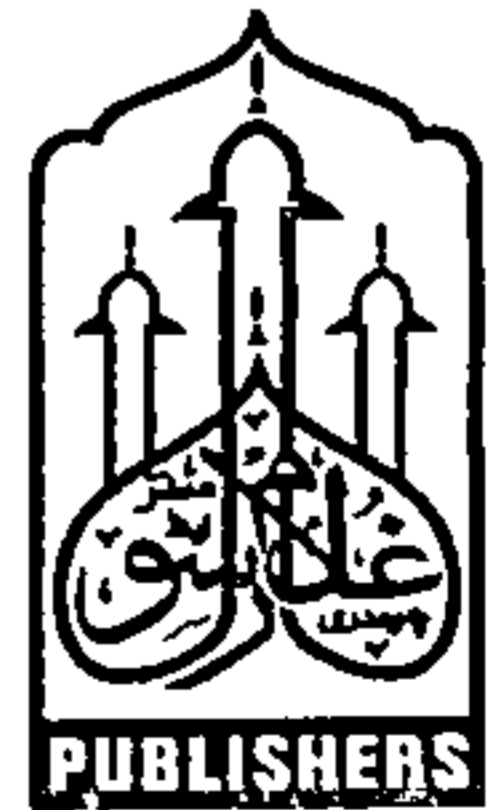
نام کتاب : سیرت سید البشر ﷺ شبہات اور اعتراضات کے جوابات (حصہ سوم)

مصنف : پروفیسر (ر) غلام رسول چیمہ۔ ایم اے۔ ایل ایل بی

کمپوزنگ : سپیڈ گرافکس

ناشر : چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

پریس : اے۔ وائی پرنٹرز، آؤٹ فال روڈ لاہور فون: 37151047

اشاعت : 2011ء

قیمت : -/450 روپے

نوٹ:

قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔ شکریہ (ادارہ)

چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز

الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون: 37243055-37233909-042

تقدیم

"سیرت النبیؐ" ایک ایسا موضوع ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد ہی اس موضوع پر لکھا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی تیاری رسول اللہ ﷺ کے عہد حیات میں شروع ہو گئی تھی۔ جو صحابہ آپؐ کے اقوال قلمبند کرتے تھے وہ دراصل آپ کی سیرت مرتب کر رہے تھے۔ بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ یہ موضوع ترقی کرتا چلا گیا ہزاروں کتب لکھی گئی ہیں اور مستقبل میں لکھی جائیں گی۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے، دوم رسول کریم ﷺ کے ساتھ ذہنی قلبی اور روحانی وابستگی کی وجہ سے یہ ایک بڑی خواہش تھی کہ اس موضوع پر اپنی علمی استعداد کے مطابق لکھوں اور اس جذبہ کے پیچھے صرف یہی قلبی تمنا کارفرما تھی کہ آخرت کا سامان پیدا کروں۔ سو دو حصے مکمل ہو چکے ہیں۔ پہلے حصے میں سیرت کی اہمیت اور اس کا ارتقاء، تحریک استشراق اور سیرت النبی، عرب کا جغرافیہ، مکی زندگی، مدنی زندگی، معجزات، خصائص اور رسول کریم ﷺ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے تیسرا حصہ مخالفین اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ پہلا جزو ہے خیال ہے مزید دو جزو "اعتراضات کے جوابات" پر لکھے جائیں گے جب خاکسار نے اعتراضات کے جوابات لکھنے شروع کئے تو معلوم ہوا کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور میرے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ شروع سے ہی دل میں یہ ایک خواہش تھی کہ سیرت النبیؐ کے ساتھ اس اہم موضوع کو شامل کروں چنانچہ اللہ سے دُعا کر کے لکھنا شروع کیا کہ خدا کا بڑا فضل ہے کہ اس نے میری راہنمائی کی۔ مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دینے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو قارئین اور خصوصاً علماء ہی بتا سکیں گے۔ بہر حال نقلی اور عقلی دلائل کے ساتھ اعتراضات کا رد کیا ہے۔

شکریہ کے مستحق چودھری غلام یزدانی پروپرائیٹر ادارہ غلام رسول اینڈ سنز اُردو بازار لاہور ہیں جنہوں نے اس بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ سیرت النبیؐ کے علاوہ میری دوسری کتب مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، اسلام کا عمرانی نظام، اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا اقتصادی نظام اور تاریخ اسلام، مسلمانوں کا عروج و زوال، شائع کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ بقیہ تیسرا حصہ (اعتراضات کے جوابات) جلد مکمل کر کے قارئین کے سامنے پیش کر سکوں اور اس ناتمام دینی مساعی کے ساتھ خدا کے سامنے پیش ہوں اور رسول کریم ﷺ کی شفاعت کا طلب گار بنوں۔

خاک پائے محمد غلام رسول چیمہ
15 کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

15-5-2010

فہرست

......☆☆☆......

باب اوّل:

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

پیشتر اس کے کہ معترضین اسلام کے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں پہلے مذاہب عالم کی کتب اور تعلیمات پر سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ تا کہ اسلام اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ ہو جائے۔ اور قارئین یہ سمجھ سکیں کہ اسلام کی تعلیمات کا ماخذ اور منبع نصرانیت، یہودیت یا اور کوئی مذہب نہیں بلکہ اس کا منبع بھی وحی الٰہیہ ہے جو اسلام کی رو سے تمام مذاہب کا سرچشمہ رہی ہے۔ دوم یہ بات بھی قارئین پر واضح ہو جائے گی کہ تمام مذاہب مرور زمانہ سے اپنی اصل شکل مسخ کر چکے تھے۔ اور اسلام نے ان کی مسخ شدہ شکل کو اجاگر کر کے از سرِ نو تزئین کی اور غلط عقائد کی اصلاح کی۔ سوم یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اور اسی میں دنیا اور آخرت کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ اس کے بعد معترضین کے جوابات دیئے جائیں گے۔ ما توفیقی إلّا باللہ۔

ہندومت

ہندو دھرم کے منابع:

ہندو دھرم کے چھ منابع ہیں۔ (1) شرتی۔ (2) سمرتی۔ (3) اتہاس۔ (4) پران۔ (5) اگم۔ (6) درشن۔

1۔ شرتی کا لفظی مطلب ہے جسے "سنا جائے۔" رشی ابدی صداقتوں کو سنتے اور تجربہ کرتے۔ اور لوگوں کی فلاح کے لیے اپنے تجربات کو احاطہ تحریر میں لاتے۔ اس سرچشمہ میں چاروں وید شامل ہیں۔

2۔ سمرتی کا مطلب ہے "جسے یاد کیا جائے شرتی کے بعد اس کی زیادہ اہمیت ہے۔ سمرتیوں کی بنیاد ویدوں کی تعلیمات پر ہے۔ اس میں اپنشد شامل ہیں۔

3۔ اتہاس یعنی تواریخ اس میں معروف رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت شامل ہیں۔

4۔ پران ویدوں کی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے لکھے گئے، کل اٹھارہ پران ہیں۔ جن میں بھگوت اور وشنو پران مقبول تر ہیں۔

5۔ اگم عوامی صحائف کی ایک قسم ہے۔ ان میں دینیاتی مقالے اور پوجا کی عمومی ہدایات شامل ہیں۔ شیومت، شکتی مت اور وشنومت کے تین مرکزی فرقوں کی بنیاد اگموں کے عقائد پر ہے۔

6۔ درشن، درشن کے معنی روشنی یا دیکھنا ہے۔ درشن چھ ہیں:

(i) نیایہ۔ (ii) ویشک۔ (iii) سانکھیہ۔ (iv) یوگ۔ (v) میماسا۔ (vi) ویدانت۔

ہندومت کی کتب:

ویدوں کا بیان: ہندو اپنی مذہبی کتب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

شرتی: یعنی کانوں سے سننا جسے مکاشفہ کہا جاتا ہے۔

سمرتی: یعنی باپ دادوں کی طرف سے پہنچا۔ جسے حدیث یا روایت کہنا چاہیے حصہ اول تو ویدوں پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے حصے میں ساری کتب شامل ہیں جو ویدوں کے علاوہ ہیں۔

وید:

لفظ وید[1] کا مصدر ود ہے جس کے معنی ماننا، سوچنا، موجود ہونا، غور کرنا اور حاصل کرنا ہیں۔ لفظ "وید" معروف کتب کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ وہ لٹریچر ہے جو تقریباً دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندیوں نے مختلف علوم ورسوم سے متعلق جمع کیا اور اس کا نام وید رکھ دیا۔

ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا اپنی مشہور کتاب " A History of Indian Philosophy Vol 1 " میں لکھتے ہیں:

"ایک مبتدی جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے یہ دیکھ کر پریشانی محسوس کرے گا کہ متضاد مطالب، اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں۔ لیکن ان سب کا نام وید یا شرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لیے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ وتاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف وجوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا اس لیے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ (صفحہ 12, 11)

لفظ وید صرف ان معروف کتب کا نام ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسری کئی ایک کتب کو بھی یہ نام دیا گیا ہے جیسے آیوروید (طب) سرپ وید (سانپ کا وید) پشاچ وید (چڑیلوں کا وید) اسروید (شیطانوں کا وید) دھروید (تیر کمان کا وید) اتہاس وید (تاریخ) پران وید (قصے کہانیوں کا وید)

وید کا موضوع:

نرکت جو وید کی مستند لغت ہے اس میں لکھا ہے کہ جس مقصد کو جس دیوتا کے ذریعہ رشی نے پورا ہوتا جان کر اس کی تعریف کی ہے وہی اس دیوتا کا منتر ہے۔ اسی طرح گوناگوں مقاصد سے رشیوں نے منتر لکھے ہیں (نرکت ادھیائے کھنڈ 21) وید کی انو کرمینکا میں ہے:

"ارتھے پشو ارشیو دیوتاش ابھی دھاون۔"

رشی مقاصد کو لے کر دیوتاؤں کی طرف بھاگے۔ گویا ویدوں کا موضوع اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے دیوتاؤں کی تعریف اور التجائیں کرنا ہے۔

خود وید میں لفظ وید دنیوی مال ومنال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے گویا وید اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔

ویدوں کی تصنیف کی غرض وغایت:

ہر مصنف اپنی کتاب کے آغاز میں اپنی تصنیف کی غرض وغایت بیان کرتا ہے۔ رگ وید اگنی سے شروع ہوتا ہے۔ اگنی کی پرستش اسی غرض کے لیے سکھاتا ہے۔ اس کے پہلے سوکت میں اسی کی حمد وثناء کے بعد منتر میں لکھا ہے "اگنی کی مہربانی" سے پرستش کرنے والے کو دولت ملتی ہے۔ جو دن بدن ترقی کرتی جاتی ہے۔"

اگنی کے بعد دوسرے درجہ پر اندر دیوتا کی تعریف کی گئی ہے۔ اندر آریوں کے لیے ان کے مخالفوں سے دولت غصب کر کے لاتا ہے اور یہ ان کی ہری بھری کھیتیوں کو پکاتا ہے اور یہ (پانی) کھیتیوں اور لوگوں کی پیاس کو بجھاتا ہے۔ گویا ویدوں کی تصنیف کی غرض وغایت آگ ہوا

[1] وید کو سمہتا بھی کہا جاتا ہے، سمہتا کے معنی ہیں مجموعہ مناجات۔

سورج اور پانی کی پرستش کرنا پھران کے ذریعہ سے دنیوی فوائد حاصل کرنا ہے۔

وید بلحاظ تقسیم چار ہیں

(1) رگ وید:

اس کے دس ہزار منتر ہیں جو 1017 یا 1028 سوکتوں (گیت) اور دس منڈلوں (ابواب) میں تقسیم ہے۔ سارا وید نظم میں ہے اس میں خداؤں کی تعریف اور بزرگی کے گیت ہیں اور دیوی دیوتا کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں کی گئی ہیں۔ رگ وید سب ویدوں سے پرانا وید ہے۔ اگرچہ ''پرانوں کی رو سے سب سے پہلے یجر وید تھا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر چار وید بنائے گئے ہیں (ہندوازم ص 93 مصنفہ پروفیسر گووند داس) اس پر سائیں اچاریہ نے سنسکرت میں بھاشیہ لکھا ہے جب کہ ولسن اور میکس ملر نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

رگ وید کا بیشتر حصہ گندھارا پنجاب اور مشرقی پنجاب میں لکھا گیا کچھ حصہ سندھ اور بلوچستان میں لکھا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کا زیادہ تر حصہ اراکوسیا اور بلوچستان کے ایران کے ساتھ متصل سرحدی علاقے میں لکھا گیا۔

(History of the punjab by joshi, vol 1 P / 142)

(2) یجر وید:

یہ سارا رگ وید سے ماخوذ ہے۔ قربانیوں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ یگیہ میں استعمال ہونے والی اشیاء کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ واجسنی سمہتا (سفید یجر وید) اور تیتریہ سمہتا (کالا یجر وید) تیتریہ سمہتا 600 ق۔م سے پہلے لکھا گیا۔

(3) سام وید:

اس وید میں محض راگ اور گیت ہیں۔ رگ وید سے نصف ہے۔ تمام تر منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں، صرف 75 بھجن اس کے اپنے ہیں، تمام وید خالصتاً بھجنوں کی کتاب ہے۔ اس سام وید کو الگ سے مدون کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے بھجن مخصوص لوگوں میں گائے جائیں۔ سوم یگیہ پر گایا جائے، تاریخی لحاظ سے اسی وید کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ سائیں اچاریہ نے بھاشیہ لکھا ہے۔

(4) اتھر وید:

اس میں کل چھ ہزار منتر ہیں جو چوبیس ادھیاؤں میں تقسیم کئے گئے ہیں، تقریباً ایک ہزار دوسو منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں، نصف کے قریب نثر میں ہے۔ اس کا زیادہ حصہ جادو سے متعلق ہے۔ یہ وید قدیم آریوں کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ہمہ اوست کی تعلیم ہے۔

ہر وید مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ سنگھیتہ بھاگ یا منتر بھاگ جس میں دیوی دیوتاؤں کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں مانگی گئی ہیں۔

2۔ براہمن بھاگ اس حصہ میں منتروں کی تشریح اور جائے استعمال بیان کی گئی ہے۔ ہر وید کے ایک یا دو براہمن ہیں۔ غالباً برہمنوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے آٹھویں اور پانچویں صدی ق۔م کے درمیان تصنیف کئے گئے۔

3۔ ارنیک وہ حصہ جو جنگلوں میں تصنیف کیا گیا یا جنگلوں میں جا کر پڑھا جاتا ہے۔

یاسیک منی مصنف نرکت:

ویدوں کی ڈکشنری کے نزدیک ویدوں کے صرف دو ہی حصے ہیں۔ یعنی سنگھیتہ بھاگ اور منتر بھاگ۔ ارنیک صرف برہمنوں کا حصہ ہیں۔

اصل وید گم ہو گیا ہے:

مہابھارت شانتی پروشلوک 13475 میں لکھا ہے کہ دو اسر (یعنی جن) جنہوں نے برہما کو دنیا پیدا کرنے میں مدد دی تھی وید کو چرا کرلے گئے۔ اس پروا کے شلوک 135:6 میں یہی لکھا ہوا ہے۔ وشنو پران 12:2:3 میں ہے کہ چار یگوں کے آخر پر ویدوں کا گم ہو جانا کل "یگ کا حادثہ ہوا تو سات رشی آسمان سے ظاہر ہوئے اور انہوں نے پھر ان کو جاری کیا۔

مہابھارت شانتی پروا میں ویدوں کے گم ہونے پر برہما کے واویلا کا ذکر کیا گیا ہے "وید میری قوت اعلیٰ ہے...... ویدوں کے بغیر میں کیا کروں گا۔ وید دنیا میں اعلیٰ وجود ہے" نہ صرف مہابھارت اور پرانوں میں اس کا ذکر ہے بلکہ رگ وید اوی بھاشیہ بھومکا (دیانند) کی تمہید میں لکھا ہوا ہے کہ جو زمانہ ویدوں کی تعلیم کا مستشرقین بیان کرتے ہیں وہ دراصل ویدوں کا رواج نہ رہنے کا زمانہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وید کا تواتر تاریخی مفقود ہے۔

مہابھارت شلیہ پروا (Shalya Parva) میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ملک میں بارہ برس تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے سخت قحط پڑا۔ سب رشی معاش کی تلاش میں دیش چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے گئے اور وید اُن کے ذہنوں سے بالکل محو ہو گیا۔ لیکن دریائے سرسوتی کا بیٹا رشی سرسوت اپنے دیش میں مقیم رہا۔ ایک مچھلی پر گزارہ کرتا رہا۔ جو اس کی ماں (دریائے سرسوتی) اسے روزانہ کھانے کے لیے دیتی تھی، سرسوت نے ویدوں کو دوبارہ قائم کیا اور رشیوں کے واپس آنے پر ان کو ویدوں کی تعلیم دی۔ (ہندوازم صفحہ 83)

بدھ چرتر میں بھی لکھا ہے کہ وید مکمل طور پر بھول گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو ابتداء میں وید لکھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے بارہ دفعہ وید ضائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ وید براشر کے بیٹے بیاس ودیا نے از سر نو ان کی تجدید کی۔

وید کتنے ہیں:

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ویدوں پر ایک ایسا زمانہ آیا جب وہ اس دنیا سے اُٹھ گئے تھے تو لازمی طور پر ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہوگا اور تحریف اور تبدیلی بھی ہوئی ہوگی۔

وشنو پران میں لکھا ہے کہ شروع میں وید صرف ایک ہی تھا جس میں ایک لاکھ منتر تھے۔ اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد یہ حصے آپس میں مل جل گئے۔ اور کئی حصے بھول بھی گئے۔

دواپر یگ کے شروع میں کرشن دوئی پائن Krishan dawai Pain یا دیاس نے اس ایک کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔[1] اور ویدوں کی تعلیم کو رواج دینے کے لیے اس نے چار شاگردوں یعنی پیلاد، وئی شمپائن، جیمنی اور سومنت کو علی الترتیب رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھروید سکھائے، پھر ان تلامذہ نے اپنے شاگردوں کو سکھائے۔

یہ امر تاریخی شواہد سے واضح ہے کہ دیاس کئی ہوئے ہیں۔ اور کئی بار ویدوں کی ترتیب و تدوین ہوئی ہے۔ پہلے ایک وید کو چار حصوں (رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید) میں تقسیم کیا گیا پھر ہر وید کو سنگھیتہ، براہمن اور ارنیک میں بانٹا گیا پھر۔ یجر وید کے دو حصے کیے گئے ہیں یعنی شُکل یجر وید Shukal yajer veda اور کرشن یجر وید (Krishan yajer veda) اس طرح چار سنگھیتاؤں کی بجائے پانچ سنگھیتا ہو گئیں۔ (1) رگ وید سنگھیتہ۔ (2) تیتریہ سنگھیتہ۔ (کرشن یجر وید)۔ (3) واجنی سنگھیتہ (شُکل یجر وید) (4) سام وید سنگھیتہ۔

---

[1] عام مذہبی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ منتروں کی ایک کتاب "اوِگ" پہلے سے موجود تھی۔ جس کو بعد میں رشی دیاس نے ترتیب دے کر چار حصوں رگ، یجر، سام اور اتھر میں اس کی درجہ بندی کی (ہندوازم ص 32)

(5) اتھروید سنگھیتہ۔

شُکل یجروید پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔(1) کنو (Kanva) اور (Mad ayandini) اتھروید کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔(2) پیپلادا (Pippa lada) شونک (Shaunak) ہر ایک وید کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ براہمن الحاق کر دیئے گئے۔ جیسے رگ وید کے چار کرشن یجروید کے چار، شکل کا ایک، سام وید کے آٹھ اور اتھروید کا ایک براہمن ہے۔

اپنشدوں کو بھی وید کا حصہ قرار دیا گیا۔کم وبیش 108 اپنشد بتائے جاتے ہیں مگر سناتن دھرم کے عالم پنڈت جواہر پرشاد نے 18 تسلیم کئے ہیں اور شنکرا چاریہ نے سولہ (16)۔

بانی آریا دیانند صاحب سرسوتی ہر وید کے ساتھ صرف سنگھیتہ (منتر) بھاگ کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ براہمن اپنشد وید وغیرہ کو وید کا حصہ قرار نہیں دیتے۔ مگر سناتن دھرم والے براہمن اور اپنشدوں کو وید کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں۔

ایک ایسا وقت بھی تھا جب وید صرف تین شمار ہوتے تھے۔ چوتھے وید کو بعد کی تصنیف خیال کیا جاتا تھا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ وید تعداد کے لحاظ 1131 ہیں (مہا بھاشیہ پاتنجلی) پس ویدوں کی تعداد کے بارے میں شدید اختلاف ہے ایک نظریہ یہ ہے کہ وید ایک ہی تھا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وید تین ہیں [1] تیسرا نظریہ یہ کہ وید چار ہیں ایک خیال یہ ہے کہ وید پانچ ہیں [2] ایک خیال یہ ہے کہ ویدوں کی تعداد 1131 ہے۔

مہا بھاشیہ جو دیانند جی کے نزدیک ایک مستند کتاب ہے اس میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی۔

یجروید کی 101 شاخیں ہیں ہزار طرح کے سام وید، 31 طرح کا رگ وید اور 9 طرح کا اتھروید ہے۔ان کی مجموعی تعداد 1131 ہوتی ہے۔

سوامی دیانند جی نے اس حوالہ کو صحیح مانا ہے مگر اس میں چار کو وید اور باقی کو وید کی شرح بتاتے ہیں۔

یہ توجیہہ غلط ہے۔ کیونکہ وید کی 127 شرحیں ہونے کا کوئی ثبوت کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ چاروں وید جن کو آریہ اصل بتاتے ہیں کئی شاخوں میں شامل ہیں۔

مہا بھاشیہ کے مذکورہ حوالہ کے علاوہ شٹر گروشش نے بھی لکھا ہے کہ وید کی 1137 شاخیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وید ابتداء میں ایک تھا۔اس کے بعد تین ہوئے پھر ان میں اضافہ در اضافہ ہو کر چار بنے، اس کے بعد برہمنوں کی ذاتوں کے مطابق تیرہ ہو کر 1131 وید بنے اور بالآخر وید بے شمار ہو گئے۔ جیسا کہ تیتریہ برہمن 3:10:11:24 میں لکھا ہے "وید بے شمار ہیں۔"

ویدوں میں تحریف کا ثبوت:

ویدوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تحریف وتبدیلی سے پاک نہیں ہیں۔

---

[1] تین ویدوں کا نظریہ لفظ ترئی (Trayi) سے قائم ہوا ہے یعنی ترئی ودیا سے مراد تین وید ہیں (رگ وید، یجروید، سام وید) اس کا ثبوت ویدک اور غیر ویدک لٹریچر سے ملتا ہے۔اس نظریہ کے قائلین کا یہ کہنا ہے کہ ابتداء میں تین وید تھے۔ اتھروید، بہت بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ شت۔ پتھ برہمن میں وید تین ہی بیان کئے گئے ہیں۔ گیتا میں تین ویدوں کا ذکر ہے۔

[2] یداپی (اگرچہ وید چار ہیں پر کسی کسی نے پانچ بھی مانے ہیں) رگ وید، کرشن یجروید شکل یجروید، سام وید، اتھروید بھارت درش کا دھارمک اتہاس ص 35)

اتھرووید میں تحریف کے ثبوت:

سوامی دیانند نے رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا ہندی کے صفحہ 860 پر لکھا ہے کہ اتھر وید کا پہلا منتر "اوم وشنودیوی" ہے۔ لیکھرام نے کلیات آریہ مسافر میں لکھا ہے کہ پہلا منتر "اوم وشنودیوی" ہے۔ مہابھاشیہ کے مصنف کا نظریہ ہے پہلا منتر "اوم وشنودیوی" ہے۔

لیکن موجودہ وید کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منتر چھبیسواں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پچیس منتر بعد میں ملائے گئے ہیں۔

اتھر وید منتروں کی تعداد میں اختلاف:

سائیں بھاشیہ 5977 سیوک لال 5047، ساتولیک 700، ویدک سدھانت 600۔

یجر وید میں تحریف:

یجر وید میں بمبئی والے میں 125 دھیائے کے 47 منتر ہیں لیکن دیانند نے جو اجمیر سے چھپوایا ہے اس میں 48 ہیں۔ یجر وید کے 40 ادھیائے میں "اوم کھم برہم" بمبئی والے میں منتر کا جز نہیں ہے لیکن دیانند نے اس کو منتر میں شامل کر دیا ہے۔

یجر وید بھاشہ بھاشیہ دیانند ادھیاء 9 منتر 20 میں ایک لفظ "گمیات" ملایا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء 25 منتر 48 میں پورا منتر زیادہ کیا گیا ہے۔ کسی سناتنی نسخہ میں نہیں ہے۔

یجر وید بھاشہ بھاشیہ دیانند ادھیاء 26 منتر 21 میں لفظ "اگناوہ" کو "گراوا" بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ دیانند ادھیاء 26 منتر میں لفظ "ایوہتے" کو "اپوہتے" بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشا بھاشیہ ادھیاء 16 منتر 38 میں لفظ "میدھیاء" کو ناموزوں سمجھ کر "میگھیاء" بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشیہ دیانند ادھیاء 38 منتر 14 میں "گھرم" کو نامناسب سمجھ کر "دھرم" بنا دیا گیا ہے۔

یجر وید بھاشیہ دیانند ادھیاء 38 منتر 14 میں لفظ سگھرم کو نامناسب سمجھ کر "سُدھرم" بنا دیا گیا ہے۔

تعداد منتروں میں اختلاف:

یجر وید کے کل منتر دیانند کے نزدیک 1975 ہے۔

2- یجر وید کے کل منتر سات ولیکر کے نزدیک 145 ہیں۔

3- یجر وید کے کل منتر شوشنکر کے نزدیک 987 ہیں۔

4- یجر وید کے کل منتر سوامی ہری پرشاد کے نزدیک 1000 ہیں۔

سام وید میں تحریف:

سام وید میں سب ویدوں سے زیادہ تحریف ہوئی ہے، اس وید میں 70 منتر چھوڑ کر سارا رگ وید سے ماخوذ ہے یعنی 1800 منتر اس میں رگ وید کے ہیں۔

یہ وید جونا گڑھ کے مطبع سمت دھرم سوریہ پرکاش، کلکتہ، بنارس، لاہور اور اجمیر میں چھاپا گیا ہے۔ اجمیر میں یہ نسخہ آریوں نے شائع کیا جو سب نسخوں سے مختلف ہے۔ ان کے مطبوعہ سام وید میں مہانا منی سوکت کے 10 منتر اور ارنیک ادھیاء کے 55 منتر جو علماء سلف کے

نزدیک وید کا جز نہیں اسے بھی وید میں ملا دیا گیا ہے۔ سائیں آچاریہ نے ان منتروں کو الگ رکھا ہے۔ جیوانند والوں نے اسے چھاپا ہی نہیں۔

ہر مطبع کے مطبوعہ سام وید کے منتروں کی تعداد میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف حسب ذیل ہے:

1- اجمیر میں آریاؤں کے مطبوعہ سام وید میں منتروں کی تعداد 1824 ہے۔

2- جیوانند ودیا ساگر کے مطبوعہ سام وید میں تعداد 1808 ہے۔

3- پنڈت شوشنکر آریا پنڈت کے حساب سے تعداد 1549 ہے۔

4- پنڈت سات ولیکر کے نزدیک منتروں کی تعداد صرف 70 ہے۔

5- سوامی ہری پرشاد جی نے 65 منتر کا نیا سام وید شائع کیا ہے۔

منتروں کے علاوہ قدیم نسخوں میں اختلاف کثرت سے ہے۔ اس لیے پنڈت جے دیو شرما کا سام وید یعنی وید بھاشیہ مطبوعہ اجمیر کے حواشی ملاحظہ کیے جائیں۔

رگ وید میں تحریف:

رگ وید کے مختلف نسخوں میں منتروں کی تعداد میں کافی اختلاف ہے، ذیل میں اعداد و شمار کے لحاظ سے اختلاف کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

1- انوواک انوکرمنی کی رو سے 1580

2- گاتیری وغیرہ اوزان شعری کی رو سے 10142

3- سائیں آچاریہ کی گنتی تقریباً 10000

4- پنڈت دیانند بانی سماج 10589

5- پنڈت شوشنکر آریہ 10402

6- پنڈت جگن ناتھ 15452

7- مہی داس شارع چرن ویوہ 10472

8- ستیہ ورت شاستری 10442

9- ہری پرشاد وید لک منی 10000

ہندو علماء بھی ویدوں میں تحریف و تبدل کے معترف ہیں۔

1- پنڈت ویدک منی صاحب اپنی کتاب وید سروسو کے صفحہ 97 پر رقمطراز ہے:

''حقیقت میں جس قدر بری حالت اس اتھروید کی ہوئی ہے اتنی اور کسی وید کی نہیں ہوئی۔ سائیں آچاریہ کے بعد بھی کئی سوکت اس میں ملا دیئے گئے ہیں۔ ملانے کا ڈھنگ بہت اچھا سوچا گیا۔ وہ یہ کہ پہلے اس کے شروع اور آخر میں ''اتھ'' (شروع) اور اتی (ختم) لکھ دیا جاتا تھا۔ جب دیکھا کہ کسی نے پوچھا تک نہیں تب شروع اور آخر میں ''اتھ'' اور ''اتی'' لکھنا بند کر دیا۔ پس صرف اتنے سے وہ (یعنی اضافہ) سنہتا (ویدک مجموعہ) میں مل جاتا تھا جیسے رگ وید سنہتا میں بالکھلیہ سوکت ملائے جا رہے ہیں ویسے ہی اتھروید کے آخر میں آج کل کتاب سوکت ملائے جا رہے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ پانچیں انوواک سے لے کر کنتاپ سوکتوں سمیت جتنے سوکت اتھروید میں ملائے جا رہے ہیں وہ

کہاں سے آئے تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ جہالت کا اتنا دور دورہ ہے کہ آخر میں اتھروید سنہتا سا پتا لکھا ہوا دیکھ کر ہی یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ بس جو کچھ اس خاتمہ تک چھپا ہوا یا لکھا ہوا ہے وہ سب اتھروید سنہتا ہے۔ یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ چھاپنے والا یا لکھنے والا کون ہے اور کتنی قابلیت رکھتا ہے۔

2- پنڈت مہیش چند پرشاد بی اے سنسکرت ساہتیہ کے اتہاس جلد دوم کے صفحہ 160 پر لکھتا ہے:

''واجسنئی شکل یجروید سنہتا بالکل نئی طرز پر ہے اس میں وید اور برہمن بھاگ (حصے) الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ اس میں چالیس ادھیائے ہیں مگر لوگوں کو وشواش ہے کہ ان میں 18 اصل ہیں اور باقی بعد میں ملائے گئے ہیں۔ ادھیائے اسے 18 تک بھاگ تیتری سنہتا و کرشن یجروید کے نظم ونثر سے مطابقت رکھتا ہے۔

ان 18 ادھیاؤں کے ہر ایک لفظ کی تشریح اس کے برہمن سے ملتی ہے مگر باقی 17 ادھیاؤں کے صرف تھوڑے تھوڑے منتروں پر ہی اس میں ٹپنی (حواشی) پائی جاتی ہیں۔ کاتیائن نے ادھیائے 26 سے 35 تک کو کھل (ملاوٹ) کے نام سے لکھا ہے۔ ادھیائے 19 سے 25 میں بھی یگیہ کے طریقوں کا ذکر ہے۔ یہ تیتری سنہتا سے نہیں ملتے۔ 26 سے لے کر 29 ادھیاؤں تک کچھ خاص پرانی یگیوں کے متعلق منتروں کا ذکر ہے جس کے بارے میں پہلے ادھیاؤں میں بیان ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور بعد میں ملا دیئے گئے ہیں۔

3- پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا فروری 1931ء صفحہ 432 پر لکھتا ہے:

''پہلے تو آج تک فیصلہ نہیں ہوا کہ وید چار ہیں یا تین۔ منوسمرتی شت پتھ براہمن کی رو سے رگ وید، یجروید اور سام وید، یہ تین وید ہیں اور رواجسنئی اپنشد، ہریمنو اپنشد اور منڈک اپنشد کی رو سے چار وید ہیں۔

4- پنڈت ہردے نرائن ایم۔ ایس۔ سی رسالہ گنگا بابت ماہ جنوری 1931ء صفحہ 233 پر لکھتا ہے:

''شونک رشی کے دیوہ وغیرہ تصانیف میں وید منتروں اور ان کے لفظوں اور حرفوں تک کی جو گنتی دی ہوئی ہے وہ موجودہ ویدوں میں نہیں ملتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں میں کئی منتر ملائے گئے ہیں اور کئی نکالے گئے ہیں۔

5- پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا بابت ماہ فروری 1931ء صفحہ 231 پر لکھتا ہے:

''جس وقت چونک رشی کا چرن ویوہ تصنیف ہوا۔ اس میں شاکل سنہتا (رگ وید) کے ایک لاکھ 53 ہزار آٹھ سو چھبیس الفاظ، چار لاکھ 32 ہزار حروف اور دس ہزار چھ سو بائیس منتر تھے مگر آج کل گنتی کرنے پر یہ تعداد نہیں ملتی۔

6- ڈاکٹر تاراچند چودھری ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر پٹنہ کالج رسالہ گنگا وید نمبر بابت ماہ جنوری 1932ء کے صفحہ 74 پر لکھتا ہے:

''ان کے علاوہ ویدوں میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشدھ پاٹھ (غلط متن) معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والوں اور لکھنے والوں کی خامیوں کے باعث کئی قسم کی غلطیاں واقع ہو گئی ہیں۔''

پنڈت ویدک منی جی اپنی کتاب وید سروسو کے صفحہ 105، 106 پر لکھتا ہے:

''گوپتھ براہمن کا زمانہ تصنیف میں وہ زمانہ ہے جب کہ یگیوں کا عروج تھا۔ اس زمانہ میں رگ ویدی، یجرویدی، سام ویدی، سام ویدی اور اتھرویدی ایک دوسرے سے اینٹھے ہوئے تھے اور مختلف قسم کے فرائض اور من گھڑت طریقوں سے یگ وغیرہ کرنے میں محو تھے اور ان میں سے جس جس کو رگ وید کے جس قدر منتر مطلوب تھے وہ اس نے اپنے اپنے وید میں شامل کر لیے تھے اور ہر ایک اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا تھا اور دوسروں سے نفرت کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شاکھا بھید (نسخوں کے اختلاف کے باعث) رگویدی رگویدی سے یجرویدی یجرویدی

سے سام ویدی سام ویدی سے اور اتھرو ویدی اتھرو ویدی سے الگ ہوگیا تھا۔واشک سنہتا والا شاکل سنہتا (یجر وید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کو تھم سنہتا والا پپلا دسنہتا (یہ اتھرو وید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کے پاٹھ (متن) کو سب سے اعلیٰ اور خالص اور دوسری شاکھا (نسخے) کے متن کو قطعی برا اور غلط کہتا ہے۔آج وید کے مختلف نسخوں میں طرح طرح کے جو اختلافات نظر آتے ہیں یہ اکثر اسی برے زمانے میں جنم پائے ہوئے ہیں۔

8- اسی کتاب کے صفحہ 109 پر لکھتا ہے:

''یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس وقت اتھرو وید کی صرف دو شاکھا سنہتا (مختلف نسخے) ملتے ہیں، ایک پپلا دسنہتا اور دوسری شونک سنہتا، دونوں میں پپلا دزیادہ لائق تسلیم ہے لیکن وہ چھپی نہیں اور نہ ہی اس پر سائیں آچاریہ نے تفسیر کی ہے۔دوسری شونک سنہتا چھپی ہوئی ملتی ہے جس کے تین ایڈیشن مختلف پریسوں کے چھپے ہوئے ملتے ہیں جن میں دو مول (صرف متن) اور ایک سائیں آچاریہ کی تفسیر کے ساتھ چھپی ہے دونوں مول میں سے ایک ویدک پریس اجمیر کی اور دوسری بمبئی پریس کی چھپی ہوئی ہے۔اس کا چھاپنے والا سیوک لال ہے۔تینوں میں سوکتوں (بابوں) اور منتروں میں اختلاف ہے۔

مسٹر گووند داس لکھتے ہیں کہ ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں ویاس کے مرتب کردہ نسخے کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے کہ روایات کی رو سے ویاس بھی کئی ہوگزرے ہیں اور اس کے علاوہ ویدوں کے کئی اور ترتیب دہندگان۔سنہتا لٹریچر جو آج ہمارے پاس موجود ہے وہ تو اس مجموعہ کا پانچواں حصہ بھی نہیں جو آج کے قریب 2200 سال پیشتر ہی بھارت کے زمانہ میں موجود تھا (ہندوازم ص 84)

کیا موجودہ وید الہامی ہیں:

موجودہ وید الہامی نہیں ہیں، وید کے الہامی نہ ہونے کا اقرار ہندو علماء کو بھی ہے۔

سروانو کرجو وید سے متعلق ایک اہم کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ جس کا کلام ہے وہ رشی ہے۔

یعنی کلام الہامی نہیں بلکہ رشیوں کا ہے۔'' (4:2) تیتریہ ارنیک اپنشد جو مستند ہے، اس میں ہے''سہ دیوتا جس کا کلام ہے وہ رشی ہے۔'' نرکت میں یاسک آچاریہ کہتا ہے۔ایک رشی کتس بھی ہے منتروں کے بنانے والا''

پنڈت ستیہ ورت شری اپنی تصنیف وید تری پریچے کے صفحہ 74 پر لکھتا ہے: ایسا ہی یہ امر ثقہ ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں نے ہی ویدوں کو تصنیف کیا۔''

پنڈت نردیو شاستری لکھتا ہے کہ اپنی کتاب رگوید آلوچن بھومکا (تمہید) میں مسٹر تلک کے متعلق لکھتا ہے:''تلک بھی برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے کا عقیدہ) کا کھنڈن (تردید) کرتے ہیں'' (رگ وید الوچن کی بھومکا)۔

سوامی ہری پرشاد، لالہ لاجپت رائے، بھائی پرمانند ایم اے وغیرہ بھی ویدوں کو الہامی نہیں مانتے بلکہ صرف اپنے بزرگوں کی یادگار سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔[1]

پنڈت رادھا کرشن مشہور پروفیسر ہندو فلاسفی بنارس یونیورسٹی اپنی کتاب''فلاسفی آف دی اپنشدز'' میں رقمطراز ہیں:

We find in the upnishads an advance on the sumhita mythology.

---

[1] ہندو سنگٹھن مؤلفہ بھائی پرمانند ایم۔اے۔

یعنی ہم اپنشدوں کو ویدک افسانوں سے زیادہ ترقی یافتہ خیال پاتے ہیں۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"So numerous are suggestions of truth, so various are their guesses to God that almost any body may seek in them what he wants and finds what he seeks."

یعنی صداقت کے بارے میں ان کے قیاسات اس قدر گونا گوں اور خدا کے متعلق ان کے ظنون اس قدر مختلف ہیں کہ ہر شخص کو یقیناً ان میں جو چاہتا ہے اور ہر قسم کا خیال جو تلاش کرتا ہے ان میں مل جاتا ہے۔[1]

پنڈت ستیہ ورت سام شری اپنی کتاب ترئی پر تیچ ص 74 پر لکھتے ہیں کہ ایسے ہی بلا شک وشبہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں ہی نے ویدوں کو تصنیف کیا۔'' یہی پنڈت جی اپنے گرو پنڈت سام شری سے متعلق لکھتے ہیں:

''سام شری پکش ورتمان (موجودہ) ویدوں کو بھارتیوں (ہندوستانیوں) کے لیے ہی مانتے ہیں۔ ویدوں کو ایشوری گیان (علم خداوندی) نہیں مانتے۔ ان کو آریہ ورتی آریوں کی سبھیتا (تہذیب) کا اتہاس (تاریخ) مانتے ہیں۔''

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "The Discovery of India" میں رقمطراز ہیں:

''بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک ہماری بڑی بدقسمتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وید صرف اس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔ دعائیں، قربانی کی رسومات، جادو، نیچرل شاعری وغیرہ'' (ص ۷۷)

گوروکل کانگڑی کے پروفیسر وید پنڈت چندر منی ودیا النکار اپنے ترجمہ نرکت حصہ اوّل صفحہ ۹۶ پر وید کی ناقص زبان ہونے کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ وید پرماتما کے دیئے ہوئے نہیں۔

''پرماتما پورن (مکمل) ہے، یدی (اگر) وید پرماتما کے دیئے ہوئے ہیں تو اس کی بھاشا (زبان) میں اتنا اپورنتا (نقص یا ادھورے پن کی) مہادوش (عظیم الشان غلطی) نہیں ہونی چاہیے...... یہ اشنکار (اعتراض) ہمیں بہت ڈگمگاتا ہے۔ ویدک بھاشا میں اتنی بھاری ترٹی (کمزوری، خرابی) کا ہونا بڑا اکھٹکتا ہے۔''

ویدوں کے رشی یا مصنف:

ویدوں کے شاعر رشی کہلاتے ہیں۔ لفظ رشی کے معنی منتر دیکھنے والا ہیں۔ منتر دیکھنے سے مراد دل سے منتروں کا دیکھنا، ان کا بنانا ہے۔ اس لیے ویدک تعلیمات میں رشی کی تعریف یہ ہے: ''جس کا کلام ہے وہ رشی ہے۔''

دانا رشی منتروں کے بنانے والے ہیں (تیتر یہ برہمن ۲،۸،۸،۵) ایک رشی کے مکمل کلام کو سوکت کہا جاتا ہے۔ (۱:۱۳) جس دیوتا سے کوئی تمنا پوری ہونے کی آرزو کر کے رشی نے اس کی تعریف کی وہ اس منتر کا دیوتا کہلاتا ہے۔ (نرکت: ۱:۷)

گویا ویدوں کے منتر رشیوں کی دیوتاؤں سے التجائیں ہیں۔

کیا رشی رسول یا نبی تھے؟

لفظ رشی رسول یا نبی کا مترادف نہیں۔ سینکڑوں رشی گزرے ہیں جو رشی کہلائے مگر ان کا دعویٰ الہام نہیں۔ منتروں کو سمجھنے اور سمجھانے

---

[1] فلاسفی آف دی اپنشدز: ص ۱۶۔

والے بھی رشی کہلاتے ہیں۔شاعر پنڈت بھی ویدوں میں رشی کہلائے۔رشیوں کی اولاد اور شاگرد بھی رشی کہلائے (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۶۲ منتر ۵) منتر بنانے والوں کو رشی کے علاوہ برہمن، عالم اور شاعر بھی کہا گیا ہے۔

ویدوں کے رشیوں کے بارے میں علماء ہنود کا اختلاف:

ویدوں کے مصنفین کے متعلق ہندو علماء کا شدید اختلاف ہے۔ایک نظریہ یہ ہے کہ برہما دیوتاؤں میں سب سے پہلے ہوا۔تمام عالم کا خالق اور رازق،اس برہما کے چار منہ تھے۔ایک ایک منہ سے ایک ایک وید پیدا ہوا۔

برہما کے کس کس منہ سے کون کون نکلا۔

اس کے مشرقی منہ سے رگ وید وغیرہ،جنوبی منہ سے یجروید وغیرہ،مغربی منہ سے سام وید اور شمالی منہ سے اتھرووید نکلا۔

دوسرا نظریہ

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ چار رشیوں (اگنی، وایو، انگرا اور ادنیہ پر الہام کیے گئے۔شت پتھ برہمن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگنی سے رگ وید، وایو سے یجروید اور ادنیہ سے سام وید ظاہر ہوا۔مگر اتھروید کے نہ تو رشی کا اس میں ذکر ہے نہ اس وید کا نام اور نہ انگرا رشی اس میں کہیں مذکور ہے۔البتہ گوپتھ برہمن میں جو اتھرو ودیا کا خاص برہمن ہے اتھرووید کا دیوتا چاند لکھا ہے۔

آریہ سماج کے ان فرضی رشیوں کے حالات زندگی کہیں نہیں ملتے۔

تیسرا نظریہ:

وید 414 رشیوں کا کلام ہے جن کے نام ویدوں کے اندر درج ہیں۔تمام علماء یورپ، روشن خیال علماء ہند، سوامی وویکانند، پنڈت ناتھ دت، ابناش چندر دت، ستیہ ورت، سام شری، سائیں آچاریہ، سوامی ہری پرشاد، یاسک اچاریہ مؤلف نرکت کا بھی یہی نظریہ ہے۔اس کی تصدیق خود ویدوں کے اندر موجود ہے۔ہر ایک سوکت یا غزل پر اس رشی کا نام موجود ہے جس کا وہ کلام ہے۔

وید کے صدہا منتر ایسے ہیں جن میں رشیوں کا یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہ ان کے بنائے ہوئے ہیں۔نمونہ کے طور پر چند ایک درج کیے جاتے ہیں:

1۔ ہم قابل تعریف اگنی کے لیے اپنی عقل سے اس منتر کو بناتے ہیں جیسے بڑھئی رتھ بناتا ہے (رگ وید منڈل ا سوکت 95 منتر 1)

2- اے اگنی تو اس منتر سے ترقی کر جو ہم نے اپنی لیاقت اور واقفیت سے بنایا۔ (رگ وید ا : 2 : 3 : 18)

3- یہ منتر اے دشوئی کمار وہم نے تمہارے لیے گھڑا ہے جیسے بھرگو بڑھئی رتھ گھڑتے ہیں۔(رگ وید منڈل 4 سوکت 16 منتر 20)

4- اسی طرح یم یمی سوکت میں دو توام بہن بھائیوں کا مکالمہ ہے۔اس سوکت کے اوپر بعض منتروں پر رشی یم بتایا گیا ہے اور بعض کی رشیہ یمی ہے۔سوکت میں بھی یم کا کلام مذکر صینے میں اور یمی کا جواب مونث صیغہ میں ہے۔جس سے یہ ظاہر ہے کہ یم یمی اس کو سمجھنے والے نہیں بلکہ باہم کلام کرنے والے ہیں۔اسی مکالمہ کا نام یم یمی سوکت ہے۔چنانچہ اس سوکت کے منتر 7, 9, 13, 41 میں بھی یم یمی نام موجود ہے۔

منتر صرف دیوتاؤں کی تعریف ہی میں نہیں لکھے گئے بلکہ راجاؤں کی مدح میں بھی گھڑے گئے۔وہ بھی ان رشیوں کی خوب قدر کرتے تھے۔یہ منتر وید کی اصطلاح میں دان ستتیان یا خیرات، کی تعریف کے منتر کہلاتے تھے مثلاً رگ وید منڈل 8 سوکت پر لکھا ہے کہ کنو خاندان کا رشی میدھاتتھی اور میدھیاتتھی ہیں۔

11 منتر 30 سے 33 تک کا رشی اسنگ چھتری رشی ہے اور منتر 34 کا رشی اسنگ کی بیوی انگرا کی بیٹی شاشوتی ہے۔ راجہ اسنگ نے رشی کو دان دیا، اس نے اس کی تعریف یوں کی: ''اے اگنی پریوگ کا بیٹا اسنگ دان دینے میں دوسروں سے دس گنا بڑھ گیا ہے۔ اس کے دیئے ہوئے دھوئے دھوئے بیل میرے پاس ایسے ہیں جیسے پانی میں کنول کی ڈنڈیاں نکلی ہوں۔'' (رگ وید منڈل 8 سوکت 1 منتر 33)
اس منتر سے پہلے اسنگ خود میدھیا تتھی کو اپنے تعریف کے لیے کہتا ہے:
''میدھیا تتھی بار بار میری تعریف کرو۔ میری مدح کرو۔ دولت مندوں میں ہم سب سے زیادہ دولت والے ہیں۔ میرے نطفہ سے دوسروں کے گھوڑے بنائے گئے۔ میرا طریق اعلیٰ ہے۔ میرا اتھیار بلند ہے۔ کھانے کے بعد ارادت سے میں نے تمہارے رتھ کو جوتا تھا۔ میں دل لبھانے والا دان کرنا جانتا ہوں۔ میں یادو خاندان کا اور مویشیوں والا ہوں۔'' (رگوید منڈل 8 سوکت 1 منتر 20 , 31)
راجہ چتر کے دان کی تعریف میں سوبھری رشی یوں تعریف کرتا ہے:
''چتر ہی راجہ ہے دوسرے سب رانیاں ہیں۔ جیسے بادل بارش سے زمین کو خوش کرتا ہے ویسے ہی سرسوتی۔ ندی کے کنارے رہنے والے نے ہزار جگہ مجھے دس ہزار دان دیئے (رگ وید 8:1:2:18) ان حوالہ جات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وید مختلف رشیوں کی تصنیف ہیں، چنانچہ ڈاکٹر داس گپتا لکھتے ہیں:

> ''رگ وید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کیے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کیے ہوں۔ یہ منتر تمام سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانہ کے شاعر ان میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً جب یہ مجموعہ بہت ضخیم ہو گیا تو اسے موجودہ شکل میں مدون کیا گیا۔ اس لیے ان میں دراصل آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ کی ترقی کے مختلف ادوار کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور عہد قدیم کی اس سوسائٹی کے انداز و اطوار کا پتہ چلتا ہے جس نے انہیں تصنیف کیا۔''

ویدوں کی تالیف کا زمانہ:

ویدوں کے زمانہ تدوین و تالیف میں شدید اختلاف ہے۔ سناتن دھرمی اور آریہ سماجی اس امر پر متفق ہیں کہ وید شروع دنیا سے ہیں۔ پنڈت دیانند کے نزدیک ابتداء دنیا پر ایک ارب نو کروڑ برس گزر چکے ہیں۔ گویا پنڈت صاحب کے نزدیک ویدوں کے نزول پر بھی اتنا ہی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دعویٰ کی تردید مستشرقین اور ہندو علماء کی جدید تحقیقات اور اندرونی شہادتیں کر رہی ہیں۔
ڈاکٹر ہاگ (Haug) تیتریہ برہمن کے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں ص 47 پر منتروں کا زمانہ 400 سے 2000 برس قبل مسیح بتاتے ہیں۔ پروفیسر اناش چندر ورت 8000 سے 10000 تک کا زمانہ قرار دیتے ہیں (رگ وید انڈیا) مہاتما تلک کی رائے میں 4000 سے 5000 برس قبل مسیح اور پروفیسر میکس ملر کی تحقیقات 800 سے 1000 قبل مسیح (قدیم سنسکرت لٹریچر ص 562 اور ترجمہ رگ وید جلد 4 ہیبرٹ لیکچرز ص 240)
پروفیسر میکس ملر ویدوں کے عہد کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

1-	سوتر لٹریچر	200 سے 600 ق۔م تک
2-	براہمن	600 سے 800 ق۔م تک

-3 منتر 800 سے 1000 ق۔م تک

-4 چھند رگ وید کے آخری حصہ سمیت 1000 سے 1200 ق۔م تک

(Cambridge History of India part 1, P.112)

پروفیسر مونیر ولیم (Monier william) ہندوازم میں لکھتا ہے:

"In this manner we may be justified in assuming that hymns of in veda were probably composed by a succession of poets at different dates between 1500 and 1000 years before Chricst" (Hinduism P. 19)

چنانچہ ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ویدوں کے حمد یہ گیت غالباً 500 اور 1000 قبل مسیح کے درمیان مختلف شاعروں نے مختلف تاریخوں میں لکھے۔ (ہندومت صفحہ 19)

ابناش چندر کہتا ہے:

"The hymns themseleves are of different periods some being older and some recent"۔

حمد یہ گیت بذات خود مختلف زمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ کچھ پرانے معلوم ہوتے ہیں اور کچھ نئے۔

ابناش چندر رگ ویدک انڈیا میں لکھتا ہے:

"But the language of Rigvedic Hymns being undoubtedly more archaic excepting some hymns of the Xth mandals than that of the Atharva Veda their composition is rightly regarded as belonging to an earlier period. The Yajur Veda and the Atharva Veda contain in them distinct Geographical referances and other internal evidence which go to show that they were composed in a much later period theRigveda, The two periods having probably been separated from each other by thousands of years, during which many physical and climatic changes had taken place (Regvedic India P. VIII)

رگ وید کے حمد یہ گیتوں کی زبان دسویں منڈل کے چند گیتوں کو چھوڑ کر اتھر وید کی زبان سے قدیم ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رگ وید کا زمانہ تالیف بہت پہلے ہو گزرا ہے۔ یجر وید اور اتھر وید میں ایسے واضح جغرافیائی حوالے اور اندرونی شہادتیں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ رگ وید کی نسبت بعد کے زمانہ میں مدون کیے گئے اور دونوں زمانوں میں ہزاروں سال کا وقفہ حائل ہے اور اس زمانے میں بہت سی طبعی اور موسمی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مہاتما تلک نے "ارکٹک ہوم ان دی ویداز" میں صرف ستاروں کی گردش کے حساب سے جو سالانہ موسموں پر اثر انداز ہوتی ہے ویدوں کی عمر 4000 برس قرار دی ہے۔

جیمس ہیسٹنگز (James Hastings) نے اپنے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ویدوں کا زمانہ 1300 ق۔م سے 200 ق۔م تک سمجھا جاتا ہے۔

اندرونی شہادت:

وید میں بعض فنون، قصاب کے اوزاروں، بڑھئی کے ہتھیاروں اور برتنوں کا ذکر ہے۔ موجودہ تحقیقات کی رو سے وہ اوزار دس ہزار برس پہلے موجود نہ تھے۔

ویدوں میں بعض کتابوں کا ذکر ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ کتب ویدوں سے پہلے موجود تھیں۔ مثلاً اتہاس (تاریخ) پران، گاتھا، ناراشنسی، یہ سب کتب کے نام ہیں جو وید منتر میں موجود ہیں (اتھروید 15 , 6 ,7 تا 11)

ویدوں کا وطن:

ویدوں کے وطن کے متعلق ہندو علماء میں شدید اختلاف ہے۔ سناتن دھرم کے نظریہ کے مطابق ویدوں کا وطن شمالی ہندوستان یا آریہ ورت ہے۔ جس کی حدود اربعہ ایک طرف سندھ ہے تو دوسری طرف دریا جمنا، تیسری جانب کشمیر ہے تو چوتھی حد راجپوتانہ ہے۔ بندھیا چل سے نیچے کا ملک آریہ ورت سے خارج ہے۔

آریہ سماج کا خیال ہے کہ وید ملک تبت میں نازل ہوئے تھے حالانکہ فزیالوجیکل تحقیقات میں ہمالیہ اور تبت کے پہاڑ بندھیا چل کی نسبت بہت نئے ہیں۔ وید میں کسی جگہ تبت کا ذکر نہیں۔ دیانند نے لفظ تروشٹپ سے تبت مراد لی ہے۔ یہ لفظ گوپتھ برہمن اور مہا بھارت میں بھی استعمال ہوا ہے اور کسی جگہ اس سے مراد تبت نہیں ہے۔

ان دو نظریوں کے علاوہ مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ آریہ وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے۔ وید وسط ایشیا میں رہائش کے زمانہ میں بننے شروع ہوئے اور پنجاب میں آ کر مکمل ہوئے۔ پروفیسر اناش چندر اس نظریہ کا مخالف ہے۔ وہ فزیالوجیکل تحقیقات سے ثابت کرتا ہے کہ وسط ایشیا اس وقت زیر آب تھا اور ہمالیہ کا نام ونشان اس وقت نہ تھا۔ راجپوتانہ اس وقت سمندر تھا (رگ ویدک انڈیا) پس ویدوں کا وطن پنجاب ہے۔

چوتھا نظریہ مہاتما تلک کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وید قطب شمالی پر بننے شروع ہوئے (ارکٹک ان دی ویداز)۔

پانچواں نظریہ پروفیسر پران ناتھ ہندو یونیورسٹی بنارس کا ہے جنہوں نے السٹریٹڈ ویکلی کے کئی نمبروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کی کتاب نہیں۔ رگ وید مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن شہروں اور قوموں اور راجاؤں کا ذکر ہے ان کا تعلق شام اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہے۔ اس نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ رگ وید کا 1/5 حصہ بابل اور شام کے علاقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا وید بابل سے بننا شروع ہوا اور ہندوستان میں آ کر مکمل ہوا۔

تعلیماتِ وید (حقوق انسانی کی پامالی)

ویدوں میں ظالمانہ احکام:

وید مخالف کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ یجر وید کی تعلیم کا خلاصہ سوامی دیانند کے الفاظ میں یہ ہے:

-1 ''دھرم کے مخالفوں کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجر وید ادھیاء 13 منتر 12 دیانند بھاش)

-2 ''دشمنوں کے کھیتوں کو اجاڑ و یعنی گائے بیل بکری اور لوگوں کو بھوکا مار کر ہلاک کرو۔'' (حوالہ مذکورہ منتر 13)

-3 ''اپنے مخالفوں کو درندوں سے پھڑوا ڈالو۔'' (یجر وید 15 ,17 ,19)

-4 ''ان کو سمندر میں غرق کرو۔'' (15 : 18)

-5 ''جس طرح بلی چوہے کو تڑپا تڑپا کر مارتی ہے اس طرح ان کو تڑپا کر مارو۔'' (16 : 65)

-6 ''ان کی گردنیں کاٹ دو۔'' (5 : 22)

-7 ''جائز اور ناجائز طریق سے ہلاک کردو۔'' (1 : 28)

-8 ''مخالفوں کا جوڑ جوڑ اور بند بند کاٹ دیا جائے۔'' (13 : 38)

-9 ''ان کو پاؤں کے نیچے کچل دو اور ان پر رحم نہ کرو۔'' (17 : 39)

سام وید کی تعلیم:

''اے مخالف تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح بے سر اور اندھے ہو جاؤ۔ اس کے بعد پھر اُن میں جو چیدہ چیدہ ہوں ان کو اندر اور آگ دیوتا تباہ کریں۔'' (سام وید اُتر آرچک پر پھاٹک گیارہ منتر)

-2 ''اے اندر دیوتا! ہمارا دیا ہوا سوم رس تجھے خوش اور متوالا کرے، تو ہمیں دھن و دولت دے اور وید کے دشمنوں کو تباہ اور ہلاک کر۔''

(سام وید اُتر آرچک آدھیائے 11 منتر 1)

-3 ''اے اندر دیوتا! تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یوں کچل کر تباہ کرے گا جیسے چھتری دار پھول کو پاؤں سے کچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اے اندر تو کب ہماری ان دعاؤں کو سنے گا۔'' (سام وید اُتر آرچک ادھیائے 10 منتر 3)

اتھر وید کی تعلیم:

''اے ویدک دھرمی راجاؤ اور دوسرے ویدک دھرمیو تم شیر جیسے بن کر رعیتوں کو کھا جاؤ اور چیتے جیسے بن کر اپنے دشمنوں کو باندھ کر جکڑ لو اس کے بعد اپنی مخالفت کرنے والوں کے کھانے تک اٹھالو۔'' (اتھر وید کانڈ 4 سوکت 22 منتر)

-2 ''اے دبھ تو ہمارے دشمنوں کے دلوں کو توڑ دے۔ جیسے تو اگتے وقت زمین کی کھال کو چیرتی ہوئی اوپر کو نکل آتی ہے۔ ویسے ہی ان ہمارے دشمنوں کے سروں کو چیر کر اوپر کو نکل کر ان کو گرا کر تباہ کردے۔'' (اتھر وید کانڈ 19 سوکت 28 منتر 4 تا 10)

-3 ''اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو چبھ اور میرے دوسرے ہر قسم کے مخالفین کو بھی چبھ جا اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو تباہ کر اور ہمارے مخالفین کو بھی تباہ و برباد کرو غیرہ وغیرہ۔'' (اتھر وید کانڈ سوکت 39 منتر 1 تا 9)

منوسمرتی جو تمام ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کی تفسیر ہے اس میں لکھا ہے:

''ویدوں پر اعتراض کرنے والوں کو ملک سے باہر نکال۔'' (ادھیائے 1 شلوک 11)

دوسروں کے مال و دولت پر نظر رکھنے کی تعلیم:

-1 اے اندر پرماتما کیلٹوں (غیر آریوں) میں گایاں تیرا کیا بناتی ہیں۔ سوم (بھنگ) میں ملانے کے لیے دودھ دوہاتی ہیں اور نہ یکیہ کا برتن (اپنے دودھ) سے گرم کرتی ہیں۔''

-2 ''پرم گند کی دولت ہمارے لیے لوٹ لا۔'' (رگ وید منڈل 3 سوکت 53 منتر 14)

عورتوں کے متعلق تعلیم:

عورت معاشرہ کا ایک اہم ترین رکن ہے، لیکن ویدک دھرم نے ان کو قعر مذلت میں گرا کر ان کے ہر قسم کے معاشرتی حقوق کو چھین

لیا ہے۔

رگ وید منڈل 10 سوکت 95 منتر 15 میں لکھتا ہے:

''عورتوں کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کی بھٹ ہیں۔'' دوسری جگہ آتا ہے:

''اندر (آریوں کے ایشور) نے خود یہ کہا ہے کہ عورت کا دل استقلال سے خالی ہے اور وہ عقل کی رو سے ایک نہایت ہلکی چیز ہے۔'' (رگ وید منڈل سوکت 33 منتر 17)

ان دو منتروں سے چار حکم مستنبط ہوتے ہیں:

1- کسی عورت سے مستقل محبت نہیں کی جا سکتی۔

2- عورت دھوکے باز ہے۔

3- ہر عورت کی عصمت مشتبہ ہے۔

4- عورت کم عقل ہے۔

عورت کی معاشرتی حیثیت:

مندرجہ بالا چار وجوہات کی بناء پر برہمن گرنتھیوں اور شاستر گاروں نے حسب ذیل قوانین مرتب کیے ہیں:

1- عورت اور شودر دونوں کو نردھن (مال سے محروم) کہا گیا ہے (یجروید ادھیاء 8 منتر 5 منو ادھیاء 8 شلوک 416 ادھیاء 9 شلوک 199)

2- لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں (اتھروید کانڈ 1 سوکت 17 منتر 1 یجروید 8:5 نرکت 4:3 منو 9:199)

3- کسی عورت کو خاوند سے حکومت نہیں مل سکتی۔ (اتھروید کانڈ 1 سوکت 17 منتر 1)

4- اگر کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی طرف سے جائیداد ملتی ہے تو اسے جائیداد کی خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہیں۔ (اتھروید کانڈ 1 سوکت 17 منتر 1)

5- اولاد ذکر کے نہ ہوتے ہوئے بھی بیٹی وارث نہیں بلکہ متبنیٰ جو غیر کا بیٹا ہوتا ہے وارث ہوتا ہے۔ (منو ادھیاء 9)

6- نکاح ثانی کی ممانعت ہے کیونکہ ایک جائیداد بلاوجہ دوسرے کے قبضہ میں نہیں جا سکتی۔ (منو 15 : 151)

7- خلع کی ممانعت یعنی خاوند خواہ کیسا ہی بے رحم اور ظالم ہو، دائم المریض ہو مگر عورت کو اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں۔ (منو 5: 154)

8- عورتوں کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے دیں، ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں۔ (منو نواں باب 27)

9- کسی لڑکی یا نوجوان عورت یا بڈھی عورت کو کبھی گھر میں بھی کام اپنے اختیار سے نہیں کرنا چاہیے۔ طفولیت میں عورت کو باپ کا تابع رہنا چاہیے اور جوانی میں شوہر یا بیٹوں کا، اگر وہ انہیں چھوڑ کر چلی جائے تو اپنے اور اپنے شوہر دونوں کے خاندان پر بدنامی کا دھبہ لگائے گی۔ (منو شاستر پانچواں باب 147, 148)

10- عورت کو جوئے میں ہارنے اور فروخت کا جواز۔ (نرکت 3 : 4)

11- جن لڑکیوں کے بھائی نہ ہوں ان کی شادی نہیں ہوسکتی۔ (اتھروید 1:17:1)

12- لڑکیوں کی موجودگی میں لڑکے پیدا کرنے کے لیے نیوگ کا حکم۔(ستیارتھ پرکاش باب 4 مضمون نیوگ)

ہندو وکیل کی رائے:

''جس طرح درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح قوموں کے تمدن اور تہذیب پر ان کے رسم ورواج کا اثر ہے۔ ہندو دھرم میں مردوں کے حقوق نہایت احتیاط کے ساتھ تمام معاملات میں محفوظ کردیے گئے ہیں۔ مگر یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کی گئی۔ نہایت رنجیدہ بات ہے کہ قدیم ہندو دھرم کی بناء پر عورت کو جائیداد سمجھا گیا ہے یا ایک ایسی ہستی جو مرد سے عقل اور اخلاق کی بناء پر نہایت کم تر درجہ پر ہے۔ اس لیے ہندو شاستروں کا زور عورت کے فرائض پر ہے حقوق پر نہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہندو سوسائٹی کے بنانے میں عورت کا کوئی حصہ نہیں۔ پیدائش سے لے کر وفات تک عورت کے تمام افعال زندگی، مشکلات اور مصائب بلکہ زندگی کے معمولی متقصیات کھانے پینے، جاگنے سونے، غسل کرنے، باہر کے معمولی کاروبار میں مرد کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اسے عورت کے لیے نمبر 4 خدا بنادیا گیا ہے۔'' (بھگت رام سیکرٹری انجمن ہمدرد حیوانات فیروز پور چھاؤنی)

ویدک دھرم میں عورت کی روحانی حیثیت:

1- عورت کے لیے مذہبی تعلیم کی ممانعت ہے۔ (منو9 : 18)

2- مرد اور عورت دونوں کے لیے نجات کے الگ الگ راستے ہیں۔ مرد اپنے زور بازو سے مکتی مارگ (طریقہ نجات) پکڑ سکتا ہے مگر عورت کی نجات خاوند پر مرمٹنے سے ہی ہوسکتی ہے، وہ براہ راست خدا سے نجات حاصل نہیں کرسکتی۔ (منو2:66 - 9 : 18 اور 5 : 155)

3- گیتا میں نا بینا عورت اور شودر کو پاپ یونی (گناہ کے قالب) قرار دیا گیا ہے۔ (گیتا ادھیاء 9 شلوک 32)

4- عورت کی عصمت و پاکیزگی کے خلاف منو ادھیا اور شت پتھ برہمن، رگوید، یجروید، اتھروید کا مطالعہ ضروری ہے، بعد کے لٹریچر میں بھرتری ہری کا ویراگ شتک، یوک وششٹ میں عورت کو بدترین خلائق قرار دیا ہے۔

5- اتھروید 5, 17, 8, 9 میں لکھا ہے: ''اگر کسی عورت کے دس خاوند ہوں، مگر اس کے بعد برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہ برہمن کی ہوجاتی ہے، برہمن ہی خاوند ہے نہ کشتری اور نہ ویش تمام لوگوں میں اس امر کا اعلان کرتا ہوا سورج ہر روز چلتا ہے۔''

وید میں ناقص توحید:

ویدوں میں خالص توحید نہیں پائی جاتی ہے اور پرمیشور کا تصور جو ویدوں نے پیش کیا ہے وہ انسانی ذہن کا تراشیدہ ہے۔ وید کے سوکتوں کے اوپر ایک تو دیوتا کا نام ہے اور دوسرے کسی رشی کا دیوتا وہ ہے جس کی تعریف یا پرستش کا ذکر اس سوکت میں موجود ہے۔ رشی اس کا مصنف ہے۔

ویدوں میں دیوتاؤں کی تعداد مختلف ہے۔ یجروید میں لکھا ہے کہ دیوتا کل 33 ہیں۔ 11 زمین پر 11 آسمان میں اور 11 اوپر جنت میں۔

رگ وید منڈل (3 سوکت 9 منتر 9 میں لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں۔ رگ وید کے بیان کے مطابق 3339 دیوتاؤں نے مل کر آگ دیوتا کو گھی سے سینچا اور اس کے پاس گئے۔ پس 3339 میں ایک کا اضافہ ہوتو 3340 دیوتا بن گئے۔ چنانچہ رگ وید منڈل 10 سوکت

52 منتر 6 میں واضح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ کل دیوتا 3340 ہیں۔

بلحاظ جائے رہائش دیوتاؤں کی تین اقسام ہیں، پرتھوی ستھانی (زمین میں رہائش والے) مدھیہ ستھانی (جو فضا میں مقیم ہیں) دیوستھانی آسمان میں رہنے والے دیوتا) مثلاً اگنی، اندر سوریہ اتھرووید 129:10 واتھرووید 11:27:19 ..... 13) رگ وید 11:39:1، یجروید 19:7 نرکت 5:7 شت پتھ 2:6:11 :4) اس کے علاوہ درختوں، جانوروں وغیرہ میں رہنے والے دیوتاؤں کا ذکر اتھرووید 3:30:1 میں ہے۔

دیوتاؤں کی یہ کثرت شرک فی ذات الٰہی ہے۔ ہندو روح، مادہ، آکاش اور زمانہ کو خدا کے برابر ازلی وابدی گردانتے ہیں۔ یہ شرک فی صفات الٰہی ہے۔ اسی طرح آگ، ہوا، پانی، دریا، پہاڑ، زمین، سورج اور چاند کی عبادت کرنا شرک فی عبادت الٰہی ہے۔

ویدوں کی رُو سے ایشور کا تصور:

1- یجروید: وہ اگنی ہے وہ وایو ہے، وہ چندرما ہے، وہ روشنی ہے، وہ آپہ ہے، وہ پرجاپتی ہے (1/32)

2- ''کیا میں اس روح برترین کو جان سکتا ہوں جو سب کچھ ہے اور تاریکی سے پرے ہے۔ صرف اسی کر، جان کو کوئی موت عظیم پر فتح پا سکتا ہے۔ نجات کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔'' (18/31)

3- ''خدا ایک ہے۔ وہ غیر متحرک ہے۔ تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے جو اس تک نہیں پہنچ سکتے اگرچہ وہ ان میں ہے۔''

4- رگ وید: ''ہزاروں سروں والا پرش (ایشور) ہزاروں آنکھوں والا، ہزاروں پاؤں والا، وہ ترلوکی (کائنات) کو سب طرف سے گھیر کر ٹھہرا ہوا ہے۔'' (11-91-10)

5- سام وید: ''اے خدا تو ہمارا باپ ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ ہمارا دوست ہے۔ (41 : 18)

6- اتھروید ''تو مرد ہے، تو عورت ہے، تو کنواری لڑکی ہے، تو بوڑھا آدمی ہے، جو لاٹھی لیے لڑکھڑا رہا ہے تو ہر طرف موجود ہے۔'' (27-8-10)

7- ''وہ ایک ہے تنہا ایک۔ اس میں تمام معبود ایک ہو جاتے ہیں۔'' (13)

8- ''صحیح علم دین کے جاننے والے 33 دیوتاؤں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک ہی میں موجود ہیں اور اس کے ذریعے سے اپنے صحیح اور فطری فرائض انجام دیتے ہیں۔ (10 - 4 - 27)

9- ''اے حیوانات کے مالک پرماتما تیرے منہ کو تعظیم ہو۔ اے سب کے خدا تیری آنکھ کو تعظیم، تیری کھال کو تعظیم، تیرے قابل زیارت جسم کے آگے پیچھے کو تعظیم ہو۔ پیٹ کے لیے زبان کے لیے تیرے منہ کے لیے، دانتوں کے لیے، تیرے دانتوں کی بدبو کے لیے تعظیم ہو۔'' (6, 5, 2, 11)

تمام دیوتاؤں میں ورن کا مقام بہت بلند ہے۔ اتھروید کے چند بند ملاحظہ ہوں:

10- ''ورن، آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا ہے یا چھپتا ہے اگر وہ لیٹ جاتا یا اٹھتا ہے جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے وہاں مثل ثالث کے موجود ہوتا ہے۔

''یہ زمین بھی شاہ ورن کی ہے اور یہ آسمان بھی جس کے کنارے بہت بعید ہیں۔ [1] دونوں سمندر ورن کی کمر ہیں۔ وہ پانی کے اس قطرے میں بھی موجود ہے۔'' ''اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے تو بھی وہ شاہ ورن سے نہیں بچ سکتا۔ [2] اس کے جاسوس دنیا

کی طرف بڑھتے ہیں اور ہزار آنکھوں سے اس زمین کی نگرانی کرتے ہیں۔"

"شاہ ورن سب کچھ دیکھتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان اور اس کے پرے ہے۔ اس نے انسانوں کے پلک جھپکانے تک کا شمار کیا ہے۔ جیسے ایک کھلاڑی پانسہ پھینکتا ہے ویسے ہی وہ سب چیزوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ (5, 1, 16, 4)

مندرجہ بالا اقتباسات میں ورن سے چند اوصاف منسوب کر دیئے گئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں میں ناقص توحید (Henotheism) موجود ہے۔

ذات پات کی تقسیم اور برہمنوں کا تفوق

ہندوؤں میں انسانیت سوز ذات پات کا امتیاز قائم ہے۔ جس ہندو مصلح نے اس امتیاز کو مٹانے کی مساعی کی ہیں وہ ناکام و نامراد ہوا ہے کیونکہ ذات پات کا امتیاز ہندوؤں کی گھٹی میں رچا ہوا ہے۔ اس انسانیت سوز تعلیم کا سرچشمہ ان کی مذہبی کتب ہیں۔

وید میں لکھا ہے: برہمن پرماتما کے منہ سے، کشتری بازوؤں سے، ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔ (رگ وید دسواں باب بھجن نمبر 90 ص 38 یجر وید، اتھر وید)

وید کے لیے برہمن، حکومت کے لیے چھتری، کاروبار کے لیے ویش اور دُکھ اٹھانے کے لیے شودر پیدا کیا ہے۔ (یجر وید 5:30)

منوشاستر ہندوؤں کی قانون کی کتاب ہے۔ اب ہم اس کتاب سے حوالہ جات درج کرتے ہیں۔ جن میں مختلف ذاتوں کے فرائض اور شادی بیاہ کے مسائل لکھے ہیں۔

"قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔" (باب اول: 31)

"اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیئے۔" (باب اول 87)

"برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا۔" (باب اول 88)

"چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔" (باب اول 89)

"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے تجارت، لین دین اور زراعت کرے۔" (باب اول 90)

"شودر کے لیے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔" (باب اوّل 91)

---

1. اس کا مقابلہ زبور 24 آیت 1 سے کیجیے۔
2. اس کا مقابلہ زبور 139 کی آیات 7 تا 12 سے کیجیے۔ دونوں میں اس قدر مشابہت ہے کہ بجائے توارد کے زبور کی آیتیں سرقہ معلوم ہوتی ہیں۔

''شاستر کا فیصلہ یہ ہے کہ جس شخص کا باپ آریہ ہو اور ماں آریہ نہ ہو وہ اپنی خصائص سے آریہ بن سکتا ہے لیکن جس کی ماں آریہ ہو اور باپ غیر آریہ وہ کبھی آریہ بن نہیں سکتا۔'' (باب دہم 67)

''جس طرح شودر اور برہمن عورت سے ایسی اولاد پیدا ہوتی ہے جو ذات سے باہر ہے اسی طرح اگر ذات سے باہر اشخاص چاروں ذاتوں کی عورتوں سے ہم بستر ہوں تو ان کی اولاد بھی ذات سے خارج ہوگی۔'' (باب دہم 30)

''جو برہمن شودر عورت کو ہم بستر کرتا ہے وہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائے گا اور اگر اس سے کوئی اولاد پیدا ہو تو برہمن اپنی ذات سے خارج ہو جاتا ہے۔'' (باب سوم 17) [1]

برہمنوں کے خاص حقوق:

منو لکھتا ہے: ''برہمن کی پیدائش گویا شاستر کا جنم لینا ہے کیونکہ وہ شاستر پھیلانے کے لیے آیا ہے اور برہما کی نشانی ہے۔'' (باب اول 98)

''جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا۔ اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت۔'' (باب اول 99)

''جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے کل چیزیں اسی کی ہیں۔'' (باب اول 100)

''برہمن کو اگر ضرورت ہو تو وہ کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔'' (باب ہشتم 417)

''جس برہمن کو رگ وید یاد ہو وہ بالکل گناہ سے پاک ہے اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناس کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے۔'' (باب نہم 262)

''بادشاہ کو کیسی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو، تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہیں لینا چاہیے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہیے۔'' (باب ہفتم 133)

''سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی۔'' (باب ہفتم 379)

''راجہ کو نہیں چاہیے کہ برہمن کو کسی حالت میں بھی قتل کرے اگرچہ اس نے کتنا ہی جرم کیوں نہ کیا ہو۔ ایسے مجرم کو مال اور جان کے ساتھ ملک بدر کر دینا چاہیے''۔ (باب ہفتم 380)

کھشتری:

اس طبقہ کا کام ملک کا دفاع تھا۔ یہ طبقہ ہندو معاشرہ میں دوسرے درجہ پر تھا۔

ویش:

اس طبقہ کا کام زراعت، تجارت اور صنعت کو فروغ دینا تھا۔ ان کا درجہ تیسرا تھا اور ان کی زنار بندی چھتریوں کے بعد ہوتی تھی۔ ویشوں کے متعلق منو لکھتا ہے۔

''ویش کو چاہیے کہ زنار بندی اور اپنی ذات میں شادی کرنے کے بعد کاروبار میں مصروف ہو جائے اور مویشی کی نگہداشت

---

[1] ماخوذ از تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان مترجم سید علی بلگرامی ناشر مقبول اکیڈمی لاہور ص: 232،231

کرے۔" (باب نہم 326)

"اسے چاہیے کہ بیج بونے کے طریقے سے واقف ہو، اچھی بری زمین کو پہچاننے اور اوزان اور (تمدن ہند ص 233) پیمانوں کو بخوبی جانے۔" (باب نہم 331)

"اسے مزدوروں کے نرخ سے واقف ہونا چاہیے اور مختلف زبانیں جاننا چاہیے اور مختلف قسم کے مال کی حفاظت اور اس کی خرید و فروخت سے واقف ہونا چاہیے۔" (باب نہم 332) [1]

شودر:

شودر ہندو معاشرہ کا ذلیل ترین طبقہ تھا۔ ان کے لیے مندر، سکول، کنویں اور چشمے الگ اور مخصوص ہو گئے۔ وہ اس راہ پر نہیں چل سکتے تھے جس پر کسی اعلیٰ ذات کا ہندو جا رہا ہو اور نہ اسے وہ خوراک کھانے کا حق تھا جو اعلیٰ ذات کے ہندو کھاتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے گندے اور ادنیٰ کام کرتے تھے۔ علاوہ قدرت کی ہر اس نعمت سے محروم تھے جن پر اعلیٰ ذات کا ہندو اپنا پیدائشی حق جتائے۔ اس پر زندگی کے تمام دروازے بند تھے۔ نہانا دھونا ان کے لیے ناممکن ہو گیا کیونکہ کنوؤں، چشموں پر اعلیٰ ذات کا ہندو قابض تھا۔

شودر کے فرائض:

منو لکھتا ہے: "لیکن شودر کا اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ وہ وید کے ماہر گھر ہست برہمنوں کی جو تقویٰ میں مشہور ہیں خدمت کرے اور یہی اس کی نجات کا ذریعہ ہے۔ (باب نہم 334)

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔" (باب دہم 123)

"شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔" (باب دہم 129)

شودروں پر مظالم:

شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔ اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر جوڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔" (منو 2:1381 اتھر: 6:11:5:22:19)

"وید سننے پر دونوں کانوں میں سیسہ ڈال دو، پڑھنے میں زبان کاٹ دو۔ یاد کرنے پر اس کے دل کو چیر دو" امیمانسا کی شرح میں شنکر راما مارنج اور مادھو آچاریہ نے لکھا ہے:

"شودر کو نیک صلاح نہ دینی چاہیے"۔ (منو 4:79 رگوید 8:70:11:2,12:4 وغیرہ)

ہندو دھرم میں ذات پات ایک ایسا آہنی بندھن ہے کہ ہر ذات کا آدمی جس ذات میں جنم لیتا ہے مرتے دم تک اسی میں رہتا ہے۔ منو لکھتا ہے نیچی ذات والا اونچی ذات والے کا پیشہ اختیار کرے تو راجہ اس کی دولت چھین کر اسے ملک سے نکال دے۔" (منو 10 : 96 رگ وید 53:3) (تمدن ہند ص 234 - 225)

اپنی ذات میں شادی جائز ہے۔" صحیح شادیوں سے بے نقص اولاد پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ناقص شادیوں سے ناقص (اولاد)، اس

---

[1] تمدن ہند ص 233,334,235۔

لیے چاہیے کہ (شادی کے) ناقص طریقوں سے پرہیز کیا جائے۔" (منو 12:3:42:3) رگ وید 3:17:10 نرکت 13:2

سوامی دیانند بانی آریہ سماج لکھتے ہیں: "مسلمان وغیر مذاہب ویدک دھرم میں آئیں تو وہ جس ذات کے لائق ہوں اسی میں رہیں اور کھان پان وغیرہ معاملات بھی اپنی ذات والوں کے ساتھ کریں۔ آریہ لوگ ان کے ساتھ یہ کام نہ کریں۔ اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں ہوگا۔" (دستخط دیانند سرسوتی 114 اپریل 1881ء)

مسئلہ ذات پات کے بارے میں ہندو رہنماؤں کی رائیں:

ملک کی ترقی میں صرف ذات پات ہی رکاوٹ ہے جب تک اسے جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا ہمارے ملک کی نجات نہیں ہو سکتی۔" (ایم۔ سی راجا ممبر اسمبلی)

"ذات پات کی تفرق ہی ہمیشہ ہندوؤں کی تباہی کا باعث رہی ہے۔" (نرائن سوامی دہلی)

"سوسائٹی کے جسم میں ذات پات گھن کے کیڑے ہیں۔" (سر ہری سنگھ ممبر اسمبلی)

"اگر ہم ہندو قوم کو دنیا میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ذات پات کو دور کرنا چاہیے۔" (جناردھن بھٹ ایم اے)

اچھوت کہلانے والوں کی گراوٹ ہندوؤں کے لیے کلنک کا داغ ہے۔ (ہردیال سنگھ ایم اے)

ہندو قوم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ذات پات کا مسئلہ یقیناً تباہی کا راستہ ہے۔ (لالہ لاجپت رائے ایم اے)

"جنم سے پیدا ہوئی اونچ نیچ جھوٹی اور غلط ہے، انسان سب برابر ہیں۔" (بھائی پرمانند ایم اے)

"میرے دل کا زخم اسی دن دور ہوگا کہ جب ذات پات کی تفرق دور ہوگی۔" (رام دیو بی اے پرنسپل گوروکل کانگڑی ہردوار)

نواکھالی میں گاندھی جی نے کہا: "اگر ہندو دھرم نے زندہ رہنا تھا تو وہ ذات پات کے بغیر ہوتا۔" (مہاتما گاندھی)

عقیدۂ تثلیث (تری مورتی):

جیسا کہ ویدوں کی تعلیمات کے باب میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ہندوؤں میں بے شمار دیوتا اور دیویاں ہیں۔ دراصل معبودوں کی کثرت کا تصور ہمہ اوستی نظریہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مظاہر فطرت کی عبادت خدا کی عبادت ہے۔

ویدک دھرم کی غیر مقبولیت کے پیش نظر برہمنوں نے یہ محسوس کیا کہ ویدک دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس احساس کے نتیجہ میں ہندو دھرم میں تین بڑے خدا مقرر کیے گئے۔ براہمہ، شیوا، وشنو، ان کو ہی تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کی گئیں۔

براہمہ:

یہ دیوتا عالم کا خالق اور کائنات کا نقطۂ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ ہندو تثلیث (تری مورتی) میں برہما کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ اس دیوتا کی پرستش بہت ہی کم ہوتی ہے۔ تمام ہند میں صرف چند ایک ہی ایسے مندر ہیں جو براہمہ کے نام پر بنے ہیں۔

براہمہ کے متعلق ہندوؤں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک روح مطلق ہے جو قائم بالذات ہے۔ تمام عالم میں سائر و دائر ہے۔ ہر ہندو کی یہ تمنا ہے کہ وہ ایک روز اس روح مطلق میں جذب ہو جائے اور اسی میں اپنا نروان اور نجات خیال کرتے ہیں۔

اس کے مجسمہ میں چار سر اور چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک ہاتھ میں چمچہ، دوسرے میں لوٹا، قربانی کا سامان، تیسرے میں تسبیح اور چوتھے میں وید ہوتا ہے۔ اس کی سواری ہنس ہے۔ یہ میرو پربت پر اپنی بیوی سرسوتی سمیت رہتا ہے جو فنون لطیفہ کی دیوی

ہے اور مور پر سوار ہوتی ہے۔

وشنو:

ہندوؤں کا دوسرا دیوتا وشنو ہے۔ یہ ویدی معبود ہے۔ منتروں میں اسے معبود شمس ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت دیوتا شیو کی نسبت زیادہ ہے۔ یہ اشیاء کی حفاظت اور بقاء کا ذمہ دار ہے۔ یہ رحم کا بھی دیوتا ہے۔ وشنو کی پرستش کرنے والوں کی یہ علامت ہے کہ وہ ہر صبح سرخ گیرو سے اپنی پیشانی پر وشنو کی مثلث نما علامت لگا لیتے ہیں۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وشنو کو عبادتوں، منتوں، قربانیوں اور دعاؤں کے ذریعہ سے اس عالم مادی میں نزول کے لیے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ وشنو کسی بڑے انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور معجزانہ کام سرانجام دیتا ہے۔ ہندوؤں کے جتنے بڑے بڑے ہیرو ہو گزرے ہیں وہ وشنو کا ہی مظہر قرار دیتے جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ وشنو کی روح ان میں حلول کرگئی تھی۔ وشنو کی روح صرف انسانوں کے اندر ہی حلول نہیں کرتی بلکہ جانوروں اور پودوں میں بھی حلول کر جاتی ہے۔

اوتار:

وشنو کے حسب ذیل ترتیب وار مشہور مظہر اوراوتار تھے:

1- متسیہ اوتار مچھلی کی صورت میں۔ 2- کورم اوتار کچھوے کی صورت میں 3- درہا اوتار سور کی صورت میں۔

4- نرسنگھ اوتار، انسان اور شیر کی مرکب صورت میں۔ 5- دامن اوتار بونے کی صورت میں۔

6- پرش رام کی صورت میں۔ 7- رام اوتار 8- کرشن اوتار 9- بدھ اوتار میں ابھی دسواں یعنی کالکی اوتار باقی ہے جو 425000 سال میں ظاہر ہوگا۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے وشنو نے نو اوتار لیے۔ جب دنیا کی اخلاقی حالت خراب ہو جاتی ہے تو خدا اس کو اصلاح کے لیے حیوان یا انسان کی صورت میں زمین پر جلوہ گر کرتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر بعض دیگر مذاہب ہندو مذہب میں ضم ہو گئے مثلاً بدھ مت اور بھاگوت مذہب۔

وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک میں سنگھ دوسرے میں گدا (گرز) تیسرے میں چکر (چرخ) چوتھے میں پدم (کنول)، وشنو کی سواری گزسٹر ہے جو انسان اور پرند کی مرکب صورت ہے اس کی بیوی لکشمی حسن اور دولت کی دیوی ہے۔

شیو:

یہ برباد کرنے والا دیوتا ہے، اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ (تری لوچن) ہے جب وہ اسے کھولتا ہے تو آگ اس طرح نکلنا شروع ہو جاتی ہے گویا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ ہر چیز جل کر راکھ بن جاتی ہے۔ کام دیو (عشق کا دیوتا) اس کی نگاہ غضب کا شکار ہو کر اپنے جسم سے محروم ہو گیا۔

یہ رگ وید کے دیوتا ردر یعنی ہوا یا پانی کے دیوتا سے مشابہہ ہے بعد میں یہی دیوتا اگنی کے مشابہہ ہو جاتا ہے۔ ویدک زمانہ میں یہ دیوتا تباہی و بربادی کے ذمہ دار متصور ہوتے تھے۔

شیو جی کے مقلدین کی علامت لنگم تھی۔ اس نشان سے ان کے مندر بھرے ہوئے تھے۔ اس علامت پر لنگا تیوں کا فرقہ قائم ہوا۔ پجاری مندر میں جاتے ہیں تو لنگم کو بوسہ دیتے اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں میسور (دکن) کی دراوڑی قوم میں لنگم کی پرستش ابھی تک جاری

ہے۔

موہنجوڈارو سے دریافت شدہ اثرات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیوجی کی پرستش وہاں عام تھی۔

لنگم کے مقابل پریونی (زنانہ عضو مخفی) کی بھی پرستش ہوتی تھی شیو کی بیوی کا نام کالی دیوی ہے جن کے مختلف مقامات پر مختلف نام ہیں۔ کالی، پربتی اوما، درگا یہ مختلف نام مختلف اوصاف کی وجہ سے ہیں۔ کالی دیوی موت اور زندگی کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ایک دن تمام عالم کو فنا کردے گی۔ پربتی اوما کی حیثیت سے ایک حسین اور رحم دل ماں دکھائی گئی ہے، درگاہ کی حیثیت سے ایک غضب ناک حسین عورت کی شکل میں شیر پر بٹھایا ہے۔

گائے کی پرستش:

حیوانات کی پرستش وحشی قوموں کی یادگار ہے۔ وہ حیوانات کو انسانوں، دیوی اور دیوتاؤں سے برتر خیال کرتے ہیں۔ ہندو کلچر کی بنیاد بھی گائے بیل کی عظمت اور پرستش پر ہے۔ ہندوؤں میں ویدوں سے لے کر پرانوں، سمرتیوں اور مذہبی قصص تک اس کی پرستش اور عظمت کا ذکر ہے۔

گائے کی پرستش کا اثر:۔

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ قدیم ہندوستان میں دھرماتما گائے کے گوبر میں سے دانے چن چن کر کھاتے، اس کا پانی نچوڑ کر پیتے (مہابھارت) تمام دھرم شاستروں میں اس کا گوہ اور پیشاب پینا گناہوں کی معافی کا طریقہ خیال کیا گیا ہے۔ (منوسمرتی)

ہندو دھرم کا مجموعہ قوانین

چونکہ ویدوں میں معاشرتی تقسیم ہے اس وجہ سے ہندو دھرم کے قانون سازوں نے بھی قوانین کی بنیاد معاشرتی تقسیم پر رکھی جس کی وجہ سے ہندو دھرم کے قوانین میں نہ انصاف ہے اور نہ مساوات جس کی وجہ سے نچلی ذات کے ہندوؤں کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی۔

ہندوؤں میں منوسب سے بڑا قانون ساز ہے۔ اس نے تمام معاشرے کو درجہ بندی کے ساتھ چار ذاتوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے افضل برہمن پھر کشتری اس کے بعد ویش پھر شودر کا درجہ ہے پھر ہر ذات کے لیے الگ الگ فرائض مقرر کیے گئے ہیں۔ ان چار ذاتوں میں شودر بہت ہی بہت ہی ذلیل ورن ہے۔

دنیا کی نشوونما کے لیے برہمہ نے برہمن کشتریہ (جنگجو) ویش (تاجر) شودر (کم درجہ کے خادم) کو بالترتیب اپنے چہرے بازوؤں، رانوں اور پیروں سے پیدا کیا۔ (منو کا ضابطہ قانون 1 : 31)

فرائض:

ویش کا کام کھیتی کرنا سود لینا، چارپایہ کی پرورش کرنا ہے یہ سب کام ویش سے کرائے جائیں برہمن، کشتری اور ویش کی سیوا شودروں سے کرائی جائے۔ (1 : 90)

مالک نے شودروں کے لیے صرف ایک پیشہ لکھا ہے وہ (باقی) تین ذاتوں کی خدمت نہایت عاجزی اور انکساری سے کریں۔ (91 : 1)

برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض

قرار دیا ہے۔ (88 : 1)

چھتری کو اس نے حکم دیا ہے کہ خلقت کی حفاظت کرے دان دے چڑھاوے چڑھائے وید پڑھے اور شہوات انسانی میں نہ پڑے۔ (باب اوّل 89)

شودروں پر مظالم:

شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔ اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر، چوتڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔ (منو 2 : 281)

اسی درجہ بندی کی وجہ سے شادی بیاہ کے قوانین بنائے گئے۔ نچلی قوم کی عورت اوپر کی قوم کے مرد سے اوپر کی قوم کی عورت نچلی قوم کے مرد سے شادی نہیں کرسکتی منو کے قانون میں غلاموں کی آٹھ قسمیں ہیں:

1- لڑائی میں فتح کیا ہوا۔ 2- خوراک پر غلامی منظور کرنے والا 3- کسی جرم کے عوض غلطی قبول کرنے والا 4- گھر کی داسی سے پیدا ہونے والا۔ 5- خرید کیا ہوا 6- ان میں سے ملا ہوا۔ 7- بزرگ سے وراثت میں ملا ہوا۔ 8- بھگت یہ سب داس ہیں۔

منو کے قانون کی رو سے عورت بیچاری ایک خادمہ ہے اور معاشرہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ عورت خواہ نوجوان لڑکی ایک بالغ دوشیزہ ایک بوڑھی عورت ہو۔ وہ خود مختاری سے گھر کے اندر بھی کام نہیں کرسکتی نوجوانی میں اسے اپنے باپ کے اختیار میں اور جوانی میں اپنے خاوند کے اختیار میں رہنا چاہیے۔ جب خاوند مر جائے تو اسے اپنے بیٹوں کی حفاظت میں رہنا چاہیے اسے خود مختاری کو پسند نہیں کرنا چاہیے (دیکھیے منو 5 : 147 - 149) اسی طرح منو کے قانون میں جرائم کی سزاؤں میں نہ تو عدل و انصاف کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور نہ فطرت انسانی کو۔ سزائیں وحشیانہ ہیں بعض خفیف جرائم کی سزائیں سنگین ہیں اور بعض سنگین جرائم کی سزائیں خفیف ہیں اور طبقاتی تقسیم کے اصول کو بھی سزاؤں میں مدنظر رکھا گیا ہے۔ برہمن مجرم قتل کی سزا سے مستثنیٰ ہے۔ (8 : 28)

ہندوؤں کے مقبولہ و مروجہ عقائد

مسئلہ نیوگ:

دنیا کے ہر مذہب میں مرد اور عورت کے باہمی جنسی تعلق کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ معاشرہ کی عمارت اس تعلق پر استوار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر مذہب نے اس تعلق کا بنیادی پتھر پاکیزگی اور طہارت کو قرار دیا ہے۔ جب تک یہ تعلق پاکیزہ نہ ہو اس وقت تک نہ سوسائٹی پاکیزہ رہ سکتی ہے اور نہ انسانیت کی عمارت قائم رہ سکتی ہے دیانند جی نے مرد و عورت کے باہمی جنسی تعلق کا ایک نیا طریقہ بتا دیا ہے اور وہ نیوگ ہے۔ نیوگ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اس بیوہ کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کرے اور اپنی شہوت کو تسکین دیتی رہے۔ اس حکم کو صرف یہیں تک محدود نہیں کیا بلکہ ایک شوہر والی عورت کو بھی اجازت دے دی ہے کہ اگر اس کے شوہر سے اولاد پیدا نہ ہو تو وہ کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر نطفہ لے لے اور اولاد حاصل کرے۔ وہ عورت دس مردوں سے علیحدہ علیحدہ ہم بستر ہو کر نطفہ لے سکتی ہے۔ اس طرح جو اولاد پیدا ہو گی وہ اس خاوند کی ہو گی جس کی ہم بستری سے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ سوامی دیانند جی ستیارتھ پرکاش میں لکھتے ہیں:

”جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تو اپنی عورت کو اجازت دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی تو مجھ سے

علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر۔ کیونکہ اب مجھ سے تو اولاد نہیں ہوسکے گی۔ تب عورت دوسرے کے ساتھ نیوگ کر کے اولاد پیدا کرے لیکن اس بیاہے عالی حوصلہ خاوند کی خدمت میں کمربستہ رہے، ویسے ہی عورت بھی جب بیماری وغیرہ میں پھنس کر اولاد پیدا کرنے کے نہ قابل ہو تب اپنے خاوند کو اجازت دے کہ اے مالک آپ اولاد کی امید مجھ سے چھوڑ کر کسی دوسری بیوہ عورت سے اولاد پیدا کر لیجیے جیسے پانڈو راجہ کی عورت کنتی اور ماوری وغیرہ نے کیا اور جیسا ویاس جی نے چیتر انگد اور وچتر ویرج کے مرجانے پر اپنے بھائیوں کی عورتوں سے نیوگ کر کے امیکا امبا سے دھرت راشٹر اور امبایکا سے پانڈو اور داسی سے دور کو پیدا کیا۔ اس قسم کے تاریخی واقعات بھی اس بارے میں ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ (ستیارتھ صفحہ 137)

مادہ وروح کے ازلی وابدی ہونے کا عقیدہ:

سومی دیانند اللہ کی طرح مادہ اور روح کو ازلی ابدی مانتا ہے ستیارتھ پرکاش کے صفحہ 274 پر مذکور ہے کہ جب سوامی دیانند سے یہ سوال کیا گیا کہ ازلی کس کو کہتے ہیں اور کتنی اشیاء ازلی ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ تین چیزیں ازلی ہیں۔ پرمیشور، جیو اور پرکرتی دوسری جگہ پانچ چیزوں کو ازلی قرار دیا گیا ہے کہ ''پیدائش عالم سے پرمیشر پرکرتی کال (زمانہ) اور اکاش نیز جیو جو ازلی ہیں موجود ہوتے ہیں اس سے دنیا کی پیدائش ہوئی (ستیارتھ پرکاش ص 283)

اس کی مزید تائید اس عبارت سے ہوتی ہے کہ ''درحقیقت آکاش کی پیدائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ بغیر آکاش کے پرکرتی اور پامانو کہاں ٹھہر سکیں گے (تیارتھ پرکاش ص 290)

پھر لکھا ہے کہ ''آکاش غیر متناہی اور محیط کل ہے'' (ستیارتھ پرکاش ص 249)

عقیدۂ تناسخ

تناسخ کو سنسکرت والے آواگون کہتے ہیں۔ تناسخ کے ماننے والے اس کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ گناہوں اور نیکیوں کے باعث بار بار جنم لینا اور مرنا آواگون کا عقیدہ ہے کہ روحوں کی تعداد محدود ہے اللہ تعالیٰ نئی روح پیدا نہیں کر سکتا اس وجہ سے ہر روح کو اس کے گناہ کی وجہ سے آواگون کے چکر میں ڈال رکھا ہے اور ہر گناہ کے بدلے میں روح ایک لاکھ چوراسی ہزار مرتبہ مختلف شکلوں میں جنم لیتی ہے۔ ایک ارشاد یہ ہے کہ اپنے گزشتہ اعمال اور علم کے مطابق بعض حصول جسم کے لیے رحم میں داخل ہوتی ہیں اور بعض مقیم اشیاء پودوں وغیرہ میں (کٹھ اپنشد)

دنیا میں حیوانات، نباتات، جمادات، دنیا میں اختلاف اور انسانوں کا بیماری اور دکھ میں مبتلا ہونا سب پچھلے گناہوں کی وجہ سے ہے۔

تبصرہ:

قارئین کے سامنے ہندو دھرم کی تصویر پیش کردی گئی ہے کہ ان کی کتاب وید کے متعلق نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کن رشیوں پر نازل ہوئے کب نازل ہوئے، کہاں نازل ہوئے اور وید تعداد میں کتنے تھے۔ دلائل کے ساتھ یہ بات بھی ثابت کی جاچکی ہے کہ وید تضادات کا شکار ہیں۔ جب ان کی تعلیمات پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی حقیقی روح ''توحید'' سے ہی خالی ہیں۔ دوم حقوق انسانی جن سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور جن کے بغیر انسانوں کے درمیان حقیقی رشتہ قائم نہیں رہ سکتا پامال کردیئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے معاشرہ چار ذاتوں (برہمن، کھشتری، ویش اور شودر) میں منقسم ہوگیا۔ عورت کو دائمی غلامی کا طوق پہنا دیا گیا جو ہر حق سے محروم ہے۔

روح و مادہ کو قدیم ماننے سے خدا کی خدائی اور اس کی قدرت اور صفت خالقیت ہی باطل ہو جاتی ہے۔ گویا ہندو قوم کی جڑ خدا شناسی اور معرفت نعماء الٰہی سے کٹی ہوئی ہے۔

جین مت

جینیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کا مذہب بہت پرانا ہے اس میں چوبیس تیر تھنکر یعنی رہنما ہو گزرے ہیں۔ جو سب چھتری گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جین روایت کے مطابق رامشو پہلا مہاویرا اور وردھمان چوبیسواں تیرتھنکر تھا۔ وہ پٹنہ سے 27 میل شمال سے ویشالی میں ایک چھتری گھرانے میں 540 ق۔م کو پیدا ہوئے اور بعض روایات کے مطابق ان کی ولادت 599 میں ہوئی اور 72 سال کی عمر میں جنوبی بہار کے ایک مقام ''پاوا'' 486 ق۔م میں وفات پائی۔ امولیہ رنجن مہاپتر کے نزدیک وفات 27 ق۔م میں ہوئی۔ فلسفہ مذاہب ص 203)
جس دور میں مہاویر پیدا ہوئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ نروان کا حاصل کرنا تھا۔ مہاویر نے نروان کے حصول کے دو طریقے سلبی اور ایجابی بیان کیے ہیں۔ نروان حاصل کرنے کا سلبی طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل سے ہر قسم کی خواہشات اور آرزوئیں نکال دے کیونکہ خواہشات اور تمنائیں ہی مصائب اور رنج کا باعث ہوتی ہیں۔ جب انسان کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ غم سے دوچار ہوتا ہے جب خواہش ہی نہ ہوگی تو روح مسرت اور خوشی سے ہمکنار ہوگی اور یہ قلبی مسرت اور راحت ہی نروان ہے۔

مہاویر کے نزدیک نروان کے حصول کا ایجابی طریقہ یہ ہے کہ انسان کے عقائد، علم اور عمل صحیح اور درست ہوں، انہیں تین رتن کہا جاتا ہے۔ اعمال کی درستگی کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے:

اہمسہ (Ahmsa) کسی ذی روح کو تکلیف نہ دی جائے۔

ستہام (Satham) راستی کو اپنا شعار بنایا جائے۔

استیام (Asteyam) حلال روزی کمائی جائے۔

برہمچاریام (Brahma Charyam) پاکدامنی اور عفت کی زندگی۔

اپری گراہیہ (Apari Graha) حواس خمسہ پر مکمل غلبہ اور فتح ہونی چاہیے۔

جین مت کسی مافوق الفطرت ہستی کے قائل نہیں ان کے نزدیک خدا انسان کی روح میں مضمر استعدادوں اور صلاحیتوں کی جلاء، تکمیل اور اظہار کا دوسرا نام ہے۔

مہاویر وید کے نظریہء روح کے بھی مخالف ہے

عقائد:

جین مت کے بنیادی عقائد سات ہیں۔

1- جیو روح ایک حقیقت ہے۔

2- اجیوا [1] غیر ذی روح وجود ہے۔

جین مت کی کتب:

جینیوں کے پاس دو قسم کے صحائف ہیں، انہیں پورو اور انگ کہا جاتا ہے۔ پوروں کی تعداد 14 ہے اور یہ ناپید ہیں تاہم اس وقت 14 انگ، 22 اُپ انگ، 10 پا کنکا، 6 چھید، 4 مول سوتر اور دو دیگر سوتر جین ادب کا مرکزی حصہ ہیں۔ جینیوں کے صحائف کو آگم (ہدایت نامے) یا سیدھانت (مقالے) کہا جاتا ہے۔ عام جینیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ آگم وہی ہیں جو مہاویر اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے لیکن جینیوں میں صحائف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ شویتامبر فرقہ کے نزدیک ان تعلیمات کا بارہواں حصہ جو چودہ کتابوں پر مشتمل تھا ضائع ہو چکا ہے جب کہ دوسرے فرقے دیگامبر کے نزدیک اب جین مت کے پاس کوئی کتاب نہیں۔ مروجہ کتب ان علماء کی تحریرات ہیں جن میں ایک جینی عالم اماوستی کی کتاب تتوارتھ دیگما سوتر کو پہلی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو دونوں فرقے قابل احترام سمجھتے ہیں۔

فلسفہ:

جین لوگ ہندوؤں کی طرح آواگون اور مکتی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن مکتی (نجات) کے بارے میں ان کا عقیدہ ہندوؤں سے مختلف ہے۔ ان کے نظریہ کی رو سے جب کوئی روح گناہ کرتی ہے تو وہ بوجھل ہو کر نیچے کی طرف ڈوبنے لگتی ہے حتیٰ کہ وہ اس قدر بوجھل ہو جاتی ہے کہ ساتویں دوزخ میں جا گرتی ہے۔ جو روح مطہر ہو جاتی ہے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اوپر کو صعود کرتی ہے اور چھبیس بہشتوں میں سے کسی ایک میں قرار کرتی ہے۔ جب وہ بہت ہی لطیف اور تمام آلائشوں سے منزہ ہو جاتی ہے تو چھبیسویں بہشت میں پہنچ جاتی ہے، تب اسے نروان حاصل ہو جاتا ہے۔ جینی مادہ روح (جیو) کو ابدی مانتے ہیں جو روح مکتی پا جاتی ہے تو وہ پیدائش اور موت کے چکر میں نہیں آتی۔ کرموں سے نجات پانے کا نام ہی مکتی ہے جو مکتی حاصل کر لیتا ہے وہ پرمیشور (خدا) ہو جاتا ہے۔ چوبیس تیرتھنکروں نے مکتی حاصل کر لی۔ اس لیے وہ پرمیشور ہیں۔ اس دنیا میں ایک پرمیشور نہیں جتنے لوگ مکتی حاصل کر لیتے وہ پرمیشور ہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں وہ ایسے پرمیشور کے وجود کے قائل نہیں جسے قدیم اور خالق کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے اعتراض کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھتے ہیں اگر خدا (ایشور) کو کائنات کا بنانے والا اور ارواح کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ دینے والا مانو گے تو ایسا خدا (ایشور) دنیا کا پابند ہو جائے گا حالانکہ وہ آزاد ہے۔ ایشور کی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ کرم سے ہوتا ہے۔ ارواح اعمال کے نتائج کو اسی طرح بھگتتی ہیں جس طرح وہ نشہ آور چیز پینے سے نشے میں آ جاتی ہیں۔ اس میں ایشور کا کوئی دخل نہیں۔

تبصرہ:

جینیوں کے پاس بھی محفوظ صحائف نہیں اور نہ ہی ان میں خالص توحید پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے تیرتھنکروں کو ایشور گردانتے ہیں جینیوں کے پاس حقوق انسانی کا کوئی چارٹر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ پوری انسانیت کا دین نہیں بن سکتا۔

---

[1] یہ پانچ عناصر پر مشتمل ہے مادہ (پدگل) حرکت (دھرم) سکوں (ادھرم) مکان (اکاش) وقت (کال) یہ پانچوں عناصر ازلی وابدی ہیں صرف جیو میں زندگی ہے باقی تمام چیزیں بغیر زندگی کے ہیں۔

بدھ مت

گوتم بدھ 563 ق۔م میں شمالی ہند کے علاقہ نیپال میں ساکیہ قبائل کی راجدھانی کپل وستو کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لنبی میں پیدا ہوئے۔ ساکیہ منی گوتم کی تربیت و پرورش شاہی طریقہ پر ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں گوتم سدھارتھ کی شادی اپنے چچا کی بیٹی یشودھرا (سنسکرت یشودھا) سے ہوئی۔ شادی کے دس سال بعد ان کے ہاں لڑکا پیدا۔ گوتم کی اوائل عمری کے حالات پردۂ کتمان میں ہیں۔ گوتم بچپن میں ہی خاموش طبع، غور وخوض کا عادی اور نیکیوں کی طرف مائل رہتا تھا۔ گوتم کا دل لوگوں کو مصائب، تکالیف میں مبتلا دیکھ کر بہت کڑھتا تھا اور اطمینان قلب کا متلاشی رہتا تھا۔ آخر کار 29 سال کی عمر میں رات کی تاریکی میں محل کو چھوڑا اور نروان کی تلاش میں نکل پڑا۔ راج گڑھی مگدھ کی سلطنت کا دارالخلافہ اور خوبصورت اور دلکش وادی میں پانچ پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ ان پہاڑوں کی غاروں میں چند مشہور درویش رہتے تھے گوتم ان کے پاس چلا گیا۔ ایک اتر نامی فقیر کے مرید ہو گیا لیکن جب اس فقیر کی صحبت سے تسکین قلب کی دولت میسر نہ آئی تو ایک عابد وزاہد فقیر اورک نامی کی طرف گیا۔ ان دونوں درویشوں نے ہندو مذہب کا فلسفہ سکھایا۔ جب ہندووانہ ریاضتوں سے اطمینان قلب حاصل نہ ہوا تو بے اطمینانی کی حالت میں گوتم بنارس چلے گئے۔ ایک بڑ کے درخت کے نیچے مراقبہ اختیار کر لیا آخر کار مختلف آزمائشوں کے بعد گوتم کو وہ گیان حاصل ہو گیا جس کے وہ متلاشی تھے۔ اس کے بعد لوگوں کو راہ ہدایت پر چلانے کے لیے میدان عمل میں آ گئے اور تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اسی سال کی عمر 488 ق۔م میں نارا نامی مقام پر (گورکھپور کے علاقے میں) انتقال کر گئے۔ اس وقت بدھ مت مگدھ اور کوش یعنی صوبہ بہار، صوبہ جات متحدہ آگرہ اور اودھ میں پھیل چکا تھا۔

گوتم بدھ کی تعلیمات ان کی زندگی مرتب نہیں کی گئیں بلکہ موجودہ بدھ تعلیمات چھٹی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک مرتب ہوتی رہیں۔ مختلف ادوار میں چار مجالس قائم کی گئیں آخری مجلس میں راجہ کنشک کے عہد میں اس کی زیر پرستی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اس مجلس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ بدھ مذہب کے اصولوں کے صحیح مطالب بیان کیے جائیں۔

یہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے پیچھے کوئی لکھی ہوئی کتابیں نہیں چھوڑیں۔ بدھ مت کے صحیفے اس کی وفات کے صدیوں بعد مرتب ہوئے، اس وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ جو باتیں ان صحائف میں درج ہیں وہ گوتم بدھ کی کہی ہوئی ہیں یا نہیں۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دونوں فرقوں ہنایانا اور مہایانا کی کتب میں سراسر اختلاف پایا جاتا ہے۔

ہنایانا (Hynayana) فرقہ کی کتب:

ہنایانا فرقہ کے تمام بنیادی اصول اور عقیدے شاید تیسری کونسل میں طے ہو گئے تھے لیکن یہ بھی دوسرے عہد تک لکھے نہ گئے۔ یعنی بدھ کی وفات کے تقریباً چار سو پچاس سال سے زیادہ عرصہ بعد یہ پالی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ تی پٹاکا (Pitaka) یا ترپٹاکا (تین ٹوکرے) پر مشتمل ہیں۔ ان کے الگ الگ نام ہیں۔

1- ونیہ پٹاکا (Vinaya Pitaka) جس میں وہ ضوابط درج ہیں جو پروہتوں کے لیے بدھ نے مقرر کیے تھے۔

2- سُتاپتاکا (Sutta Pitaka) جو بدھ کے ملفوظات اور وعظوں پر مشتمل ہے۔

3- ابھی دھماپتاکا (Abhi dhamma Pitaka) جس میں بدھ مت کا دینی فلسفہ اور نفسیات ہے۔

ان تینوں کتب کی بنیاد ان روایات پر رکھی گئی تھی جو راج گڑھ کے مقام پر منعقدہ مجلس میں بیان ہوئی تھیں۔

ان کتب کی زبان پالی ہے جو بعد میں وجود پذیر ہوئی۔ گوتم بدھ اس زبان میں کلام نہیں کرتے تھے۔

مہایانا (Mahayana) فرقہ کی کتب:

مہایانا فرقہ کی مذہبی کتب ہنایانا کی پالی کتابوں کے بخلاف ترتیب سے عاری ہیں۔ وہ چار زبانوں سنسکرت، چینی، تبتی اور جاپانی میں ہیں۔ ان میں سے اکثر کا متن سنسکرت میں ہے۔ مہایانا بدھ مت کی کتب کا بیشتر حصہ بہت بعد کی پیداوار ہے کچھ حصے بہت پرانے ہیں تاہم فرقہ نہایانا کی کتب سے زیادہ پرانے ہیں۔ ان میں سے مشہور دی مندسترا (Dimond Sutra) 2- لنکاوتراسترا (Lanka Vatara Sutra) 3- کانول کامل کا پدم (The Lotus of the Perfect Law) 4- سورنگما سوترا (Surangama Sutra) 5- سکھاوتی یوہاسترا (Sukhavati uyuha Sutra) 6- بیداری ایمان (The awakening of faith)

فلسفہ بدھ کا مرکزی نقطہ:

بدھ مت کی مرکزی نقطہ نروان کا حصول ہے۔ گوتم بدھ کے نزدیک ہر برائی کی جڑ خواہش نفسانی ہے۔ جب انسان خواہشات نفسانی کی سرکش اونٹنی کو اطاعت الٰہی کی چھری سے ذبح کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کی صفات میں رنگین کر لیتا ہے تو اس وقت اس کی روح اللہ کی روح سے اتصال کر جاتی ہے گوتم بدھ اس حالت کا نام نروان رکھتا ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات کے متعلق جو کتبے ملے ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گوتم بدھ نے اللہ تعالیٰ کی توحید ملائکہ، قیامت اور حیات بعد الممات کی تعلیم دی ہے۔

گوتم بدھ کی وفات کے لمبے عرصے بعد مختلف مجالس کے ذریعے گوتم کی تعلیمات کی تدوین کی وجہ سے مختلف نظریات کے حامل فرقے پیدا ہوئے۔ نہایانا یعنی جنوبی بدھ مت ہستی باری تعالیٰ، وجود روح اور وحی الہام کا منکر ہے۔ مہایانا فرقہ نے بدھ کو ہی خدا قرار دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے دیوتاؤں کی پرستش لازمی قرار دے دی ہے۔ ہر جگہ بدھ مت نے مقامی توہم پرستی اور رسوم کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اس طرح مروجہ بدھ مت رسوم، بت پرستی اور بزرگوں کے تبرکات کی پرستش اور رہبانیت کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔

تبصرہ:

گوتم بدھ کی کتب گوتم بدھ کی وفات کے بعد مدون کی گئیں۔ جو روایات کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ روایات، کس حد تک صحت کے ساتھ قلمبند کی گئی ہیں۔ پھر دونوں فرقوں کی کتب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جس سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ روایات کی صحت مشکوک ہے۔ مزید برآں مروجہ بدھ مت کا دامن توحید سے خالی ہے۔ جو مذہب توحید کے نور سے خالی ہو وہ مذہب انسانیت کی فلاح کا موجب نہیں بن سکتا۔

......☆☆☆......

زرتشت مذہب

زرتشت کے زمانہ میں محققین کا شدید اختلاف ہے۔ زمانہ حال کے محققین کی رائے کے مطابق وہ 660 ق۔م میں پیدا ہوئے اور 583 میں انتقال کیا۔ مغربی ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کا جائے پیدائش شہر رے ہے۔ بیس سال کی عمر میں گھر بار چھوڑ کر سیالان پہاڑوں میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ انہیں تیس سال کی عمر میں گیان حاصل ہو گیا تھا۔ گاتھا وہ مقدس منظومات ہیں جو زرتشت نے لکھی تھیں۔ گیان حاصل ہونے کے بعد زرتشت نے توحید کی اشاعت میں انتھک کوشش کی۔ زرتشت کے خدا کا نام اہورامزدا تھا۔ اہور کے معنی مالک اور مزد کے معنی ہیں دانا کے ہیں یعنی دانا مالک۔

331 ق۔م میں سکندر اعظم نے ایران پر حملہ کیا اور پرسیپولس (Persepolice) کے عظیم الشان کتب خانہ کو جلا دیا۔ زرتشتی عالم اور پروہت جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں میں جا چھپے۔ کتب جلا دی گئیں۔ کافی عرصہ کے بعد پروہتوں نے اپنے حافظوں کی مدد سے کتب کو از سر نو مدون کیا۔ لازمی طور پر ان مدونہ کتب میں تحریف ضرور ہوئی ہوگی۔ شاہ ارتبانس (Artabnuŝ) نے بھی اپنے عہد میں زرتشتی کتب کی تدوین کروائی اور یہودی زبان میں ان کے تراجم ہوئے۔

مدونہ کتب:

قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں ایک دساتیر اور دوسرے ژند اوستا ان کتب کے دو حصے ہیں خوردہ دساتیر اور کلاں دساتیر۔ 2۔ خوردہ اوستا اور کلاں اوستا۔ اوستا کے پانچ حصے ہیں۔ 1- یاسنا۔ 2 گاتھا 3- وسپرید 4- وندیداؤ 5- یاشت ان میں سے خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا عبادت اور قربانی سے متعلق ہے دوسرا حمد و مناجات سے متعلق انہی دو کو ژند اور مہا ژند بھی کہتے ہیں۔ پانچویں صدی قبل از مسیح ایران میں زرتشتی مذہب کے ستر کے قریب فرقے تھے۔ ہر فرقہ کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے پاس ہی اصل اوستا ہے۔ شاہ ایران ارتخشاہ (Artaxeues) نے ان اختلافات کو مٹانے کے لیے قریب 50 م ق م علماء کی ایک کونسل منعقد کی۔ اس کونسل میں قریب اسی ہزار پجاری شامل ہوئے۔ اس قدر کثیر پجاریوں کی وجہ سے اوستا کی تدوین کا کام مشکل ہو گیا۔ بادشاہ نے ان کے سات پجاری (مغ) منتخب کر لیے۔ ان سات پجاریوں نے اوستا کی از سر نو تدوین کی۔ اس کے متعلق گبن لکھتا ہے:

"ان سات مغوں (پجاریوں) میں سے ایک مقدس نوجوان اُدوادیرف نامی کے سامنے آتشیں شراب کے تین پیالے پیش کیے گئے۔ اس نے انہیں پیا اور اس کے بعد ایک لمبی اور گہری نیند سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے بادشاہ اور دیگر حاضرین کو بتایا کہ اس نے کس طرح آسمانوں کی سیر کی۔ پہلے مقدس دیوتاؤں کی اس سے ملاقات ہوئی۔ سننے والوں کے شک و شبہ کے خیالات اس نوجوان کی مافوق الفطرت شہادت (آسمانی) کے سامنے دب گئے اور اس طرح زرتشت مذہب کا ضابطہ قوانین مرتب کیا گیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسٹر کپاڈیا کی کتاب (The Teaching of Zoroasiter)۔

ادوادیرف کی مدوّنہ استا بھی اسکندر کے حملے کے وقت نذر آتش ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد مدت دراز تک اوستا کا کہیں نام نہیں۔

ساسانیوں کے دور میں زرتشت کی تعلیمات کو اکٹھا کر کے ایک مجموعہ مدون کیا گیا جو اس وقت اوستا کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک حصہ لینا کہلاتا ہے جو 73 ابواب پر مشتمل ہے دوسرا حصہ وندیداد کہلاتا ہے تیسرا ویسپرید ہے چوتھا یشت۔

زرتشتی مذہب پر تبصرہ:

کتابوں کی تعداد، زبان اور زمانہ تدوین کے متعلق اس قدر شدید اختلافات میں کہ کوئی محقق بھی قطعی طور پر دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کتب زرتشت کی طرف منسوب ہیں وہ واقعی بغیر کسی تحریف کے ان کی ہی ہیں۔

جہاں زرتشت کی کتاب میں لفظی تحریف کی گئی وہاں معنوی تحریف لازمی تھی۔ توحید کی جگہ مظاہر پرستی نے لے لی، گھر گھر میں دیوتاؤں کی پوجا شروع ہوگئی۔ ایک انگریز مورخ نے زرتشتی مذہب میں فساد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: ''زرتشت کے بعد جب یہ مذہب انبیاء کے دائرے سے نکل کر ملکی سیاست دانوں کے قبضہ میں آیا تو پھر خدائے واحد اہورا مزدا کا تخیل ایک شہنشاہ کا سا ہوگیا۔ لوگوں نے اعتقاد قائم کر لیا کہ وہ دنیا کا خالق اور مدبر ہونے میں بہت سے خداؤں کی مدد کا محتاج ہے اور ان کو چھوٹے چھوٹے خدا تصور کر لیا گیا۔

(Our Oriental Heritage, chap. XIII PP 366)

مانوی مذہب

مانی طیغون کے شہر میں 215ء پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام فتق تھا۔ جو یہودی فرقہ مغتسلہ کا پیروکار تھا۔ ابن ندیم کی روایت کے مطابق 12 سال کی عمر میں (228/9ء) میں اسے پہلی وحی ہوئی۔ بقول مانی یہ وحی ملک جنان النور یعنی خدا کی طرف سے ہوئی۔ وحی لانے والے فرشتے کا نام ''التوم'' تھا جس کے لفظی معنی ''قرین'' ہیں۔ پہلی وحی میں مندرجہ ذیل مقالات دیئے گئے۔ 1- آج سے تم اپنی قوم سے اپنے کو علیحدہ سمجھو۔ 2۔ ان سے ایک طرف ہو جاؤ 3۔ پاکیزہ روی اختیار کرو۔ 4- شہوات ترک کر دو۔ 5- جب تک تم کم سن ہو اس وقت تک نہ اپنے مذہب کا اظہار کرو اور نہ تبلیغ کا۔

پہلی وحی کے آنے کے 12 سال بعد یعنی 240ء میں جب اس کی عمر 24 سال ہوئی تھی تو مانی کو دوسری وحی ہوئی۔ اس دفعہ یہ حکم ہوا دیکھو! وقت آ گیا ہے کہ اپنے مذہب کا اظہار کرتے ہوئے تبلیغ شروع کر دی جائے۔ فرشتے نے مانی سے یہ بھی کہا اے مانی میں اپنی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سلام کرتا ہوں۔ آپ کو اس راہ میں بے حد مشقت برداشت کرنا پڑے گی۔

مانی نے اپنے مذہب کی تبلیغ شاپور اول کے عہد سے 240ء میں شروع کی۔ شاپور کے تعلقات مانی سے اچھے تھے۔ اس نے مانی کے متبعین کو تنگ نہیں کیا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ شاپور کا بھائی پرویز مانی کا مربی تھا۔ لیکن ایرانی کاہنوں اور زرتشتی مذہب کے پیروکاروں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مانی کو ملک چھوڑنا پڑا۔ اس نے وسط ایشیا، چین اور ہندوستان کا سفر اختیار کیا پھر ترکستان آیا یہاں اس نے ایک سنسان وادی میں خلوت اختیار کر لی۔ اور ایک کتاب ارژنگ یا ارتنگ تیار کر لی۔ اس کتاب کو لے کر واپس ایران آیا۔ اب اسے نمایاں کامیابی ہوئی۔ شاپور کے بعد (272ء) اس کا لڑکا ہرمز اول تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی مانی کے متعلق اپنے باپ کی پالیسی کو برقرار رکھا۔ وہ 273ء میں فوت ہو گیا ہرمز کی وفات کے بعد بہرام اول تخت نشین ہوا۔ بہرام نے مانی اور اس کے متبعین پر سختیاں کرنا

شروع کر دیں۔ مانی نے وطن سے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

277ء میں مانی کو گرفتار کر کے بہرام کے سامنے پیش کیا گیا جس نے اس کی کھال کھنچوا کر بھس بھرا دیا۔ مانی کی کھال کا پتلا ایک عرصہ تک شہر شاپور کے پھاٹک پر عبرت کے لیے رکھا۔

مانی کی سات تصنیفات میں چھ سریانی زبان میں اور ایک پہلوی میں ہے۔ آخری کا نام شاپورگان ہے جو شاپور کے نام معنون ہے۔ یہ کتاب بادشاہ شاپور کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔ 1904ء میں قان میں کاق نامی محقق نے طرفان (وسط ایشیا) سے بعض مانوی صحائف برآمد کیے۔

تبصرہ:

دوسرے ہادیوں کی طرح مانی کا وعظ بھی توحید پر مبنی تھا لیکن مرورِ زمانہ سے مانی کی تعلیم رو بزوال ہو گئی، آخر کار تیرھویں صدی میں مانی مذہب بالکل مٹ گیا اور اب صرف تاریخی حیثیت سے قائم ہے اور دنیا میں زندہ مذاہب میں اس کا شمار نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ انسانیت کا مذہب نہیں بن سکتا۔

تاؤازم

تاؤازم کا بانی لاؤزے ہے جو 604 قبل مسیح میں ٹشو (Tchu) کے صوبہ میں پیدا ہوا۔ لاوزے کے معنی ہیں بوڑھا فلسفی یا بوڑھا لڑکا۔ اس کا اصل نام لی پہ یانگ تھا اور کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ عملی زندگی گورنمنٹ کی ملازمت سے شروع کی لیکن حاکمان ملک کی دغابازیوں اور ظلم وستم سے نالاں ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور لنگ پو (Ling Po) کی پہاڑیوں پر سکونت اختیار کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ درے کے ایک محافظ نے لاؤزے سے درخواست کی کہ وہ اپنی تعلیمات کے بنیادی اصول اسے لکھوا دے۔ اس طرح لاؤزے نے اپنے فلسفیانہ خیالات لکھوائے جس کا نام تاؤتی چنگ (Tao - te - Ching) یعنی کتاب صراطِ مستقیم ہے۔ ٹی (Te) کے معنی راستہ کے ہیں اور راستہ خیر کا دیا گیا۔ تاؤ (Tao) چین کے فلسفہ کا نام ہے اب یہ کتاب 5000 لفظوں پر مشتمل ہے۔ اس کے 81 باب ہیں۔ اکثر محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ لاؤزے کی اصل کتاب کا محرف اور مسخ شدہ نسخہ ہے۔ کچھ اسے سراسر غیر مستند اور ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ اس امر کی صراحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ نظریہ انتہا پسندانہ ہے۔ گزشتہ صدیوں کی فروگزاشتوں اور اضافے کی گنجائش قبول کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کتاب کا بہت حصہ لاؤزے کے اپنے اقوال پر مبنی ہے۔

تاؤازم کی تعلیمات:

تاؤتی چنگ (Tao - Te - Ching) میں اہم ترین لفظ تاؤ ہے۔ اس کے متعدد معانی بیان ہوئے ہیں مثلاً خدا، آفاقی عقل کل، بے علت وجود یا علت العلل، امن کا راستہ، بولنا اور گفتگو کرنا، اصول وقانون۔

تاؤ کی صفات:

1- اس کا وجود ہمیشہ سے ہے۔ 2- تاؤ ہر جگہ موجود ہے۔

3- تاؤ ہی کی ذات سے تمام کائنات کی عظمت اور شان وشوکت قائم ہے۔ چاند اور سورج اپنے مدار پر اسی کی وجہ سے گھومتے ہیں

ننھے ننھے کیڑوں کو زندگی بخشنے والا ہے۔ 4- تاؤ کا جسم نہیں وہ ایک لطیف چیز ہے۔تمام اجسام اس کے پیدا کردہ ہیں۔ 6- تاؤ غیر متحرک ہے بایں ہمہ تمام کا خالق اور رازق ہے۔ 7- وہ ناقابل تقسیم ہے۔

لاؤزے حیات بعد الممات کا بھی قائل تھا۔وہ اس کو خوشگوار تبدیلی قرار دیتا ہے۔

مابعد تاؤازم:

ہر مذہب میں مرور زمانہ کے ساتھ خارجی عناصر شامل ہوتے رہے ہیں اور یہی ستم تاؤازم کے ساتھ بھی ہوا۔اس مذہب کے بگڑنے کی دو وجوہ ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے کچھ صحائف تلف ہوگئے ہیں اور کچھ محرف جو کچھ بچا وہ مفسرین کی تاویلوں کی تاریکی کے نیچے آ کر اپنی روشنی کھو بیٹھا اور عوام اپنے آقا کے اقوال کی معنویت تک پہنچنے کی صلاحیت سے عاری ہو گئے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس مذہب کے نظریات فلسفیانہ تھے جن کو عوام آسانی سے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ان فلسفیانہ نظریات کی عجیب و غریب تشریحات کی جانے لگیں جس کی وجہ سے مذہب بگڑ گیا اور اپنی اصلیت اور حقیقت کھو بیٹھا۔

تبصرہ:-

تاؤازم مرور زمانہ سے اپنی اصلیت کھو بیٹھا ہے اور یہ مذہب ایک مکمل دین نہیں اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔

کنفیوشس مذہب

کنفیوشس موضع کوفو (Ch'ufu) میں جو سلطنت لیو (Lu) موجودہ صوبہ شان تنگ (Shantung) میں ہے 550 ق۔م یا 551 ق۔م میں پیدا ہوا اور 478 ق۔م میں وفات پائی۔والدین نے اس کا نام کنگ چن رکھا لیکن تاریخ میں کنفیوشس کے نام سے مشہور ہوا۔کنفیوشس کو 50 سال کی عمر میں گیان حاصل ہوا۔کنفیوشس نے اپنی تقریروں میں ٹی ین (T - un) کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔ٹی ین خدا کی پروردگاری اور لامحدودیت پر دلالت کرتا ہے۔کنفیوشس کی تعلیم کے مطابق خدا ایسے قانون وضع اور نافذ کرتا ہے جن کے ذریعے کائنات وجود میں آئی ہے اور اپنے مقررہ وقت تک قائم رہے گی۔وہ اپنی شریعت انسان پر عیاں کرتا ہے جس پر عمل کر کے انسان مقصد حیات اور سعادت ابدی حاصل کرسکتا ہے۔اینلیکٹس (Analects) سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کنفیوشس نے اپنے زمانے میں خدائے واحد کا نام سربلند کیا۔اسی طرح یہ فلاسفر حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا بھی معتقد تھا۔

مرور زمانہ کے ساتھ یہ مذہب بے لچک اور فاسد ہوگیا۔بزرگوں اور فطری ارواح کی پرستش پھر سے مذہب کا جزو لاینفک بن گئی۔ رفتہ رفتہ لوگ اس بات پر ایمان لے آئے کہ کنفیوشس کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آیا تھا بلکہ وہ قدیم اعتقادات اور رسوم کے دوام اور احیا کے لیے سینہ سپر ہوا تھا چنانچہ اس کی توحید پرستی میں ارواح،فطرت اور شیاطین پرستی کے پرانے عقیدے شامل کر لیے گئے۔

کنفیوشس ازم پر تباہی:

کنفیوشس کے تقریباً اڑھائی سو سال بعد سین شیہ ہوانگ ٹی نام کے بادشاہ نے چین کی بہت سی ریاستوں پر قبضہ کرلیا۔اس نے

کنفیوشس کی تمام کتب کو جلا دینے کا حکم دیا۔ کچھ لوگ کنفیوشس کی چند کتب محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب سین بادشاہ کا انتقال ہوا تو ان محفوظ کتب کو از سر نو شائع کیا گیا۔ اس کی متعدد کتب میں سُن یو (Sun - yu) یعنی اینلیکٹس (Analects) اہم ترین ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس کی تعلیمات کا سمجھنا آسان ہے۔ یہ کنفیوشس کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو اس کے شاگردوں نے اس کی وفات کے بعد تالیف کیا۔ پانچ قدیم کتابیں ہیں جو قدیم روایات کے مطابق کنفیوشس کی ادارت میں لکھی گئی وہ یہ ہیں:

1- شو چنگ (Shu - Ching) 2- شی چنگ (Shih - ching) 3- لی چی (Li - Chi) 4- یی چنگ (Yi - Ching)
5- چون چن (Chiun - Chin)

ایک اور کتاب کنفیوشس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ یہ انتساب محل نظر ہے، اس کا نام ''علم عظیم'' (Great Learning) ہے۔

تبصرہ:

کنفیوشس کا مذہب بھی زندگی کے تمام شعبوں اور حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کے متعلق رہنمائی مہیا نہیں کرتا۔ اس لیے یہ مذہب بھی ساری انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں بن سکتا۔

شنٹوازم

لفظ شنٹو دو لفظوں شن اور ٹو سے مرکب ہے جن کا مطلب ہے دیوتاؤں کے ڈھنگ یا طور و اطوار۔

شنٹوازم جاپان کا قومی مذہب ہے اور اسی قوم اور ملک تک محدود ہے ہندومت کی طرح اس کا کوئی ایک بانی نہیں اس کا آغاز زمانہ قبل از تاریخ ہے یہ دونوں مذہب خاص قوموں کی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں اور سماج اور ثقافت کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کے دروازے دوسروں پر بند ہیں۔ زمانہ قبل از تاریخ میں جاپان میں جو قبیلہ حکمران تھا وہ سورج کی دیوی کی پرستش کرتا تھا۔ جس کے گرد ہزار ہا دیوی دیوتا اور بھی تھے۔ ان کے علاوہ اسلاف کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ اسی مظاہر اور اسلاف پرستی نے آگے چل کر اس مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ اب جاپان میں یہ مذہب قومی تمدن کی حیثیت بھی اختیار کر گیا ہے۔ الغرض شنٹوازم کثرت پرستی، مظاہر پرستی، آباء پرستی اور شاہ پرستی اور ہیرو پرستی کا مذہب ہے۔

یہودیت

مذہبی ادب:

بائبل دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک حصہ کا نام عہد نامہ عتیق ہے اور دوسرے کا نام عہد نامہ جدید۔ یہودی لوگ عہد نامہ عتیق کو مانتے ہیں جب کہ عیسائی عہد نامہ جدید کو مانتے ہیں۔ یہاں عہد نامہ عتیق پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

عہد نامہ عتیق کے دو نسخے ہیں، ایک عبرانی زبان میں مسورہ (یعنی روایتی نسخہ) دوسرا یونانی نسخہ جسے نسخہ سبعینیہ (سیپٹو ایجنٹ) کہتے ہیں۔

یہودی لوگ عبرانی نسخہ مسورہ کو مستند تسلیم کرتے ہیں اور عیسائی لوگ یونانی نسخہ کو مانتے ہیں۔
اصل یونانی نسخے میں 19 کتابیں مسورہ سے زائد ہیں جو رومی اور یونانی کلیسا میں پڑھی جاتی ہیں مگر پروٹسنٹ فرقہ نے انہیں بائبل سے خارج کر دیا ہے (ہسٹری اف دی انگلش بائبل ص 13)
عبرانی نسخہ (مسورہ) تین حصوں پر مشتمل ہے تورات 2 نبیم 3- کتیبم نبیم اور کتیبم کی کتابوں کی ترتیب یونانی اور مسورہ سے مختلف ہے۔

عہد نامہ عتیق:

عہد نامہ عتیق میں 29 کتب ہیں:

1- توریت میں پانچ کتابیں ہیں یعنی 1- پیدائش 2- خروج 3- احبار
4- گنتی 5- استثناء (بعض کے نزدیک چھٹی کتاب یعنی یشوع بھی تورات میں شامل ہے۔

2- پرانے انبیاء کی کتب:

اس میں چھ کتب شامل ہیں یعنی یشوع، قاضیوں، ایک سموئیل، دو سموئیل، ایک سلاطین اور دو سلاطین۔

3- متبرک تحریرات:

اس میں تیرہ کتب ہیں روتھ، ایک تواریخ، دو تواریخ، عزرہ، نحمیا، استر، ایوب، زبور، امثال سلیمان کی کتاب غزلیات، سلیمان، نوحہ یرمیاہ اور دانیال۔

4- بعد کے انبیاء کی کتب:

یہ تین ہیں یعنی یسعیاہ یرمیاہ، حزقیل 5 چھوٹے انبیاء کی کتب، اس فہرست میں بارہ کتب ہیں ہوسیا، جول، آموس، عبیدیا، یونس، میعاہ، نحوم، حبقوق، صفنیہ، ہگائی ملا کی کتاب۔
پس عہد نامہ عتیق کی مسلمہ کتب 29 ہیں۔ ان کے علاوہ چودہ کتب اور ہیں جو صرف یونانی عہد نامہ میں شامل ہیں جن کو خفیہ تحریرات کہتے ہیں۔

تورایت کی تدوین اور اس پر آسمانی بلائیں:

تمام مسیحی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ توریت پندرہ سو برس قبل مسیح لکھی گئی۔ پہلے وہ ایک جلد میں مدون ہوئی لیکن مسیحی علماء کے نزدیک جب بہتر 72 علماء نے 284 قبل مسیح میں توریت کو عبرانی زبان سے یونانی زبان پر منتقل کیا تو اس ایک کتاب کو پانچ مختلف کتابوں میں تقسیم کر دیا۔ 1- پیدائش 2- خروج 3- احبار 4- گنتی 5- استثناء ابواب اور آیات کی تقسیم مسیح کے بارہ سو چالیس سال بعد کارڈنل ہوگو نے کی۔ یہ تقسیم ناقص ہے کیونکہ کہیں کہیں معانی کے لحاظ سے اس تقسیم میں باہمی ربط کا فقدان نظر آتا ہے۔
یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ توریت میں جو کچھ موجود ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد مدون ہوا۔ لہٰذا اس میں تحریف وتبدل کا ہونا لازمی ہے۔

توریت کی بربادی

پہلی بربادی:

مسیحی علماء کے نزدیک توریت کی پہلی گمشدگی 698 قبل مسیح بادشاہ یہودیہ کے عہد میں ہوئی (احوال کتاب مقدس حصہ اول باب 48 ص 117 مطبوعہ لندن 1860)

تقریباً 75 برس کی گمشدگی کے بعد 624 قبل مسیح بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں کاہنوں کے سردار خلقیاہ نے اعلان کیا کہ اس نے ہیکل یروشلم میں توریت پائی ہے جس پر وقت کے بادشاہ نے اس کتاب کو پڑھوایا تو گھبرا کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے (دوم سلاطین باب 22 آیات 11:28)

ایک تحقیق یہ ہے کہ 971 ق۔ رحعام شاہ یہود کی سلطنت کے پانچویں سال سابق شاہ مصر نے جب یروشلم پر حملہ کیا اور ہیکل اور یہودی بادشاہ کے گھر کو لوٹا اس وقت توریت ضائع ہوئی۔ اس حساب سے توریت تین سو برس تک لوگوں کی نظر سے اوجھل رہی (اول سلاطین باب 14 آیات 26، 28،

بہرحال توریت ایک لمبے عرصہ تک گم رہی اور جب سردار خلقیاہ نے اس کے دوبارہ مل جانے کا اعلان کیا۔ اس وقت یہودیوں کے ہاں کوئی ایسا انسان موجود نہیں تھا جو حتمی طور پر اس امر کی تصدیق کرتا کہ حاصل شدہ کتاب توریت ہی ہے۔ اس دور میں نہ تو لکھنے کا عام رواج تھا جس وجہ سے یہ خیال کرلیا جائے کہ توریت کے کئی نسخے احاطہ تحریر میں آ گئے ہوں گے اور سردار خلقیاہ کو کوئی نسخہ مل گیا ہوگا۔ بائبل خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں توریت کے تحریری نسخے بہت ہی قلیل تھے۔ صرف ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ صرف ہیکل میں ایک نسخہ توریت کا رہتا تھا، تمام بنی اسرائیل وہاں آ کر اسے سن لیا کرتے تھے وہ بھی ہر سال نہیں بلکہ سات سال کے بعد توریت سب کو سنائی جاتی تھی (استثناء باب 31 آیات از 9 تا 12، 26 نحمیاہ باب 8)

بس اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو توریت کی عام اشاعت تھی اور نہ اس کی کثرت سے تلاوت ہوتی تھی۔ جو نسخہ ہیکل میں موجود تھا اس کی تباہی کی وجہ سے وہ نسخہ بھی ضائع ہوگیا۔

دوسری بربادی:

تقریباً چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر بابل کے بادشاہ نے سلطنت یہود پر حملہ کیا اور بے رحمی سے یہودیوں کو قتل کیا، جو یہودی بچ گئے ان کو قیدی بنا کر بابل میں لے گیا۔ یہ لوگ بابل میں ستر برس اسیر رہے۔ جب وہاں سے آزاد ہوئے تو وہ اپنی زبان بھول چکے تھے۔ اس تباہی کا واقعہ دوم تواریخ باب 36 میں درج ہے۔ سردار خلقیاہ کا پیش کردہ توریت کا نسخہ ہیکل میں رہتا تھا۔ بخت نصر نے ہیکل جلا کر پیوند خاک کردیا اور توریت کا نسخہ جل گیا۔ جب بنی اسرائیل اسیری سے نجات پا کر واپس لوٹے اور کچھ سکون نصیب ہوا تو انہوں نے توریت کو از سر نو ترتیب دینے کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ عزرا کی نسبت یہودی کتب میں لکھا ہے کہ شریعت بھلا دی گئی تھی مگر عزرا نے پھر اسے دوبارہ قائم کیا (Sank 20)

پھر لکھا ہے عزرا نے توریت کو دوبارہ زندہ کیا اور اس میں اشورین حروف داخل کیے (Sank 21)

تیسری بربادی:

170 ق۔م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ انٹیوئیس نے یہودیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے یروشلم پر بار بار حملے کیے۔ ہیکل کو بے حرمت کیا۔ مقدس صحیفوں کو جلادیا اور یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔

اس تباہی کے بعد جب یہودا اور مقابیس (مقابی) نے 165 ق۔م میں ہیکل کی مرمت شروع کی اس وقت اس نے توریت کی نقل کہیں سے مہیا کر کے ہیکل میں رکھی۔

چوتھی بربادی:

70ء میں طیطس (ٹائیٹس) شہزادہ روم نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے پیوند خاک کر دیا۔ ہیکل کو بالکل مسمار کر دیا، گیارہ لاکھ یہودیوں کو تہ تیغ کیا، ہزاروں کو قیدی بلکہ فروخت کیا۔ شہر اور ہیکل کی اس قیامت خیز تباہی میں توریت آگ کی نذر ہوگئی۔

پانچویں بربادی:

طیطس کے حملے تقریباً 65 سال بعد قیصر بدرین کے عہد میں یہودیوں نے اپنی طاقت جمع کر کے رومیوں کے ساتھ پھر ایک مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھائی اور پانچ لاکھ کے قریب آدمی قتل ہوئے بقیہ لوگ شہر سے نکال دیئے گئے اور یروشلم کے کھنڈرات میں بھی ان کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ بیت المقدس کو پیوند خاک کر دیا گیا جس سے توریت کا نسخہ جل کر خاکستر ہو گیا۔

چھٹی بربادی:

400ء کے قریب جب کہ رومیوں پر شمال کی طرف سے حملہ آور وحشی قوموں نے غلبہ حاصل کر لیا تو موسویت اور مسیحیت کو تباہ و برباد کر دیا۔ چونکہ یہ اقوام بت پرست تھیں اس وجہ سے جہاں جہاں ان کا غلبہ ہوتا گیا وہاں مکتوبات، صحیفے، مدرسے اور کتب خانے نذر آتش ہوتے گئے اور تمام پرانے مذاہب کی بیخ کنی ہوگئی۔

ساتویں بربادی:

613ء میں شاہ ایران خسرو پرویز نے یروشلم پر چڑھائی کر کے نوے ہزار آدمی قتل کیے۔ تمام گرجوں اور متبرک مکانوں کو پیوند خاک کر دیا (الکتاب کے مقامات المعروف مطبوعہ مرزاپور 1860ء ص 19, 20)

تحریفات اور بگاڑ کی وجوہات:

-1 یہ کسی کو معلوم نہیں کہ سب سے پہلے توریت عتیق کس نے مرتب کی۔

-2 یہ بھی کسی کو معلوم نہیں کہ مرتب کرنے والے کے پاس صحت کا معیار کیا تھا۔

-3 توریت پر کئی بار تباہی نازل ہوئی۔ اس وجہ سے توریت کے نسخوں کا تواتر ختم ہو گیا۔

-4 ہر ایک فرقہ نے اپنے اپنے مفادات اور نظریات کے مطابق توریت میں کمی بیشی کی۔

-5 توریت کی اصل زبان عبرانی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد یہود کی زبان آرامی ہوگئی، اس تبدیلی زبان سے توریت میں تحریف لازمی تھی۔

-6 موجودہ عبرانی رسم الخط سے پہلے عبرانی حروف کے ہجا کا رسم الخط اور تھا۔ اس میں حروف کے رسم الخط میں تشابہ زیادہ تھا۔ مثلاً ط اور

ع قریباً قریباً ایک ہی طرح لکھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے ضروری تھا کہ توریت میں اختلاف رونما ہوتا۔

-7 عیسائی علماء کا یہ خیال ہے کہ بائبل کے مصنفین کے دو گروہ تھے ایک کا نام جہو سٹک اور دوسرے کا نام ایلوہسٹک تھا یعنی ایک خدا کا نام یہودہ افضل ماننے والے اور دوسرے خدا کا نام ایلوہ مقدس ماننے والے۔ دونوں کی الگ الگ تصنیفات کو چھٹی صدی عیسوی میں اکٹھا کر دیا گیا۔

-9 حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد سے بنی اسرائیل کو نفرت، دشمنی اور رقابت تھی۔ اس وجہ سے اسماعیل اور ان کی اولاد کے بارے میں حقارت آمیز جملے توریت میں ایزاد کر دیئے گئے۔

اندرونی شہادت:

بائبل کی اندرونی شہادت بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ بائبل اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہے۔

سترہ کتب ایسی ہیں جو کسی زمانے میں موجود تھیں لیکن اب ناپید ہیں مگر ان کے حوالہ جات عہد نامہ عتیق میں موجود ہیں چنانچہ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

	نام کتب گم شدہ	حوالہ جات عہد نامہ عتیق موجودہ
-1	کتاب عہد نامہ موسیٰ	خروج باب 24 آیت 7
-2	جنگ نامہ خداوند	گنتی باب 21 آیت 14
-3	کتاب یشیر (الیاشر)	یشوع باب 10 آیت 13، سموئیل دوم باب 1 آیت 18
-4	کتاب یاہو بن حنانی	تواریخ دوم باب 20 آیت 34
-5	کتاب سمعیاہ نبی	تواریخ دوم باب 13 آیت 15
-6	کتاب اخیاہ نبی	تواریخ دوم باب 9 آیت 29
-7	کتاب ناتن نبی	تواریخ دوم باب 9 آیت 29
-8	کتاب مشاہدات عیدو غیب بین	تواریخ دوم باب 9 آیت 29
-9	کتاب اعمال سلیمان	سلاطین اول باب 11 آیت 41
-10	کتاب مشاہدات یسعیاہ بن اموس	تواریخ دوم باب 26 آیت 22
-11	کتاب مشاہدات یسعیاہ بن اموس	تواریخ دوم باب 32 آیت 32
-12	سموایل غیب بین کی تواریخ	تواریخ اول باب 29 آیت 29, 30
-13	نغمات سلیمان ایک ہزار پانچ	سلاطین اول باب 4 آیت 32, 33
-14	سلیمان کی کتاب خواص نباتات و حیوانات	سلاطین اول باب 4 آیت 32, 33
-15	کتاب امثال سلیمان (یہ تین ہزار امثال سلاطین اول باب 4 آیت 32 اس سے مختلف ہیں جو موجودہ عتیق میں درج ہیں)	
-16	جاد غیب بین کی تواریخ	تواریخ اول باب 29 آیت 29
-17	مرثیہ یرمیاہ (یہ مرثیہ اس نوحہ یرمیاہ سے تواریخ دوم باب 35 آیت 25 مختلف ہے جو بائبل میں درج ہے۔ بقول بشپ پیٹرک یہ	

مرثیہ اب گم ہے)

عہد نامہ عتیق میں ایسی کتب بھی داخل کردی گئی تھیں جن کو جعلی قرار دیا گیا ہے اور بائبل سے خارج کردی گئی ہیں۔ یہ سب کتب عہد عتیق کے یونانی ترجمہ سیپوا اجنٹ یعنی سبعیہ میں جو 284 برس قبل مسیح تیار ہوا تھا موجود ہیں اور یونانی اور رومی کلیسا کے نزدیک مقدس ہیں اور بعض کی اب تک تلاوت کی جاتی ہے لیکن پروٹسٹنٹ کلیسا نے ان کو عہد عتیق سے خارج کردیا ہے۔ علماء یورپ اب ان کی تاریخی اہمیت تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو برس قبل کے تاریخی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

بعض واقعات تو ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بزرگ آذر سے مناظرہ جو سورۃ انعام میں مذکور ہے توریت کی کتاب و پیدائش میں اس کا کہیں ذکر نہیں لیکن یہ مناظرہ کتاب جوبلی کی آیت 13 میں درج ہے جو جعلی قرار دے کر عہد نامہ عتیق سے خارج کردی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر بیٹھ کر صرف دو الواح (احکام عشرہ) کندہ کرلی تھیں (استثناء 4 : 13، 5 : 22 ,5,4,10 11,10:9) ان کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہی الواح خداوند کے صندوق میں محفوظ تھیں مگر صندوق فلسطینی لوگ بنی اسرائیل سے چھین کر لے گئے اور بادشاہ ساول (طالوت) دشمنوں سے چھین کر واپس لایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد مبارک میں وہ صندوق کھولا گیا تو اس میں سے صرف دو الواح نکلی تھیں (سلاطین اول 9:8، تواریخ دوم 5 : 10 عبرانیوں کا خط 9 : 4)

اس کے بعد ان دو الواح کے متعلق بھی کسی کو علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گئیں کیونکہ یہودی قوم پر دشمنوں نے کئی حملے کیے، ان کے ہیکل کو جلا دیا گیا اور یہود کو اسیر بنا کر جلاوطن کردیا گیا۔

ان حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ تو خود توریت لکھی اور نہ لکھوائی۔

توریت کی اس حالت کو دیکھ کر تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ توریت ایک تحریف و تبدل شدہ کتاب ہے جس میں مرور زمانہ سے ایزاد اور اخراج ہوتا رہا۔

چنانچہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

''اگرچہ اسفار موسیٰ خود حضرت موسیٰ کی تصنیف بتائی جاتی ہے لیکن تحقیق جدید کی رو سے ان کے تقریباً اٹھائیس ماخذ تسلیم کیے گئے ہیں (جلد 9)

پادری ڈمیلو کتاب گنتی کی تفسیر میں لکھتا ہے:

''پانچ کتابیں جو اسفار خمسہ موسیٰ سے منسوب ہیں کسی اور شخص نے لکھ کر موسیٰ سے منسوب کیں۔

عہد نامہ عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزام لگائے گئے ہیں جن کا مطالعہ مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز باتیں پڑھ کر ایک عامی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ باتیں اللہ کی کہی ہوئی نہیں بلکہ انسانوں کی اختراع ہیں۔

جب عہد نامہ عتیق کی یہ تاریخی حیثیت ہے تو یہودیت کیوں کر انسانیت کا مذہب کہلا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جب توریت کی تعلیمات پر نظر دوڑائی جائے تو وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی نظر نہیں آتی۔

الٰہیات کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ توریت میں اس کا نام ونشان نہیں۔ توریت میں توحید کے باریک مراتب کا کہیں ذکر نہیں۔ توریت میں بہشت اور دوزخ کا کہیں مفصل ذکر نہیں کہیں اشارات سے مل جائیں تو مل جائیں جس سے بہشت اور دوزخ کی ماہیت اور

کیفیت ظاہر نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کا توریت میں کہیں ذکر نہیں نہ توریت میں خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے یہ ہے گویا توریت کی روحانی اور مادی تعلیمات کا نقشہ۔ لہٰذا یہ واضح ہو جاتا ہے کہ توریت نہ تو انسان کی روحانی ضروریات کو پورا کرتی ہے اور نہ مادی کو۔

عیسائیت

عیسائیت کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ، ابتدائی عمر، تبلیغ اور مصلوب کیے جانے کے صحیح اور مستند واقعات کا علم نہ تو یہودیوں کی کتب سے ہوتا ہے نہ ہی اس زمانہ کی بت پرست اقوام کے نوشتے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔
مشہور مورخ فیرر (Farar) اپنی کتاب لائف آف کرائسٹ (Life of Christ) میں یہودی مؤرخ جوزیفس (Josephus)[1] کے متعلق لکھتا ہے "جوزیفس ایک منکر دین اور چاپلوس قسم کا آدمی تھا اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا اس کا عیسائیت کے متعلق جان بوجھ کر چپ رہنا ایمانداری سے بہت بعید ہے اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے حالات کے لیے ہمیں مجبوراً عیسائیت کی مذہبی کتابوں انجیلوں، اعمال ناموں اور خطوط پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں پولوس کے خطوط (جو کہ عہد نامہ جدید کا حصہ ہیں) عیسائیت کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی پردہ کتمان میں ہونے کی وجہ سے بعض مورخین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہستی سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی محقق ڈوپواے (Dupuis) نے اپنی تصنیف ابتدا مذہب (Origin of Cults) میں لکھا ہے کہ "دنیا میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے ہیں ان سب کی بنیاد علم ہیئت کے قصوں پر ہے جن میں سورج اور آسمانی بادشاہت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی دیوکا مر کر زندہ ہونا بھی دکھایا جاتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ جب فصل خزاں آتی ہے تو آفتاب کو زوال ہوتا ہے اور اس کی حرارت بھی کم ہو جاتی ہے اس حالت کو قدیم لوگوں نے سورج دیوتا کے مرنے سے تعبیر کیا ہے پھر جب فصل بہار آتی ہے تو آفتاب مائل بہ عروج ہوتا ہے اور اس کو سورج دیوتا کا احیاء ثانیہ سمجھا گیا۔ گویا "مرنا" اور دوبارہ زندہ ہونا تداخل فصلین سے عبارت ہے"۔
پروفیسر مذکور نے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ یسوع ناصری کا وجود فی الخارج تھا ہی نہیں بلکہ اس سے مراد صرف آفتاب ہے جو دوشیزہ بہار (کنواری مریم) کے بطن سے پیدا ہوتا ہے فصل خزاں کا پلاطس (رومی گورنر) اسے گرفتار کر کے مصلوب کر دیتا ہے (یعنی سردیوں کا موسم آ جاتا ہے اور تمام عالم ٹھٹھر کر بے جان ہو جاتا ہے پھر وہ کچھ دنوں کے بعد مائل بہ عروج ہوتا ہے جسے احیاء ثانیہ کہنا چاہیے۔
1835ء میں جرمنی کے ایک مشہور مذہبی عالم ڈاکٹر سٹراس (Strass) نے اپنی کتاب سیرۃ المسیح (Life of Jesus) میں یہ ثابت کیا ہے کہ اناجیل میں جو سوانح یسوع کے درج ہیں وہ تمام تر اصنام پرستوں کے مذہبی خرافات سے ماخوذ ہیں۔
تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو بی اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (Ecoedeus) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ اسی طرح جرمن پروفیسر ڈریوز (Drews) فرانسیسی، ڈاکٹر کوچو (Couchow) پراسپر الفاریق Prosper Alfaric و ٹوریس

---

[1] شروع عیسوی کا ایک مشہور مورخ تھا جس کی کتاب (History of the Jewish war and antiquities of the Jews) نے مائبل کی تاریخ کے متعلق کافی مواد بہم پہنچاتی ہے۔

ماشیورو (Vittoris machioro) وغیرہ محققین نے یسوع مسیح کی ہستی کو محض ایک فرضی ہستی قرار دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے مختلف نظریات پیدا ہوئے ہیں۔ یہود کہتے ہیں کہ پلاطوس کے حکم سے عیسیٰ علیہ السلام کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ ان کے عقیدہ کے مطابق جو کاٹھ پر مرتا ہے وہ لعنتی ہوتا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ ان کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ دفن کے تیسرے دن زندہ ہوئے اور آسمان پر چڑھے۔ اب وہ اپنے باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی صلیبی موت عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

کثیر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا اور صلیب دیئے جانے سے آپ بچ گئے۔

موجودہ دور میں یورپ کے بعض مورخین کی تحقیق کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیبی موت سے بچ نکلے۔ پھر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو پیغام حق پہنچانے کے لیے وطن سے ہجرت کر کے کشمیر میں آ گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی تحقیق کی رو سے سرحد اور کشمیر کے لوگ بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سفر میں ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام بھی ساتھ تھیں۔

اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی تاریخ کا ایک متنازعہ باب بنی ہوئی ہے۔ ایک متنازعہ شخصیت انسانیت کی کامل رہبر کیسے بن سکتی ہے۔ اب آیئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب انجیل کے متعلق تاریخی لحاظ سے بحث کرتے ہیں کہ وہ کہاں تک ہمارے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔

عہد نامہ جدید کی سرگزشت

بائبل کے دو حصے:

بائبل عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہود صرف عہد نامہ عتیق کو خدا کا کلام مانتے ہیں۔ عیسائی عہد نامہ عتیق کو منسوخ اور عہد نامہ جدید کو ناسخ مانتے ہیں۔ عہد نامہ جدید میں لکھا ہے: ''چنانچہ اپنا جسم دے کر دین یعنی شریعت کے حکموں اور رسموں کو کھو دیا۔ [1] ''اس نے نیا کیا تو پہلے کو پرانا ٹھہرایا۔ پر وہ جو پرانا اور ادنیٰ ہے سو مٹنے کے قریب ہے۔'' [2] ''اس نے تمہارے سب گناہ بخش دیئے اور حکموں کا نوشتہ جو ہمارا مخالف تھا ہماری بابت مٹا ڈالا'' [3] ''شریعت کی رو سے راستباز بننا چاہتے ہو تو مسیح سے جدا ہوئے تم فضل کی نظر سے گرے۔'' [4]

عیسائیوں کے خیال میں عہد نامہ عتیق شریعت کا عہد ہے یعنی اس عہد میں لوگ شریعت پر عمل کریں اور نجات حاصل کریں۔ عہد نامہ جدید فضل اور کفارہ کا عہد ہے کہ لوگ شریعت کو لعنت سمجھ کر مسیح کو لوگوں کے گناہوں کے فدیہ میں مصلوب سمجھیں اور نجات پائیں۔

انجیل کا اصل نام:

انجیل یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی یونانی شکل ایونجلیون (Evangelion) ہے۔ اصل زبان میں اس کا مفہوم ہے:

---

[1] افیسوں 3 : 15 [2] عبرانیوں 13:8

[3] نامہ گلتیوں 14:2 [4] نامہ گلتیوں 14:5

''وہ انعام جو خوش خبری پر عطا کیا جاتا ہے۔'' حضرت مسیح علیہ السلام کی مادری زبان ارامی تھی نہ کہ یونانی۔ ارامی زبان سامی ہونے کی وجہ سے عبری اور عربی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ یونانی آرین سلسلہ کی زبان ہے اور بہت مختلف ہے۔ اس لیے مسیح کے پیغام کا ابتدائی نام انجیل نہ ہوگا۔ بشیرہ یا بشری ہو سکتا ہے۔ عہد نامہ عتیق میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔ [1]

انجیل کا نام، اس کی تدوین اور ترتیب:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد کوئی ایسی لکھی ہوئی کتاب چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ جس کی حواری اشاعت کرتے۔ عہد نامہ جدید میں لفظ انجیل استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ اس سے مراد خوش خبری ہے نہ کہ کتاب۔ [2]

اب نئے ترجموں میں ان تمام حوالہ جات میں انجیل کی بجائے خوشخبری ترجمہ کیا گیا ہے۔

لفظ انجیل کتاب کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام سے 150 سال بعد استعمال ہونے لگا۔ انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

"Thus was not till the middle of the second century that the word came to signify a book and even after that till the end of the 2nd century it continued to bear its original meaning as well." [3]

چنانچہ دوسری صدی کے وسط تک اس لفظ نے ''کتاب'' کے معنی اختیار کر لیے اور اس کے بعد دوسری صدی کے اختتام تک اپنے انہی اصل معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد جعل سازی:

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ہی جعل سازی، فریب کاری اور جعلی تصانیف کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ پولوس کے تھسلنیکیون کے نام دوسرے خط کے باب 2 آیت 2 میں ہے کہ ''تم اس خیال سے کہ مسیح کا دن آپہنچا ہے جلد اپنے دل کی ڈھارس مت کھوؤ اور نہ گھبراؤ۔ نہ کسی روح، نہ کسی کلام، نہ کسی خط سے یہ سوچ کر کہ وہ ہماری طرف سے ہے کوئی تمہیں کسی طرف سے فریب نہ دے۔''

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ پولوس کے زمانہ میں ہی جعلی خطوط کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا بلکہ 2 کرنتھیوں کے باب 11 آیت 14,13 میں اس امر کی شہادت پائی جاتی ہے کہ پولوس کے زمانہ سے جھوٹے مدعیان رسالت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسکاٹ صاحب نے رومن تفسیر مطبوعہ الہ آباد 1866ء کے صفحہ 186 پر لکھا ہے:

''نہ صرف جعلی مصنف بلکہ مسیح ہونے کا بہتوں نے دعویٰ کیا تھا۔ چنانچہ یوسف مورخ کتنوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ یوں لکھتا ہے کہ ملک جادوگروں اور دغابازوں سے بھر گیا۔ جنہوں نے بہتوں کو ورغلایا اور بیابان میں لے گئے تاکہ اپنی کراماتیں دکھلائیں۔ ان میں سے دوستیھیوس سامری کا ذکر ہے جس نے اپنے آپ کو مسیح کہا اور شمعون مجوسی جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور ٹوس جس نے بہت لوگوں کو دھوکا دے کر کہا کہ میں یرون ندی کو دو حصہ کر کے بیچ میں راستہ بنا دوں گا۔ القصہ چوبیس شخصوں کا ذکر ہے جنہوں نے اور دین قیصر کے وقت سے

---

1. سموئیل دوم 4 :10 اور 20:18 تا 27 اور لفظ بشورہ
اس کے مشتقات اسی معنی میں سموئیل اول 9:31 یسعیاہ 27:41 اور یرمیاہ 15:2 وغیرہ میں بارہا استعمال ہوئے ہیں۔
2. متی 14:1, 33:4, 11 5 مرقس 15:1, 16 الوقا 2, 10, 12 اور اداتا 16, 16 ۔
3. انسائیکلو پیڈیا ببلیکا صفحہ 1889 ۔

لے کر 1682ء تک مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔"

جعلی تصنیفات:

جھوٹے مدعیان رسالت کے علاوہ دیندار عیسائیوں نے دین کے معاملات میں کذب بیانی کا شیوہ اختیار کر لیا تھا۔ اس بات کی تائید پولوس کی تحریر سے ملتی ہے۔ انہوں نے ایک خط رومیوں کو بھیجا تھا اور جو مجموعہ عہد جدید میں شامل ہے اس کے باب 3 آیت 8,7 میں لکھا ہے:

"پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی نکلے۔ چنانچہ یہ تہمت ہم پر لگائی بھی جاتی ہے۔"

دوسری صدی عیسوی کے ذکر میں رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور 1856ء کے صفحہ 90 پر ذیل کی عبارت درج ہے:

دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جاوے تو انہیں کے بحث کا طور اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں اور آخر کار اُرجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقہ مذکور تسلیم ہوا۔ اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی اور نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی۔ لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا۔ پھر اسی سبب سے بعضے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں۔ اس طرح سے کہ جب فیلسوف لوگ کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کر کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلے سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں، اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں۔ سو اسی طرح مسیحی جو فیلسوفوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھ کر کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا۔ یہ بات بہت ہی خلاف حق اور شدید قابل الزام تھی۔"

ہارن صاحب اپنی تفسیر کی دوسری جلد کے صفحہ 331 پر لکھتے ہیں:

"بلاشبہ بعض خرابیاں (یعنی تحریفیں) جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو کہ دیندار مشہور تھے اور اس کے بعد انہی خرابیوں کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے پر نہ آنے دیں۔"

عیسائی مصنفین کے نزدیک جعلی تصنیفات کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

1- عیسائیوں کے ہر فرقہ نے اپنے مسلک کی تائید میں کسی حواری یا خادم حواری یا کسی بڑے شخص کے نام پر کتب لکھ کر شائع کر دیں۔
2- جعلی مسیح اور جھوٹے مدعیان رسالت کی کثرت جعلی تصانیف میں اضافہ کا باعث ہوتی رہی۔
3- دیندار لوگوں نے بھی دین کے معاملات میں جھوٹ بولنا جائز سمجھ لیا۔ اس بات کا اعتراف پولوس کو بھی ہے۔

ترتیب و تدوین کا نرالا طریقہ:

جب مسیح فرقوں کے اصولی اختلاف اور انتشار کی وجہ سے جعلی اناجیل نویسی کا رواج عام ہو گیا تو 325ھ میں قسطنطین اعظم نے 300 پادریوں کی ایک کونسل بلائی تاکہ وہ اصل انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح عقائد کا فیصلہ کرے۔ چنانچہ انہوں نے تاریخی اور عقلی دلائل کی روشنی میں اصل انجیل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے صحیح عقائد کی تدوین کی بجائے ایک عجیب اور نرالا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ "کونسل میں جو اناجیل پیش کی گئی تھیں انہوں نے ان کو ایک بے ترتیب ڈھیر کی طرح گرجا کے اندر عشاء ربانی کی میز کے نیچے رکھ دیا اور خداوند سے

درخواست کی کہ ان میں سے الہامی نوشتے پھلانگ کر میز پر آ جائیں اور جعلی نسخے میز کے نیچے پڑے رہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آ گیا۔"[1]

چنانچہ قسطنطین اعظم نے چار اناجیل کے علاوہ باقی سینکڑوں نسخوں کو جعلی قرار دے کر جلا دینے کا حکم دے دیا بلکہ یہاں تک حکم دے دیا کہ جو شخص ایسی تحریر چھپا رکھے گا، یا جلا نہ دے گا، یا بادشاہ کی خدمت میں پیش نہ کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس طرح سینکڑوں نسخے جلا دیئے گئے۔

موشیم چرچ ہسٹری میں لکھا ہے:

"یہ احکام اس قدر ظالمانہ اور نامعقول تھے کہ بعد میں خود بادشاہ کو پچھتانا اور پشیمان ہونا پڑا۔ اس کونسل میں ایریس (Areis) فرقہ کے متعلق بادشاہ نے ان کی تحریرات جلا دینے اور ان کو جلاوطن کر دینے کا حکم دیا۔ مگر اس کے چند سال بعد 320ء میں جب بادشاہ کی بہن نے اپنے بستر مرگ پر کہا کہ ایریس کے خلاف فیصلہ ظالمانہ تھا اور یہ فیصلہ اس کے دشمنوں کے تعصب کی وجہ سے ہوا نہ کہ صداقت کی بناء پر۔ اس پر شہنشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ مگر یہ حکم پہنچنے سے پہلے ایریس فوت ہو چکا تھا۔"[2]

عہد جدید کی مشمولہ کتب:

عہدنامہ جدید میں ستائیس کتابیں شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

1- متی کی انجیل۔ 2- مرقس کی انجیل 3- لوقا کی انجیل 4- یوحنا کی انجیل 5- رسولوں کے اعمال۔
6- پولس رسول کا خط رومیوں کو۔ 7- پولس رسول کا پہلا خط کرنتھیوں (قرنتیوں) کو۔
8- پولس رسول کا دوسرا خط قرنتیوں کو۔ 9- پولس رسول کا خط گلتیوں کو۔ 10- پولس رسول کا خط افسیوں کو۔
11- پولس رسول کا خط فلپیوں کو۔ 12- پولس رسول کا خط قلسیوں کو۔ 13- پولس رسول کا خط تھسلنیکیوں کو
14- پولس رسول کا دوسرا خط تھسلنیکیوں (تسلونیقیوں) 15- پولس رسول کا پہلا خط تمطاؤس کو۔
16- پولس رسول کا دوسرا خط تمطاؤس کو۔ 17- پولس رسول کا خط ططس کو۔ 18- پولس رسول کا خط فلیموں کو۔
19- عبرانیوں کو خط۔ 20- یعقوب کا خط 21- پطرس کا پہلا خط۔ 22- پطرس کا دوسرا خط 23 تا 27- یوحنا فقیہ کے 3 خطوط و مکاشفات اور یہوداہ کا ایک خط۔

اس منتخب مجموعہ کو پوپ گلاسیوس (492ء تا غایت 496ء) نے باضابطہ طور پر سند قبول عطا کی اور عیسائیوں میں آج تک یہی مجموعہ مروج ہے۔

کتب غیر مشمولہ:

عیسائی مفسرین و مصنفین کی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک سو اٹھاون (158) کتابیں ایسی ہیں جو کسی زمانہ میں معتبر اور مقدس سمجھی جاتی تھیں مگر اب وہ محققین کے نزدیک جعلی اور مجموعہ عہد جدید سے خارج ہیں۔ ان کتب کے نام معلوم کرنے کے لیے حسب ذیل کتب کی طرف رجوع کیا جائے:

1- انٹروڈکشن علوم بائبل از ہارن صاحب مطبوعہ لندن 1825ء جلد 1 -

---

1. دیباچہ صفحہ ۱۳ The Apocryphal New Testament
2. ص ۱۲۶، باب ۲، ۷ فصل ۵۔

-2 ورکس از لارڈ نر صاحب مطبوعہ لندن 1829ء جلد 4۔

-3 جارج سیل کی تحریریں مطبوعہ لندن 1861ء۔

-4 یکسیومو اور ڈیپو کریفل نیوٹسٹمنٹ مطبوعہ لندن 1820۔

-5 اخبار نور افشاں لودھیانہ کی اشاعت 27 جولائی 876ء کے صفحہ 236 پر پادری ویری کا مضمون۔

ہارن صاحب نے اپنی کتاب جلد 1 کے صفحہ 642 پر لکھا ہے کہ کتب غیر مشمولہ میں چند ایسی بھی کتب تھیں جن کے متعلق یہ بیان کیا جاتا تھا کہ وہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی لکھی ہوئی تھیں۔ان کے نام یہ ہیں:

1- نامہ بنام آبگارس۔ 2- نامہ بنام پطرو پال۔ 3- کتاب تمثیلوں اور وعظ کی۔ 4- کتاب مناجات مسیح
5- کتاب سحر 6- کتاب پیدائش مسیح و مریم 7- نامے جو آسمان سے گرے 8- نامہ حضرت مسیح جو منی کیس نے پیدا کیا۔

رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزا پور 1856ء جلد 2 کے صفحہ 36 پر لکھا ہوا ہے کہ 300ء میں مورخ یوسی بیس Eusi Bius نے شہر اویسہ کے شاہی دفتر میں وہ خط پائے۔جن میں سے ایک خط ابگرس بادشاہ کی طرف سے مسیح کے نام تھا۔جس میں اس نے ایک شدید مرض میں اپنے مبتلا ہونے کا حال لکھ کر مسیح سے درخواست کی تھی کہ اسے تندرست کر دے اور دوسرا خط مسیح کی طرف سے بادشاہ کے خط کا جواب تھا۔ مسیح کا یہ خط بھی مروجہ کتب عہد جدید میں شامل نہیں۔

اخبار نور افشاں مورخہ 9 جولائی 1874ء جلد 2 نمبر 28 صفحہ 123 کالم 3 میں پادری ویری لکھتا ہے:

''جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے وہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ان کو بعض بدعتیوں نے مروج کرنا چاہا مگر وہ اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

کتب عہد جدید پر تبصرہ

کتب مشمولہ عہد جدید مورخ یوسی بیس کے قول کے مطابق تین اقسام میں منقسم ہیں۔ایک وہ جن کی صحت اور معتبر ہونے پر سب کو اتفاق ہے،اس میں حسب ذیل کتب شامل ہیں:

اناجیل اربعہ۔رسولوں کے اعمال۔پولوس کے چودہ خط۔پطرس کا پہلا خط۔یوحنا کا پہلا خط۔یہ سب 21 کتب ہوئیں۔جن کی صحت پر عیسائیوں کا اتفاق ہے۔یوسی بیس مکاشفات کی کتاب بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔

دوسری قسم کے بارے میں یوسی بیس کہتا ہے کہ بعض ان کی صحت اور معتبر ہونے کے قائل ہیں اور بعض اس کی صحت میں شک کرتے ہیں اور صحت کے معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔اس میں یہ کتب شامل کی گئی ہیں یعقوب کا خط۔یہوداہ کا خط۔پطرس کا دوسرا خط اور تیسرا خط۔

تیسری قسم کی کتب کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ غیر معتبر ہیں۔لیکن یوسی بیس کو یہ اخلاقی جرأت نہ ہوئی کہ مشمولہ کتب عہد جدید میں سے کسی کا نام داخل کرے لیکن مفتاح الکتاب کے مصنف نے لکھا ہے کہ بعض نے اس نوع کی کتابوں میں اس خط کو جو عبرانیوں کے نام ہے اور یوحنا کے مکاشفات کو شامل کیا ہے۔بہر حال مشکوک کتب سات ہیں،ان کے نام حسب ذیل ہیں:

1- یعقوب کا خط 2- یہوداہ کا خط 3- پطرس کا دوسرا خط 4- یوحنا کا دوسرا خط 5- یوحنا کا تیسرا خط
6- عبرانیوں کا خط 7- مکاشفات یوحنا۔
اب ہم ان کتب پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

انجیل متی:

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق متی کی انجیل سب سے پرانی ہے۔ یہ انجیل اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لارڈنر نے اوریجن کے تین اقوال اپنی کتاب میں لکھے ہیں، جن سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ انجیل عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ یوسی بیس اور اتینا سیس اور سرل اور جروم سب اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ ہارن صاحب نے اپنی تفسیر میں تیئس (23) علماء کے نام تحریر کیے ہیں جو اس امر کے قائل تھے کہ متی کی انجیل دراصل عبرانی زبان میں تھی۔

ریو صاحب اپنی تاریخ انجیل میں لکھتے ہیں:

''یہ بات غلط ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ متی نے انجیل یونانی میں لکھی تھی کیونکہ یوسی بیس اور بہت سے عیسائی علماء نے لکھا ہے کہ متی نے انجیل عبرانی میں لکھی ہے نہ کہ یونانی میں''۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد 19 میں ہے:

''عہد جدید کی سب کتابیں یونانی میں لکھی گئیں سوائے انجیل متی کے اور نامہ عبرانیاں جن کا عبرانی زبان میں لکھا جانا بہ دلائل متیقن ہے۔

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ جس حصہ کا مولف حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

عہد تالیف کے متعلق عام نظریہ یہ ہے کہ یہ 61ء اور 65ء کے درمیان میں تالیف ہوئی۔ لیکن پروفیسر ہارن کی تحقیق کے مطابق اس کا زمانہ تالیف 80ء اور 100ء کے درمیان ہے۔ اس انجیل کا زمانہ تالیف 61ء ہو یا 100ء تاریخ میں اس انجیل کا نشان 173ء سے پہلے نہیں ملتا۔

انجیل مرقس:

بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ سب سے قدیم انجیل مرقس کی انجیل ہے جس کا ذکر یوسی بیس (المتوفی 340ء) نے اپنی تاریخ کلیسا میں کیا ہے۔ یوسی بیس لکھتا ہے کہ مرقس ایک یہودی الاصل یونانی تھا۔ پہلے پال اور برنباس کا رفیق تھا اور پھر ان سے علیحدہ ہو کر پطرس حواری کی خدمت میں رہنے لگا۔ لیکن 63ء میں قیصر نیرو نے جب پطرس کو عیسائیوں کے قتل عام میں شہید کر ڈالا تو مرقس نے اس حادثہ کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی سیرت لکھی۔

اسکاٹ صاحب اپنی رومن تفسیر کے صفحہ 240 پر لکھتے ہیں:

''یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا، مگر گمان غالب ہے کہ اس کی تصنیف 56 اور 62ء کے درمیان ہوئی۔ سب متفق طور پر کہتے ہیں کہ شہر روم میں اس کی تصنیف ہوئی۔''

عیسائی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرقس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی صحبت سے فیض حاصل نہیں کیا، بلکہ پطرس کی تبلیغی مساعی

سے عیسائیت قبول کی۔ اس نے جو تعلیم پطرس سے حاصل کی اسے رومی یعنی لاطینی زبان میں لکھ کر شہر روم میں اس نے اپنی انجیل کو شائع کیا۔ لاطینی زبان والی انجیل مرقس ضائع ہو چکی ہے اور اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔

سینٹ ارینوس 178ء میں لکھتے ہیں کہ "پطرس کے مرید اور مترجم مرقس نے بعد موت پطرس وہ چیزیں جو پطرس نے وعظ کی تھیں لکھ کر دیں"۔

یونانی ترجموں میں غلطیوں کے ہونے کا بھی عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے۔ چنانچہ وارڈ صاحب اپنے اغلاط نامہ میں لکھتے ہیں کہ بقول جروم کے علماء متقدمین کو اس انجیل کے آخری باب کی صحت میں شبہ تھا۔ مرقس باب 2 آیت 26 میں جو لفظ ابیاتھر آیا ہے اس کی بابت یہی وارڈ صاحب اپنی کتاب کے صفحہ 36 پر لکھتے ہیں "مسٹر جوئیل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مرقس نے غلطی سے اخیملک کی جگہ ابیاتھر لکھا ہے اور متی نے غلطی سے زکریا کی جگہ یرمیاہ لکھا ہے۔"

انجیل لوقا:

لوقا انطاکیہ کا رہنے والا ایک طبیب اور غیر یہودی مورخ تھا۔ اس سے دو کتب منسوب ہیں، ایک انجیل لوقا، دوسری رسولوں کے اعمال، بقول مصنف مفتاح الکتاب لوقا نے انجیل 63ء کے قریب اور اعمال 64ء کے قریب لکھے۔

لوقا مسیح کے حواریوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے خود ہی اپنی انجیل کی تمہید میں لکھا ہے کہ جنہوں نے مسیح کو دیکھا اور مسیح کی خدمت کی تھی اُن سے پوچھ کر میں نے لکھا ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

لوقا حضرت مسیح علیہ السلام کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہوا۔

اس کی انجیل کے ماخذ ان لوگوں کے اقوال ہیں جنہوں نے مسیح کی خدمت کی۔

عیسائی علماء لوقا کو پولوس کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔ اُردو تاریخ کلیسا مجموعہ 1870ء کے صفحہ 24 پر ہے:

"اور جب پولوس شہر تروآس میں گیا جو بحر روم کے ساحل پر واقع ہے تو یہاں اس سے اور لوقا سے ملاقات ہوئی اور اس وقت سے برابر لوقا پولوس کے ساتھ رہا۔"

پھر اسی صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:

"یہ اس کی عبارت سے ظاہر ہے کیونکہ وہ اس کے بعد اعمال الرسل کے آخر تک صیغہ جمع استعمال میں لاتا ہے۔ لوقا کی انجیل اور اعمال الرسل دونوں اسی کی تصنیف ہیں۔

انجیل لکھنے کی غرض وغایت:

لوقا ایک رومن وزیر کو جس کا نام تھیفلس Theophilus تھا پڑھایا کرتا تھا۔ اسے مخاطب کر کے اپنی انجیل تصنیف کرنے کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"چونکہ بہتوں نے اس پر کمر ہمت باندھی کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے ان کو ہم تک پہنچایا۔ اس لیے اَے تھیفلس میں نے مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں تا کہ جن باتوں کی تو نے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی تمہیں معلوم ہو جائے۔ (لوقا 1:1)

انجیل یوحنا:

یہ انجیل تینوں اناجیل سے اپنے مضامین اور طرز ادا کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں یونان کے فلسفہ الٰہیات کی چاشنی موجود ہے۔ خاص طور پر یہودی فلسفی فائلو (Philo) کے فلسفیانہ خیالات کی آمیزش بہت ہے۔ جس کی بہترین مثال اس انجیل کا ابتدائی فقرہ ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلام بتلایا گیا ہے:

''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔''

بعض عیسائی علماء اسے حواری یوحنا کی طرف منسوب کرتے ہیں جو تاریخی لحاظ سے غلط ہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ جو دو سگے بھائی یوحنا اور جیمس پسران زبیدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے پاپیاس کی روایت کے مطابق یہود نے دونوں کو 60ء اور 70ء کے مابین شہید کر ڈالا تھا۔

اس انجیل کا مؤلف اور جامع ایک دوسرا یوحنا ہے جو افیوس واقع ایشیاء کوچک کا رہنے والا تھا اور پہلی صدی کے آخر میں گزرا ہے۔ مکاشفات یوحنا کا بھی یہی مصنف ہے۔ اس انجیل کے سن تالیف میں اختلاف ہے۔ اس کی تاریخ 68ء سے لے کر 100ء تک بیان کی جاتی ہے اور مکاشفات کی تاریخ تصنیف 95ء، 96ء اور 97ء بیان کی جاتی ہے۔

انجیل برناباس:

برناباس مسیح کے حواریوں میں سے ایک ممتاز حواری تھا۔ اس نے اور پولوس نے اکٹھے مختلف ممالک میں تبلیغی دورے کیے۔ مرقس بھی ان کے ہمراہ بطور ترجمان کے جایا کرتا تھا۔ مسیح کی تعلیم کے بارے میں پولوس اور برناباس میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ نظریاتی اختلاف کی وجہ سے برناباس اور مرقس اس سے علیحدہ ہو کر جزیرہ سائپرس کو چلے گئے۔ جو برناباس کا وطن تھا۔ برناباس نے وہیں وفات پائی اور دفن ہوا۔

برناباس نے ایک انجیل لکھی تھی جس کو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد 478ء میں برناباس کی قبر کھولی گئی تو یہ انجیل اس کی چھاتی پر رکھی ہوئی پائی گئی۔ اٹھارہ سال تک یہ انجیل گرجاؤں میں پڑھی جاتی رہی پھر 496ء میں پادریوں کی ایک کونسل نے اس انجیل کا پڑھنا ممنوع اور ناجائز قرار دیا۔ پوپ اسکٹس پنجم Pope sixtus کے کتب خانہ میں یہ انجیل دیگر ممنوعہ کتب کے ساتھ بند ہوگئی اور تقریباً ایک ہزار سال اسی حالت میں پڑی رہی۔

ایک عیسائی راہب فرامارینو Framarino بیان کرتا ہے کہ اتفاقاً کچھ پرانا مذہبی لٹریچر اس کے ہاتھ آ گیا۔ ان میں سے ایک ایسا رسالہ تھا جس میں پولوس کی بیان کردہ تعلیم پر سخت محاسبہ کیا تھا اور برناباس کی انجیل کو بطور سند کے پیش کیا گیا تھا۔ راہب عیسائی کے دل میں یہ شوق موجزن ہوا کہ اگر کہیں سے یہ انجیل دست یاب ہو جائے تو اس کا مطالعہ کرے۔ کچھ عرصہ بعد یہ راہب پوپ صاحب کے مقربین میں شامل ہوگیا۔ ایک دن وہ پوپ صاحب کی ملاقات کے لیے گیا تو پوپ صاحب کے سیکرٹری نے اسے لائبریری میں بٹھا دیا۔ فرامارینو Framarino بیان کرتا ہے کہ میں لائبریری میں اکیلا بیٹھا پوپ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنی دیر میں کتب ہی دیکھ لوں۔ سب سے پہلے جو کتاب ہاتھ میں آئی وہ یہی برناباس کی انجیل تھی۔ راہب بیان کرتا ہے کہ اس پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے فوراً اس انجیل کو چغے کے نیچے چھپا کر بغل میں دبا لیا پھر جلدی سے پوپ صاحب سے رخصت حاصل کر کے چلا گیا۔

انجیل کی دریافت:

1709ء میں شاہ پروشیا کے ایک مشیر کریمر کو ایمسٹرڈم کے مقام پر کسی کتب خانہ سے برناباس کی انجیل ہاتھ لگی۔ اس وقت تک صرف اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ کریمر نے یہ اطالوی نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی صاحب حیثیت سے حاصل کیا تھا۔ کریمر نے یہ نسخہ شہزادہ آیوجین سافوی کو تحفہ کے طور پر دے دیا۔ اس کے بعد 1738ء میں آسٹریا کے دارالسلطنت وائنا کے شاہی کتب خانہ میں منتقل ہوگیا اور آج تک وہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہڈلی کے مقام پر ڈاکٹر ہلمن کو انجیل برناباس کا ایک نسخہ ملا جو ہسپانوی زبان میں تھا۔ یہی نسخہ جارج سیل کو ملا۔ جارج سیل نے اس نسخے پر جو نوٹ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت ہسپانوی نسخہ، اطالوی نسخہ کا ترجمہ ہے جو کسی اُرغانی مسلمان مصطفیٰ حرندی نے کیا ہے۔ مصطفیٰ ہی نے اس کے آغاز میں ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں اطالوی نسخے کی دریافت کا پورا حال تحریر کیا ہے۔

1907ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ''ڈاکٹر منک ہاؤس'' نے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا پھر انگریزی کے ترجمہ سے مصر کے مشہور عیسائی عالم ڈاکٹر خلیل سعادت نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس عربی ترجمہ سے مولوی محمد حلیم صاحب انصاری نے اردو زبان میں ترجمہ کیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

کیا یہ کتابیں الہامی ہیں:

عہد نامہ جدید کے متعلق اندرونی، بیرونی اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ جن کی بنا پر یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتابیں الہامی نہیں بلکہ مصنفین نے خود اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ جیسا کہ ان کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا یہ کتاب انھی مصنفین کی ہیں یا نہیں۔

اندرونی شہادتیں

(الف) مصنفین کا اقرار:

انجیل نویس خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ الہام کے تحت نہیں لکھ رہے بلکہ اپنی طرف سے لکھ رہے ہیں۔ لوقا انجیل نویس ایک رومن وزیر تھیفلس (Theophilius) کو مخاطب کرکے انجیل کے لکھنے کی غرض وغایت بیان کرتا ہے:

چونکہ بہتوں نے اس پر کمر ہمت باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے اُن کو ہم تک پہنچایا۔ اس لیے اے تھیفلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کرکے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں۔ تاکہ جن باتوں کی تو نے تعلیم پائی ہے ان کی پختگی تمھیں معلوم ہوجائے۔'' (لوقا 1 :1)

یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ لوقا نے لوگوں سے دریافت کرکے رومن وزیر کے لیے لکھا۔ پھر لوقا آگے چل کر کتاب ''رسولوں کے اعمال'' میں لکھتا ہے:

''اے تھیفلس! میں نے پہلا رسالہ ان سب باتوں کے بیان میں تصنیف کیا ہے جو یسوع شروع میں کرتا اور سکھاتا تھا''۔

(اعمال 1 : 1)

اسی طرح یوحنا بیان کرتا ہے:

''اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے۔ اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔'' (یوحنا 21 : 25)

یوحنا بھی اپنی انجیل کو یسوع مسیح کی سوانح حیات ہی قرار دیتا ہے۔

اول کرنتھیوں کے باب 7 آیت 12 میں پولوس لکھتا ہے:

''پر باقیوں کو خداوند نہیں میں کہتا ہوں''۔

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ پولوس اپنی طرف سے لکھ رہا ہے۔

پھر اسی باب کی آیت 25 میں لکھتا ہے:

''پر کنواریوں کے حق میں خداوند کا کوئی حکم مجھ پاس نہیں لیکن جیسا دیانتدار ہونے کے لیے مجھ پر خداوند کی طرف سے رحم ہوا، ویسا ہی میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں''۔

دوم کرنتھیون کے باب 8 آیت 8 میں پولوس لکھتا ہے: ''میں کچھ حکم کے طور پر نہیں بلکہ اوروں کرنتھیوں کی سرگرمی کے سبب اور تمہاری محبت کی حقیقت آزمانے کے لیے یہ کہتا ہوں''۔

اس نوع کی عبارتیں اس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ عہد نامہ جدید کا الہام ربانی سے کوئی تعلق نہیں۔ مصنفین نے اپنے طور پر ہی لکھا جو کچھ لکھا۔

(ب) اندرونی اختلافات:

اناجیل میں جو اندرونی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بھی اس امر پر بین شہادت ہیں کہ موجودہ اناجیل انسانی دست برد سے محفوظ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًاo اگر یہ قرآن مجید غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔ (النساء 4 : 82)

1- متی نے اپنی انجیل میں ''یسوع ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ'' کے زیر عنوان کہا ہے کہ ''مریم جس سے یسوع پیدا ہوا اس کا شوہر یوسف یعقوب کا بیٹا تھا۔'' اور اس کا نسب حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان سے ملاتا ہے۔ مگر لوقا نے اپنی انجیل میں یوسف کو عیلی کا بیٹا قرار دیا ہے۔ پھر اس کا سلسلہ نسب حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے ناتن سے ملایا ہے۔

پس متی اور لوقا کے بیان میں سے ایک ضرور غلط ہے۔ ایک شخص یوسف حضرت داؤد علیہ السلام کے دو بیٹوں کی اولاد نہیں ہو سکتا۔

2- یسوع مسیح نے جب اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو متی لکھتا ہے کہ اس نے ان کو حکم دے کر کہا: ''نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے راستہ کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی'' (متی 10:10)

مگر مرقس لکھتا ہے: ''حکم دیا کہ راستہ کے لیے لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو، نہ روٹی نہ جھولی نہ اپنے کمر بند میں پیسے مگر جوتیاں پہنو اور دو کرتے نہ پہنو۔'' (مرقس 8:6)

متی کے قول کے مطابق یسوع مسیح شاگردوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے ساتھ لاٹھی بھی نہ لو لیکن مرقس کے قول کے مطابق مسیح نے اپنے

شاگردوں سے کہا کہ لاٹھی لے لو۔ان دونوں بیانوں میں سے ایک ضرور غلط ہے۔

3- متی لکھتا ہے کہ جب یسوع مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو وہیں ''خداوند کے فرشتہ نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا: اٹھ بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا اور جب تک کہ میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا کیونکہ ہیرودیس اس بچے کو تلاش کرنے کو ہے، تا کہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا۔'' (متی 14,13:2)

مگر لوقا لکھتا ہے کہ جب یسوع مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے تو جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا۔ پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہو گئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تا کہ خداوند کے آگے حاضر کریں......اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیل میں اپنے شہر ناصرہ کو پھر گئے اور وہ لڑکا بڑھتا اور قوت پاتا گیا اور حکمت سے معمور ہوتا گیا اور خدا کا فضل اس پر تھا۔اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے اور جب دو بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔'' (لوقا:2:21,22,39 تا 42)

متی کے بیان کے مطابق یوسف یسوع کی پیدائش کے بعد اسے اور اس کی والدہ کو بیت لحم سے مصر لے گیا اور ہیرودیس کی وفات تک مصر میں رہا لیکن لوقا کے بیان کی رو سے یسوع مسیح کی پیدائش کے بعد اس کے ماں باپ اسے بیت لحم سے یروشلم لے گئے اور شریعت موسوی کے مطابق قربانی وغیرہ کی رسوم ادا کیں اور وہاں سے گلیل شہر ناصرہ میں چلے گئے اور بارہ برس تک یسوع وہیں رہا۔ پس متی اور لوقا کے بیانوں میں سے ایک بیان ضرور غلط ہے۔

یوحنا باب 13 سے ظاہر ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید سے ایک روز پہلے کھایا اور عید کے روز وفات پائی ،لیکن متی باب 26 آیت 17 مرقس باب 14 آیت 12 تا 16 اور لوقا باب 23 آیت 13 تا 25 سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید کی شام کو کھایا تھا اور عید سے دوسرے دن صلیب پائی۔لوقا کی انجیل کے باب 24 آیت 21, 29, 36 اور 51 میں لکھا ہے کہ جس روز مسیح جی اٹھے اسی دن یا پہلی رات جو آئی تھی اس میں آسمان پر چلے گئے۔لیکن یہی لوقا اعمال باب 1 آیت 3 میں لکھتا ہے کہ وہ جی اٹھنے کے چالیس دن بعد آسمان پر چلے گئے۔

6- یوحنا کی انجیل باقی تینوں اناجیل سے مختلف ہے۔اس میں ذیل کے مضامین نہیں ہیں: توبہ، معافی، ایمان، مال و اموال، طلاق، محصول لینے والا گنہگار ہیں۔ تبلیغ، بدارواح والے، بدارواح کا دھتکارنا، ناپاک، جذامی، منافقت، زنا، ویل اور افسوس، دولت مند، تمثیلیں، صلیب کی بجائے یوحنا لفظ رفع استعمال کرتا ہے حالانکہ باقی اناجیل میں یہ سب مضامین موجود ہیں۔

(ج) انجیل کا عہد قدیم کی کتب سے اختلاف:

1- انجیل متی 1:11 میں لکھا ہے کہ یوسیاہ سے یکونیاہ پیدا ہوا۔لیکن عہد قدیم کی کتاب یرمیاہ 28:4 اور اتواریخ 3:16 میں لکھا ہے کہ یکونیاہ کا باپ یہویقیم تھا اور یوسیاہ اس کا دادا تھا۔پس انجیل کا بیان غلط ہے کیونکہ عہد قدیم کی کتابوں سے مختلف ہے۔

2- انجیل لوقا 3:36 میں ہے کہ سلح قینان کا بیٹا تھا اور قینان ارفکسد کا۔لیکن عہد قدیم کی کتاب پیدائش بتاتی ہے کہ سلح کا باپ ارفکسد تھا۔پس دونوں بیانات میں سے ایک یقینی طور پر غلط ہے۔

3- متی یسوع مسیح کا نسب نامہ ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہوئیں اور یہود کے گرفتار ہو کر بابل جانے تک چودہ پشتیں''۔ (متی 17:1)

مگر عہد قدیم کی کتاب میں تواریخ 15,10,4 سے واضح ہوتا ہے کہ داؤد سے لے کر گرفتار ہو کر بابل جانے تک اٹھارہ پشتیں تھیں جن کا اسم وار ذکر موجود ہے۔ لہٰذا انجیل کا بیان غلط ہے۔

(د) نازیبا باتیں

1- حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت وہ باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان سے بعید اور اخلاقی نقطہ نگاہ سے گری ہوئی ہیں۔ چنانچہ یوحنا اپنی کتاب کے باب 10 میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے پیشتر جس قدر انبیاء آئے ہیں وہ سب چور اور راہزن تھے۔

2- مرقس باب 11 آیت 12 تا 14 میں لکھا ہے: ''صبح کو جب وہ بیت عنیاہ سے باہر آئے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت پتوں سے لدا ہوا دیکھ کر وہ گیا کہ شاید اس میں کچھ پاوے۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔ تب یسوع نے اس سے خطاب کر کے کہا کہ کوئی تجھ سے پھل نہ کھاوے۔''

اس حوالہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں: اول، مسیح علیہ السلام کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ انجیر کے درخت کو کب پھل لگتا ہے۔ دوم اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کی بجائے درخت کو بد دعا دی اور کہا کہ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھاوے۔

یہ دونوں باتیں حضرت مسیح علیہ السلام کی شان اور مرتبے کے منافی ہیں۔

3- متی باب 12 آیت 48,47 میں لکھا ہے: کسی نے اس سے کہا کہ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے تجھ سے بات کیا چاہتے ہیں۔ پر اس نے جواب میں خبر دینے والے سے کہا کہ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔''

ایک مقدس نبی اپنی ماں اور بھائیوں کے خلاف حقارت اور توہین آمیز کلمات نہیں کہہ سکتا''۔ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی'' حقارت اور توہین آمیز کلمات ہیں۔''

غلط پیش گوئیاں:

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی قرار دیتا ہے اور سچے نبی کی پیش گوئیاں کبھی غلط نہیں ہوتیں، کیونکہ پیش گوئی خدا کے علم پر مبنی ہوتی ہے اور خدا کا علم کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ انجیل میں ایسی پیش گوئیاں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو غلط نکلیں۔

1- ''تم میں سے کئی زندہ ہوں گے کہ میں آ جاؤں گا۔'' (متی 28:16 مرقس 1:9) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام دیکھنے والے مر گئے ہیں لیکن وہ اب تک واپس نہیں آئے۔

2- شاگردوں کو کہا: ''تم میرے ساتھ حکومت کرو گے''۔ (متی 19 : 28)

3- جب مخالفین نے یسوع مسیح سے نشان دکھانے کا مطالبہ کیا تو ''اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے بُرے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی (یونس) کے نشان کے سوا اور کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یوناہ تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ (متی 39:12......40)

یسوع مسیح نے یہاں یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں تین دن اور تین رات رہے اسی طرح وہ بھی زمین کے اندر تین دن اور تین رات رہے گا۔ لیکن دوسری اناجیل اس امر پر متفق ہیں کہ یسوع مسیح جمعہ کی شام کو صلیب سے اتارا گیا، پھر

اس کے چند گھنٹے بعد قبر میں رکھا گیا۔

انجیل یوحنا میں لکھا ہے! پس چونکہ تیاری کا دن تھا یہودیوں نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ ان کی ٹانگیں توڑی جائیں اور لاشیں اتاری جائیں تا کہ سبت کے دن صلیب پر نہ رہیں کیونکہ وہ سبت ایک خاص دن تھا۔'' (یوحنا 19:31)

دوسری جگہ یوحنا میں لکھا ہے: ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا۔ پس وہ شمعون پطرس اور دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی آئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے۔'' (یوحنا 20:1,2)

پس یوحنا کے بیان کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام زمین کے اندر صرف دو راتیں اور ایک دن رہے جبکہ پیشگوئی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح زمین میں تین دن اور تین راتیں رہیں گے لہٰذا یہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

ہندوستانی مترجمین نے تین دن اور تین رات کی بجائے تین رات دن ترجمہ کردیا ہے عربی بائبل میں یہ الفاظ ہیں:

''لانہ کما کان یوناہ فی بطن الحوت ثلاثۃ و ثلاث لیال ھکذا یکون ابن الانسان فی قلب الارض ثلاثۃ ایام و ثلاث لیال'' [1]

اسی طرح (The Parallel New Testament) مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی 1884ء جس میں 1611ء اور 1881ء کے تراجم بالمقابل لکھے گئے ہیں ان میں بھی "Three days and three nights" یعنی تین دن اور تین رات ہی درج ہے۔

پہلے مترجمین نے انجیل متی میں تین رات دن کیا لیکن یوناہ نبی کی کتاب میں یہ تبدیلی نہ کی۔ اس میں تین دن اور تین رات ہی لکھا رہا۔ لیکن 1936ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے جو بائبل کا اردو ترجمہ شائع کیا اس میں یوناہ نبی کی کتاب کے 1:17 میں بھی اور یوناہ تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا، کی بجائے ''اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا'' کردیا۔

بیرونی شہادتیں

(الف) یسوع مسیح علیہ السلام کی زبان کا عہد نامہ جدید کا کوئی نسخہ موجود نہیں:

حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ اس زبان میں عہد نامہ جدید کا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا۔ یونانی زبان میں انجیل کے نسخے ملتے ہیں۔ پھر ان نسخوں سے دنیا کی دوسری زبانوں میں تراجم ہوئے۔ عبرانی زبان میں انجیل کا کوئی نسخہ نہ پایا جانا اس امر پر بین دلیل ہے کہ موجودہ اناجیل الہامی نہیں، بلکہ مصنفین نے اپنی زبان میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے روایتی حالات بیان کردیے تھے۔

(ب) اناجیل کے تحریف و تبدل کے متعلق عیسائی علماء کے خیالات

1- تفسیر ہارن جلد 4 حصہ دوم باب 4 مطبوعہ 1882ء میں لکھتا ہے:

---

[1] متی 12:39 ...... 40 [2] یوحنا 19:31 - [3] یوحنا 20 : 2,1

[4] الکتاب مقدس جو جمعیۃ التوراۃ الامریکیہ وجمعیۃ التوراۃ البریطانیۃ والاجنبیۃ نے شائع کی اور قاہرہ میں 1938ء میں طبع ہوئی۔

"کلیسا کے قدماء مورخین نے اناجیل کی تالیف کے زمانہ کے متعلق جو حالات ہم تک پہنچائے ہیں، ایسے غیر معین اور ابتر ہیں کہ کسی ایک امر معین کی طرف نہیں پہنچاتے اور پرانے سے پرانے قدماء نے اپنے وقت کی گپوں کو سچ سمجھ کر لکھ دیا اور ان لوگوں نے جو ان کے بعد ہوئے ادب کر کے ان لوگوں کے لکھے ہوئے کو قبول کر لیا اور یہ روایات سچی اور جھوٹی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے کو پہنچیں اور مدت دراز کے گزر جانے کے بعد ان کی تنقید متعذر (یعنی مشکل) ہوگئی۔"

-2 پھر اسی جلد میں لکھا ہے:

"پہلی انجیل 37ء یا 38ء یا 41ء یا 43ء یا 48ء یا 61, 62ء یا 64ء عیسوی میں اور دوسری انجیل 56ء سے 65ء تک اور غالباً 63ء میں اور تیسری انجیل 53ء یا 63ء یا 64ء میں اور چوتھی انجیل 68ء یا 69ء یا 70ء یا 98ء عیسوی میں تالیف ہوئیں اور نامہ عبرانیہ اور نامہ روم پطرس اور نامہ دوم سوم یوحنا اور نامہ یعقوب اور نامہ یہود اور مشاہدات یوحنا اور نامہ اول یوحنا کے بعض درس (یعنی آیات) کا حال تو ایسا ابتر ہے کہ کہنے کے لائق نہیں۔ ان کو تو محض زبردستی سے بلاسند حواریوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بہت سے علماء فرقہ پروٹسٹنٹ نے ان کتب کا انکار کر دیا۔"

-3 کاتھلک ہیرلڈ جلد 7 مطبوعہ 1844ء کے صفحہ 205 پر لکھا ہے:

"اسٹاڈسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یوحنا کی انجیل بلاریب مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے لکھی اور ہارن اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ فرقہ ایلوجسین جو دوسری صدی میں تھا اسی انجیل (یوحنا) اور اسی طرح یوحنا کی سب تصنیفات سے انکار کرتا ہے"۔

-4 یوسی بیس اپنی تاریخ کلیساء کی کتاب 3 کے باب 3 میں لکھتا ہے:

"پطرس کا پہلا خط سچا ہے مگر دوسرا خط پطرس کا کبھی پاک کتاب میں شامل نہیں کیا گیا لیکن پڑھا جاتا تھا۔"

-5 پھر اسی کتاب کے 25 ویں باب میں لکھتا ہے کہ "نامہ یعقوب اور نامہ یہود اور نامہ دوم پطرس اور نامہ دوم سوم یوحنا پر کلام کیا گیا ہے کہ آیا یہ سب انجیل نویسوں نے لکھے ہیں یا دوسرے لوگوں نے جن کے یہی نام تھے۔"

-6 عہد نامہ قدیم عیسائیوں نے عیسائیوں کی خاطر لکھا تھا۔ علاوہ ازیں یہ یونانی میں یونانی بولنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا اور طرز تحریر اس وقت کے رائج طرز تحریر کے مطابق تھا۔ یونانی بولنے والے گرجا کے تاریخی تسلسل میں کوئی حقیقی فرق نہیں پڑا۔ اس لیے ہمیں تحریر کی کوئی حقیقی غلطی موجودہ نسخوں میں نہیں ملتی۔ گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اختلافات پائے نہیں جاتے لیکن یہ اختلافات اتفاقی نہیں ہیں بلکہ دیدہ دانستہ پیدا کیے گئے ہیں اور شروع سے ہی بعض مصنفوں نے بالارادہ وہ تغیرات عہد نامہ میں پیدا کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی مذہبی تقدس نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے جہاں کہیں تبدیلیوں اور زیادتیوں سے مضمون میں اصلاح کی امید کی جاتی تھی وہاں تبدیلیاں اور زیادتیاں دلیری

سے کر دی جاتی تھیں۔ ۱

موسیو رینان لکھتا ہے:

''ابتداء اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی کم تھا۔'' ۲

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مورخ لکھتا ہے:

''میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں۔'' ۳

لوقا کے متعلق رینان بیان کرتا ہے:

''اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے...... اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں...... اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔'' ۴

چاروں اناجیل کے متعلق لکھتا ہے:

''یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔'' ۵

پروفیسر جود (Joad) اپنی کتاب (Good and Evil) میں لکھتا ہے کہ ''اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے''۔ ۶

پھر اس کے بعد لکھتا ہے کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر بیون (Bevan) کا یہ بیان بالکل صحیح ہے۔

''ہماری قدیمی اناجیل سینٹ مرقس اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی جب (حضرت) عیسٰی علیہ السلام نے پطرس کی وفات سے اڑتیس سال قبل جو کچھ کہا اس میں جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا وہ بھی ارامی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ اس لیے (کلیسا کے فیصلہ سے قطع نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسٰی علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اسی طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی مختصر نویس نے اسے لکھ لیا ہو یا فوٹوگراف نے محفوظ کر لیا ہو۔'' (صفحہ 323)

مسٹر فلپ ویوین اپنی کتاب ''دی چرچز اینڈ ماڈرن تھاٹ'' (کلیسا اور خیالات جدید) کے صفحہ 99,98 پر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر رابن سن کو اقرار ہے کہ اناجیل اربعہ مشکوک ہیں لیکن اس کا خیال ہے کہ دوسری صدی کی یہ روایت کہ انجیل دوم کا مصنف سینٹ مارک (مرقس ہے) معتبر ہے اور یہ کہ مارک پطرس حواری کا ترجمان تھا اور اپنی انجیل کو حواری مذکور کی روایت سے اس نے روما میں تحریر کیا ہے۔ بہت خوب: ہم اس نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی یوں سمجھو کہ ایک انجیل کی روایت ایسے راوی سے ہے جو چشم دید روایت بیان کرتا ہے لیکن اس راوی کو صرف ایک سال (اور بقول رجعت پسند ناقدین تین سال) صحبت مسیح حاصل ہوئی۔ یہ حواری ناخواندہ تھا۔ تیس یا چالیس سال کے بعد وہ روایت کرتا ہے جس کو دوسرا شخص (مرقس) غیر زبان میں تحریر کرتا ہے اور پھر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ترجمہ کہاں تک اصل کے مطابق ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر رابن سن اپنے ابواب ''وعظ کبیر'' اور

---

۱ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا صفحہ 4980 جلد 4۔
۲ حیات مسیح ص 214۔
۳ حیات مسیح صفحہ 18,14
۴ حیات مسیح صفحہ 22۔
۵ حیات مسیح صفحہ 29۔
۶ ایضاً صفحہ 318۔

''غیر مرقسی دستاویز'' میں مرقس کی انجیل کی اہم فروگزاشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اہم فروگزاشتیں کیا ہیں؟ کیا ہم ان کو معمولی سمجھیں؟ ہم کو خود ان کا تھوڑا سا انتخاب کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بطور اعجاز پیدائش کا نہ کچھ ذکر ہے اور نہ آپ کے عہد طفولیت کے حالات جو کہ سابقہ پیش گوئی کی تصدیق میں ہوں۔ اسی طرح پہاڑی والے مشہور وعظ کا بھی کچھ ذکر نہیں۔ دوبارہ زندہ ہو جانے کا قصہ صرف چند سطروں میں مذکور ہے اور آسمان پر تشریف لے جانا صرف ایک سطر میں۔ بدقسمتی سے یہی وہ سطریں ہیں جو بالا تفاق الحاقی مانی جاتی ہیں کیونکہ انجیل مرقس کا حقیقت میں باب 6 آیت 8 پر ختم ہو جاتا اس لیے نہ حلول، نہ بعثت ثانی، نہ صعود کسی مسئلہ کا بھی وہاں ذکر نہیں۔ زبانی روایات، گم شدہ دستاویزات اور نامعلوم کاتب بس یہی وہ ذریعے رہ گئے ہیں جن سے ہم کو ان تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح رواں ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر اور بھی کوئی نا قابل اطمینان امر ہے جس سے مسیحی صداقت اور انجیل کی حقانیت پر شبہ عائد ہوتا ہو؟''

نورٹن اپنی کتاب علم اسناد مطبوعہ بوسٹن 1837ء کے دیباچہ جلد اول میں لکھتے ہیں: اگر یہ کمی و زیادتی انجیل میں واقع نہ ہوئی ہوتی تو معتبر و مشہور مورخ سلوس یہ کیوں اعتراض کرتا کہ عیسائیوں نے اپنی انجیلیں تین بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زیادہ بار بدلی ہیں۔''

اختلافات کی وجوہ

پادری ہارن صاحب اپنی مشہور کتاب انٹروڈکشن (دیباچہ علوم بائبل) جلد 2 صفحہ 317 میں ان تمام اختلافات کے چار وجوہ بیان کرتا ہے۔

اول: ناقلوں کی غفلت یا غلطیوں سے اختلاف کا ہونا۔ اور یہ کئی طرح پر ہوتا ہے:

1- عبری اور یونانی حرف آواز اور صورت میں مشابہ ہیں۔ اس سبب سے غافل اور بے علم نقل کرنے والا ایک لفظ یا حرف کو بجائے دوسرے لفظ یا حرف کے لکھ کر عبارت میں اختلاف ڈال دیتا ہے۔

2- تمام قلمی نسخے بڑے حرفوں میں لکھے جاتے تھے اور لفظوں بلکہ فقروں کے درمیان جگہ نہ چھوڑتے تھے۔ اس سبب سے کہیں لفظوں کے جز لکھنے سے رہ گئے اور کہیں مکرر لکھے گئے یا بے پروا اور جاہل نقل کرنے والے نے اختصار کے نشانوں کو، جو قدیم قلمی نسخوں میں اکثر واقع ہوئے ہیں، غلط سمجھا۔

3- بہت بڑا سبب اختلاف عبارت کا نقل کرنے والوں کی جہالت یا غفلت ہے کہ انہوں نے حاشیہ پر جو شرح لکھی ہوئی تھی اس کو متن کا جز سمجھا۔ قدیم قلمی نسخوں کے حاشیہ میں مشکل مقامات کی شرح لکھنے کا اکثر رواج تھا اور آسانی سے سمجھا جاتا تھا کہ یہ حاشیہ کی شرح ہے۔ پس ان حاشیوں کی شرحوں میں سے تھوڑا یا سب ان نسخوں کے متن میں آسانی سے مل گیا ہوگا، جو نسخے ایسے نسخوں سے نقل ہوئے جن کے حاشیہ پر شرحیں لکھی ہوئی ہوں گی۔

دوم: دوسرا سبب اختلاف عبارتوں کا اس قلمی نسخے میں غلطیوں کا ہونا ہے جس سے کاتب نے نقل کی، علاوہ ان غلطیوں کے جو بعض حرفوں کے شوشہ کم ہو جانے یا مٹ جانے سے واقع ہوئی ہیں۔ چمڑے یا کاغذ کے مختلف حالات سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کاغذ یا چمڑا پتلا ہو، جس میں ایک طرف کا لکھا ہوا دوسری طرف پھوٹ جائے اور دوسری طرف کے حرف کا ایک جز معلوم ہونے لگے اور سمجھ میں آئے۔

سوم: اختلاف عبارت کا سبب یہ بھی ہے کہ نکتہ چین اسے اصلی متن کو ارادتاً بہتر اور درست کرنے کی نیت سے صحیح کرے جبکہ ہم ایک مشہور

عالم کی مصنفہ کتاب پڑھتے ہیں اور اس میں صرف ونحو یا قواعد مناظرہ کی کوئی غلطی پاتے ہیں تو اس غلطی کو زیادہ تر چھاپنے والے پر منسوب کرتے ہیں، بہ نسبت اس کے کہ خود مصنف کی طرف نسبت دیں۔ اسی طرح ایک قلمی نسخہ کا نقل کرنے والا جو اس کتاب میں جسے وہ نقل کرتا ہے غلطیاں پائے تو ان کو ناقل اول کی طرف منسوب کرتا ہے اور پھر ان کو اپنی دانست میں اس طرح صحیح کرتا ہے کہ مصنف نے اس کو یوں لکھا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے خوردہ گیر قیاس کو بہت وسعت دیتا ہے تو وہ خود اس غلطی میں پڑتا ہے جس کے رفع کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا اور اس کا غلطی میں پڑنا کئی طرح پر ہوسکتا ہے۔

1- مثلاً نقل کرنے والا ایک لفظ کو جو حقیقت میں صحیح ہے غلط سمجھے اور یہ جانے کہ اس نے صرف ونحو کی غلطی پکڑی حالانکہ وہ خود غلطی پر ہے یا یہ بات ہو کہ خود مصنف ہی سے وہ غلطی صادر ہوئی جس کو یہ صحیح کرنا چاہتا ہے۔

2- اختلاف عبارت کے اسباب میں بقول میکس مُلر بہت بڑا سبب جس کے عہد جدید میں دروغ آمیز مقامات نہایت کثرت سے پیدا ہوئے ہیں، یہ ہے کہ یکساں مقامات کو اس طرح تبدیل کیا ہے جس سے ان میں ایک دوسرے سے زیادہ کامل مطابقت کی جائے اور خاص کر اناجیل کو اس طریقہ سے نقصان پہنچا ہے اور پال کے نامہ جات کو اکثر مقامات میں اس لیے الٹ پلٹ کیا کہ عہد جدید کے حوالوں کہ ان مقامات میں جہاں وہ سٹپوایجنٹ (نسخہ سبعیہ) ترجمہ سے بعینہٖ الفاظ سے تفاوت رکھتے ہیں اسی ترجمہ سے مطابق کریں۔

3- بعض نکتہ چینوں نے عہد جدید کے نسخوں میں اس طرح اختلاف عبارت ڈال دیئے کہ ان کا ترجمہ رومی ولکیٹ کے مطابق کردیا۔

چہارم: ایک اور سبب اختلاف عبارت کا ایسی خرابیاں یا تبدیلیاں ہیں جو کسی فریق کے مطلب برآری کے لیے دانستہ کی گئی ہوں، خواہ وہ فریق درست مذہب رکھتا ہو یا بدعتی ہو۔ یہ بات تحقیق ہے کہ ان لوگوں نے جو دیندار کہلاتے تھے بعض خرابیاں ارادۃً کیں۔ یہ خرابیاں اس دور اندیشی سے کی گئی تھیں کہ جو مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے اس کو تقویت ہو یا جو اعتراض اس مسئلہ پر ہوتا ہو وہ نہ ہوسکے۔ [1]

اناجیل اربعہ کے ماخذ

اناجیل اربعہ کے ماخذ کے متعلق علماء محققین نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں:

(الف) ایک رامی زبان میں انجیل تھی۔ اناجیل نویسوں نے اسے بنیاد ٹھہرا کر اپنی اپنی انجیل مرتب کی۔ یہ نظریہ اس لیے غلط ہے کہ واقعات بیان کرنے میں شدید اختلاف ہے۔ اگر اناجیل کا ایک ہی ماخذ ہوتا تو اختلاف نہ پایا جاتا۔

(ب) پہلے ایک انجیل مرتب ہوئی۔ دوسری انجیل کے مولف نے پہلی انجیل پر بنیاد رکھی اور اپنی انجیل کو مرتب کیا۔ بعض زبانی اور سنی سنائی روایات کا اس میں اضافہ کیا اور بعض روایات کو قلم زن کردیا۔ تیسرے مولف انجیل نے اپنی ماسبق دونوں اناجیل سے فائدہ اٹھایا کچھ اضافہ کیا اور کچھ حذف کیا۔ اس طرح اناجیل میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی انجیل کون سی ہے، دوسری کون سی اور تیسری کون سی؟ اس پر چھ قسم کی ترتیبیں تجویز ہوئیں:

1- لوقا 2- متی 3- مرقس

1- لوقا 2- مرقس 3- متی

---

[1] بحوالہ تاریخ صحف سماوی مؤلفہ پروفیسر نواب علی ص 130 تا 134 ایڈیشن دوم۔

-1 متی -2 لوقا -3 مرقس

مسیحی علماء نے تینوں قسم کی ترتیب کو دلائل کی بناء پر مسترد کر دیا اور ذیل کی ترتیب پر غور ہوا۔

-1 متی -2 مرقس -3 لوقا

-1 مرقس -2 متی -3 لوقا

-1 مرقس -2 لوقا -3 متی

اس میں مسیحی علماء نے دلائل کی بناء پر مرقس کو درجہ اول دیا ہے۔ اس کے بعد متی اور لوقا کے بارہ میں بحث ہے کہ ان میں سے دوسری کون سی اور تیسری کون سی ہے۔ اس بارے میں مسیحی محققین نے دلائل کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہا لیکن کوئی واضح فیصلہ نہ کر سکے۔ آج کل جس ترتیب سے اناجیل شائع ہو رہی ہیں وہ متی، مرقس، لوقا کی ترتیب سے جو کثرت آراء سے غلط ہے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عبرانی یا ارامی زبان میں ایک انجیل لکھی ہوئی تھی، جس سے اناجیل کا ترجمہ کیا گیا ہے یا نقل کی گئیں۔ اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اگر ایک ہی انجیل سے ترجمہ کیا گیا ہے تو پھر اختلاف کیوں رونما ہو گیا۔

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ اس مروجہ مرقس کی بجائے ایک اور مرقس انجیل تھی جس سے مروجہ مرقس اور متی اور لوقا کی اناجیل نقل کی گئیں۔

پانچواں نظریہ یہ ہے کہ اصل انجیل کا نام مرقس نہیں تھا بلکہ لوگیا Logia تھا۔ جس سے مرقس اور متی نقل کی گئیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیحی محققین یقینی طور پر اس بات کو متحقق نہیں کر سکے کہ اناجیل کا مرجع کیا ہے اور مروجہ اناجیل کی تاریخ تالیف کیا ہے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے شائع کردہ کالج ایڈیشن میں اس امر کا اعتراف ہے کہ اناجیل کی تاریخ تالیف مشکوک ہے۔

تینوں اناجیل (متی، مرقس اور لوقا) کے مقاصد

متی کی انجیل یسوع کو مسیح ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی۔ مرقس نے مسیح کو ابن اللہ ثابت کرنے کے لیے لکھی۔ اور لوقا نے نواب تھیوفلس کے لیے مسیح کو گنہگاروں کا نجات دہندہ ثابت کرنے کے لیے تالیف کی۔

اس تاریخی تجزیہ سے انجیل کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو انجیل عیسائی مشنری لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کو انسانیت کے لیے فلاح کا ضامن قرار دیتے ہیں وہ صحت اور ثقاہت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد احاطہ تحریر میں لائی گئی اور تحریف و تبدل سے پاک نہیں۔ لہٰذا انجیل انسانیت کا ضابطہ حیات نہیں بن سکتی۔

عیسائیت کے مروجہ عقائد پر ایک نظر

عقیدہ حلول تجسم:

اس عقیدہ کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام حقیقتاً خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ مارس ریلٹن نے اس عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کیتھولک عقیدے کا کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی خدائی کی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں جو زمان اور مکان کی قیود میں مقید ہے اور ایک عرصہ تک ہمارے درمیان رہی اس عقیدہ کی بنیاد انجیل یوحنا کے ان الفاظ پر رکھی گئی ہے:

''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔'' (یوحنا 1 : 24)

آگے چل کر لکھتا ہے:

''اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال (یوحنا 1 : 14)

عیسائی مذہب میں '' کلام'' ابن اللہ سے تعبیر ہوتا ہے جو خود مستقل خدا ہے۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسانی جامہ میں اوتار لیا تا کہ بنی نوع انسان پر اپنی محبت ظاہر کرے اور اسے ازلی عذاب سے نجات دے۔

تثلیث

تثلیث تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے باپ، بیٹا اور روح القدس، اس عقیدے کو تثلیث کہا جاتا، ہے اس عقیدہ کی تشریح و توضیح میں عیسائی فضلاء کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں باپ بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص 497 ج 22 مقالہ تثلیث (Trinity)

بعض کہتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور کنواری مریم وہ تین اقنوم ہیں جن کا مجموعہ خدا ہے (نوید جاوید ص 356 بحوالہ پادری سیل صاحب پھر ان اقانیم میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے؟

اس بارے میں عیسائی فضلا کا شدید اختلاف ہے، بعض فضلا کہتے ہیں کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا کہ مجموعہ خدا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا 1950ء، صفحہ 419 جلد 22 مقالہ تثلیث) علماء کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ خدا تو ہیں مگر مجموعہ خدا سے کمتر ہیں اور ان تین پر ہر لفظ خدا کا اطلاق ذرا وسیع معنی میں کیا گیا ہے (Basic Writings of Thomas Aquinas P. 327)

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ یہ تین ہی نہیں خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے یہ فرقہ مرفولیہ کا مذہب ہے۔

اس جگہ وہ تشریح درج کی جاتی ہے جو عیسائیوں میں مقبول ہے اور یہ تشریح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے باپ خدا ہے بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہی ہے اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔

تیسری صدی عیسوی کے مشہور عیسائی عالم سینٹ آگسٹائن اپنی کتاب تثلیث (On the trinity) میں لکھتے ہیں: ''عہد قدیم اور عہد جدید کے وہ تمام کیتھولک علماء جنہیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنہوں نے مجھ سے پہلے تثلیث کے موضوع پر لکھا ہے وہ سب مقدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس مل کر ایک ''خدائی وحدت'' تیار کرتے ہیں جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اسی وجہ سے وہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے اگر چہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا للہذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے اس لیے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا بلکہ باپ اور بیٹے کی روح ہے جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کا حصہ دار ہے۔

باپ:

عیسائیوں کے نزدیک باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے اور یہ ذات بیٹے کے وجود کے لیے اصل ہے۔

بیٹا:

صفت کلام باپ کی طرح قدیم ہے خدا کی یہی صفت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی شکل میں حلول کر گئی تھی جس کی وجہ سے یسوع بن مریم کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

روح القدس:

روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت ہے یعنی اس صفت کے ذریعے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے اور بیٹا بھی باپ سے محبت کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ خدا تین اقانیم پر مشتمل ہے خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہا جاتا ہے اور خدا کی صفت حیات و محبت جسے روح القدس کہا جاتا ہے ان تین میں سے ہر ایک خدا اور تینوں مل کر تین خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا ہے یعنی تین ایک اور ایک تین ہیں۔

کفارہ:۔

کفارہ موجود عیسائیت کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے، اس کے لفظی معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں، اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ یسوع مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام بنی آدم کے گناہوں کو چھپالیا ہے اور ان کے لیے نجات کا موجب بن گئے ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتاً ہر شخص کی فطرت میں جلد آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گناہ گار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ و استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے خلاف ہے۔ خدا رحیم ہے اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے پھر وہ عادل بھی ہے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے اب رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے۔ بندوں کو نجات دلانے کے لیے ایک صورت یہ نکالی کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے اور دوسرے لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ بنے۔

تبصرہ:

اس جگہ ان تینوں عقائد کا رد کرنا مقصود نہیں ان کے رد پر تفصیلاً بحث میری کتاب ''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ'' میں موجود ہے۔ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود و مطلوب ہے کہ تینوں عقیدے ''حلول تجسم، تثلیث اور کفارہ'' عقلاً بھی غلط ہیں اور دوسرے یہ کہ مذہب کی بنیادی تعلیم توحید کے بھی منافی ہیں۔ عیسائی عقیدے کے مطابق جب خدا تعالیٰ نے یسوع مسیح کا روپ اختیار کیا پھر یہودیوں کے ہاتھوں یسوع مسیح نے جو ذلت اٹھائی وہ تاریخ کے اوراق میں درج ہے۔ کیا خدا اتنا ہی کمزور، بے بس، ناتواں ہے کہ وہ یہودیوں کی ایذا رسانی سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔ کیا اس کمزور پر ایمان لانا انسان کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔ جو خدا یہودیوں کے سامنے بے بس ہے وہ بنی نوع انسان کے لیے کیسے فیضان اور محبت کا موجب بن سکتا ہے۔

عقیدہ تثلیث ایک ایسا گورکھ دھندہ ہے کہ یہ ایک علمی اور عقلی دھوکا ہے علم ریاضی میں ایک عدد نہ تو ایک سے زیادہ اور نہ ایک سے کم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علم ریاضی میں ایک کبھی بھی 1+1+1 کے برابر نہیں ہوسکتا اور نہ 1/3 کے برابر ہوسکتا ہے نہ تین ایک کے اور نہ تہائی کبھی ایک کے برابر ہوسکتا ہے کہ ایک کے سوا تمام اعداد ایک کی جمع کا نام ہیں۔ جس عدد کا نام تین ہے وہ درحقیقت تین دفعہ ایک کے مجموعہ کا نام ہے ایک اور تین میں جمع اور تفریق کی نسبت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات جمع اور تفریق سے پاک اور مبرا ہے لہٰذا علم ریاضی کی رو سے ایک تین نہیں ہوسکتے اور نہ تین ایک۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ تینوں اقانیم صفات میں برابر ہیں جب اس عقیدہ پر غور کرتے ہیں تو یہ عقیدہ صاف باطل نظر آتا ہے کیونکہ باپ بیٹے کو پیدا کرنے والا ہے۔ گو باپ خالق اور بیٹا مخلوق اور روح القدس دونوں سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا تینوں اقانیم کی صفات الگ الگ ہیں جب تینوں اقنوم اپنی صفات کے لحاظ سے مختلف ہوئے تو تینوں کل مرکب نہیں ہوسکتے اور تثلیث کا عقیدہ خود بخود باطل ہوجاتا ہے جو عقیدہ عقلاً غلط ہو وہ فطرت کا جزو نہیں بن سکتا۔ اس لیے انسانی فطرت اس عقیدہ کا رد کرتی ہے۔

کفارہ:

عقیدہ کفارہ انسان کے لیے ذلت کا موجب ہے کیونکہ عقیدہ کفارہ کی رو سے ہر شخص فطرت کے لحاظ سے گناہ گار ہے۔ جب کہ اسلام کی رو سے انسان فطرت صحیحہ پر پیدا ہوا ہے۔ دوم یہ عقیدہ انسان کو گناہوں پر دلیر کر دیتا ہے کیونکہ اس عقیدہ کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام انسانوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر مصلوب ہوگئے ہیں۔ اب انسان خدا کی گرفت اور سزا سے بری ہیں۔

یسوع کو موروثی اور کسی گناہ سے پاک ماننا بھی غلط ہے کیونکہ اس نے ماں کے رحم میں پرورش پائی اور تمام گوشت پوست اپنی والدہ مقدسہ ومطہرہ سے پایا تھا جو خود گناہ سے پاک نہ تھی لہٰذا وہ والدہ کے گناہ کے وارث ہوئے۔

جس مذہب کی شخصیت متنازع ہو جس کی کتب تحریف وتبدل کا شکار ہوں اور جس مذہب کے عقائد عقل اور فطرت کے خلاف ہوں وہ مذہب انسانیت کا مذہب کیسے بن سکتا ہے مزید برآں اس مذہب میں انسانی فلاح کا کوئی منشور نہیں۔

......☆☆☆......

دوسرے مذاہب کی موجودگی میں دین اسلام کی ضرورت

پہلی ضرورت: تکمیل شریعت

دین اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب آئے وہ سب قومی اور محدود ضروریات کے لیے تھے۔ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیر حیثیت نہیں رکھتا تھا۔قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (الاعراف 7 : 59) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (الاعراف 7 : 65) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (73:7) ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آیا: وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (75:7) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب آئے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ابراہیم 5:14) اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ (آل عمران 49:3)

اگر مذاہب عالم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی کہ کسی کتاب نے بھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ویدوں کو لیجیے۔نہ تو خود کسی وید نے اپنے عالمگیر الہام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کسی وید بھاسکر نے وید کی تعلیم کو عالمگیر قرار دیا۔اگر وید کی تعلیم عالمگیر ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کی تعلیم کی اشاعت اور تبلیغ ہندوستان کی چار دیواری سے باہر ہوتی اور وید کے ماننے والے دنیا کی دوسری اقوام تک اس کے پیغام کو پہنچانا ضروری سمجھتے۔لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں شودر وید کا کلام سننا تو در کنار وید کی شکل دیکھنے سے محروم رہا۔منوجی کے قول کے مطابق ایک شودر برہمن کے منہ سے وید کو سن لے تو اس کو قتل کر دینا ضروری ہے۔یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وید کی تعلیم عالمگیر نہیں تھی، بلکہ صرف ایک قوم کے لیے تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول تو اب تک انجیل میں لکھا ہوا ہے:

"میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، پس میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا"۔

(متی 15 باب)

پہلے انبیاء علیہم السلام کا پیغام ربانی لے کر صرف ایک ہی قوم کی طرف آنا زمانہ اور فطرت انسانی کے مطابق تھا۔نزول قرآن مجید سے قبل دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے، ذرائع رسل و رسائل مفقود تھے، اس وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھیں۔دوسرے انسان کا ذہن ایک عالمگیر شریعت کو اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق مختلف وقتوں میں پیغام بھیجتا رہا۔ جب دنیا رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی تو ایک مکمل شریعت کی ضرورت پڑی جو بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے۔سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ کو دین اسلام کی تعلیم دے کر

بھیجا گیا۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا o (مائدہ 3:5) آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے، دین اسلام تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے:

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ o (البینہ 3:98) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی قرآن مجید تمام کتب کی تعلیمات کا عطر ہے۔

دوسری ضرورت: مذہبی اختلاف کا فیصلہ

اسلام سے پہلے تمام مذاہب اختلافات اور تنازعات کا شکار بن چکے تھے، اب ضروری تھا کہ تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ ہوتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ پر دین اسلام کی تعلیم نازل فرمائی۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل 64:16) اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ جب ہم مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہودی مذہب میں فریسیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر نجات پا جائیں گے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ o بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ 2:80:82) اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی کہہ تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہیں جو تم نہیں جانتے، ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

ان آیات میں ان کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ کسی نبی کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر کوئی نجات نہیں پا سکتا بلکہ نجات کا دارومدار عمل پر ہے ارشاد الٰہی ہے۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی برے اعمال کی سزا کو کسی نیک آدمی کی راست بازی دور نہیں کر سکتی۔ برے اعمال کی سزا ضرور انسان کو گھیر لیتی ہے۔

اسی طرح یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ابنیت کی پرزور تردید کی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا o تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا o اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا o (مریم 19:89 - 90) اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ہو، قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اختلافات ہی اختلافات نظر آتے ہیں۔ رومن کیتھولک تین خداؤں کے سوا حضرت مریم کو بھی معبودیت کے تخت پر بٹھاتے ہیں اور پوپ کو معصوم عن الخطا گردانتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ صرف باپ بیٹا روح القدس تک ہی الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں اور پوپ کو معصوم عن الخطا نہیں مانتے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔

عشاء ربانی کے نظریہ کے تحت بعض کے نزدیک شراب اور روٹی حلق کے نیچے اترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت بن جاتی ہے۔ اسی طرح عشاء ربانی میں شامل ہو کر مسیح سے توصل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ نے مسیحیوں کو گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث کو باطل قرار دیا ہے۔ارشادِ الٰہی ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء4: 171) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ خدا تین ہیں،اس عقیدہ سے باز آ جاؤ کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

اسی طرح عیسیٰ اور مریم کے خدا ہونے کی تردید کی: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ5: 116) اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو۔

کفارہ کی تردید یوں کی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الزمر 39: 7،الاعراف 7: 164) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔

قرآن مجید نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقیدہ کی کئی جگہ پر زور الفاظ میں تردید کی،ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 3: 64) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

عقیدہ تناسخ کا رد

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔اس عقیدہ کی رو سے خدا گناہ معاف نہیں کرسکتا۔اس وجہ سے ایک انسان کو اپنے بُرے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔قرآن مجید نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جزا و سزا کے دن کا مالک) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے،وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔مالک کے اختیارات وسیع ہیں جسے چاہے معاف کردے۔پس خدا تعالیٰ جزا و سزا کے دن جسے چاہے معاف کرسکتا ہے۔پھر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کو غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (المومن 40: 3) کہتا ہے۔یعنی اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

روح و مادہ کی ابدیت اور ازلیت کا عقیدہ

یہ عقیدہ بھی ہندوازم کا ہے۔اس عقیدہ کی رو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔قرآن مجید نے ایک جگہ نہیں بلکہ بے شمار جگہ پر ہر قسم کے شرک کا رد کیا ہے۔ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 3 : 64) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا گیا ہے۔رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں،وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے اس وجہ سے یہ خدا کی کسی صفت میں شریک نہیں ہوسکتے۔

تیسری صورت: کتب سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح:

لوگوں نے سابقہ کتب سماوی میں بعض ایسی غلط باتیں شامل کردی تھیں جو مذہب کی روح کے سراسر منافی تھیں۔قرآن مجید نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے،حضرت لوط علیہ السلام اپنی ہی بیٹیوں سے فعل شنیع کے مرتکب ہوئے،حضرت ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کا ایک بت بنایا،حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا،

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کی پوجا کی۔

قرآن مجید نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر انتہائی تعریفی الفاظ میں کیا ہے اور اصولی طور پر عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ० وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ० لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ० (الانبیاء 21:25-27)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنالیا ہے وہ پاک ہے۔ بلکہ وہ معزز بندے ہیں وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (آل عمران 3:161) کسی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

یہ دونوں آیات عصمت انبیاء علیہم السلام پر محکم دلیل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وہی کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی ہو، ان کی زندگی وحی الٰہی کے مطابق گزرتی ہے۔

چوتھی ضرورت: سابقہ کتب سماوی کے برحق ہونے کی تصدیق اور حفاظت

قرآن مجید کے نزول سے قبل ہر نبی کی بعثت قومی سطح پر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے ان پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ بھی اسی قوم کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔

اس طرح ہر قوم صرف اپنے آپ کو ہی وحی کی نعمت عظمیٰ سے مستفیض سمجھتی تھی۔ دوسروں کو محروم۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قوم میں تنگ نظری اور تعصب کا مرض پیدا ہو گیا۔

اسلام آیا تو اس نے نہ صرف پہلی وحیوں کو برحق قرار دیا بلکہ ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا اور کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ پہلی کتب پر ایمان نہ لائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (بقرہ 2:41) اور پس اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ بنو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (مائدہ 5:48) اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جو اس سے پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محافظ ہے اور ان کے درمیان ان کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

قرآن مجید پہلی کتب کا مصدق اس لحاظ سے ہے کہ قرآن تمام کتب سماوی کو من جانب اللہ مانتا ہے۔ دوسرا اس لحاظ سے مصدق ہے کہ پہلی کتب میں قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کے متعلق پیشگوئیاں تھیں، قرآن مجید نے ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کتب کو سچا ٹھہرایا ہے۔

پانچویں ضرورت: گم شدہ توحید کو قائم کرنا

قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا سے توحید کا چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں میں روشن کیا تھا بجھ چکا تھا۔ ہندو مذہب میں تینتیس کروڑ دیوتا بن چکے تھے۔ بدھ مذہب میں خدا کی ہستی کا تصور خرافات، توہمات اور قیاسات کے نیچے دب

کرگم ہو چکا تھا۔ زرتشت مذہب میں خالق خیر و خالق شر دو معبود یزدان اور اہرمن کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ یہودیوں نے عیسائیت کے نقش قدم پر چل کر حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنادیا تھا۔ عیسائیت تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔ غرض کہ تمام دنیا کسی نہ کسی رنگ میں شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے توحید کی بجھی ہوئی شمع کو از سر نو جلایا اور تاریک دلوں کو خدا کی توحید سے منور کیا اور شرک کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔

چھٹی ضرورت: تکمیل انسانیت

سابقہ مذاہب کی کتب سماوی میں انسانی قویٰ کی نشوونما و تربیت کے لیے افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ یہودی مذہب انتقامی جذبہ کو زیادہ ابھارتا ہے اور عیسائیت جذبہ رحم کی اس رنگ میں تربیت کرتی ہے کہ غصہ جو انسان کا طبعی جذبہ ہے بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ عیسائیت کی تعلیم کی رو سے اگر کوئی کسی عیسائی کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف کر دینا چاہیے۔ یہی حال ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا ہے۔ اس وجہ سے تکمیل انسانیت کے لیے ایک ایسے دین کی ضرورت تھی جو انسانی قوتوں کی اعتدال پر نشوونما کرے، سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل کیا۔

اسلام میں افراط اور تفریط کا رنگ نہیں ہے بلکہ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید انتقام کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر۔ قرآن مجید انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتا ہے لیکن تبذیر سے روکتا ہے۔ قرآن مجید رحم کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر۔ غرض کہ اسلام نے انسانی قویٰ کی نشوونما اعتدال پر کر کے انسانیت کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

ساتویں ضرورت: نسل انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کرنا

اللہ تعالیٰ کی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ نسل انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کر دیا جائے۔ اس تقاضا کو اسلام نے پورا کیا۔ اسلام سے پہلے کسی مذہب نے بھی نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (19:10) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ o فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ (المومن: 23: 52,,54) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ ہی سے ڈرو مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے۔ سو ایک وقت تک انہیں اپنی جہالت کی نیند میں چھوڑ دے۔

اسلام نے وحدت نسل انسانی کو ختم کرنے والے تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

(الف) مذہبی تعصب

مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے یہ تعلیم دی کہ تمام کتب اور رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ وہ تمام قابل احترام اور معزز ہستیاں ہیں۔ اسی وجہ سے ایک مسلمان ہونے کے لیے سابقہ کتب سماوی اور تمام رسل پر ایمان لانا فرض قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ: 285:2) ہم کسی رسول کے درمیان تفرق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (285:2) مومن سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

اسلام صرف دوسرے مذاہب کے انبیاء علیہم السلام کو ہی صرف سچا نہیں مانتا بلکہ یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مذاہب میں نیک آدمی پائے جاتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ o يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران 3:113-114) یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت حق پر ہے جو اللہ کی آیات کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہیں۔ نیکی کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکی کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ o (الاعراف 7:181) اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں۔

مذہبی تعصب کو بالکل ختم کرنے کے لیے قرآن مجید نے تمام مذاہب کو ایک مشترکہ امر یعنی توحید پر جمع ہونے کی دعوت دی ہے کیونکہ تمام مذاہب کی بنیاد توحید پر ہی قائم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ o (الانبیاء 21 : 25) تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔

اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے۔ یہ ایک الگ امر ہے کہ مرورِ زمانہ سے مذاہب کے اس تصور میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوتی چلی گئی ہے۔

قرآن مجید نے اس مرکزی نقطہ کو سامنے رکھ کر یہ دعوت دی: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 3:64) کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان امر مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

(ب) قومی، لونی، لسانی تعصبات

وحدتِ نسلِ انسانی کے لیے قومی، لونی اور لسانی تعصبات نہایت ہی خطرناک ہیں۔ ان تعصبات نے دنیا کی اقوام میں منافرت اور مخاصمت کی آگ بھڑکا دی ہوئی ہے۔ قرآن نے ان تعصبات کو ختم کرنے کی نہایت ہی اعلیٰ پیرایہ میں تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات 49:13) (یہ خطاب تمام دنیا کو ہے) اے لوگو! غور کرو تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی نسل کے افراد ہو تمہاری شاخیں اور قبیلے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، خدا کو کسی قوم کا فرد عزیز نہیں ہاں خدا کو صرف وہ عزیز ہے جس کے دل میں خوفِ الٰہی ہو اور نیک عملی کی زندگی بسر کر کے نوعِ انسانی کی خدمت کرے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی (زاد المعاد ص 32 ج 4) کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو کسی

عربی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر تفوق ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے ہاں اگر فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ سے۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (روم 22:30) اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں میں اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

یہ تمام آیات قومی، لسانی اور لونی تعصبات کی جڑ پر تیشہ رکھ کر کاٹ رہی ہیں۔

قرآن مجید نے اس نظریہ کو عملی رنگ میں نماز اور حج کی عبادات میں پیش کیا ہے جہاں تمام انسان بلاتفریق قوم و ملت ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر وحدت نسل انسانی کی تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

عصر حاضر کا انسان قومی تعصبات کے بد نتائج اور عواقب قبیحہ کو دیکھ کر خود اس نظریہ سے بیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہکسلے نے 1947ء میں لکھا تھا:

''قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بحیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔''

ڈاکٹر "Gauld" اپنی کتاب "Man Nature and Time" میں لکھتا ہے: ''اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔''

یہ ہے اسلام کے زندہ اور سچا مذہب ہونے کا ثبوت۔ جس نظریہ تک انسان کا ذہن اب پہنچا ہے اس نظریہ کو قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کر دیا تھا۔

آٹھویں ضرورت: اللہ تعالیٰ کا اپنے ارادۂ ازلی کی تکمیل کرنا

خدا کا وہ ارادہ جس سے اشیاء پیدا کرتا ہے اس کی تکمیل ایک ضروری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے وحی نازل کرے۔ سو وحی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی۔ اس ارادہ کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسلام اپنی مکمل صورت میں قرآن کی شکل میں نازل ہو۔ اگر قرآن مجید نازل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا ارادۂ ازلی پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ اس وجہ سے اسلام کا مکمل صورت میں آنا ضروری تھا۔

......☆☆☆......

اسلام میں دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی حیثیت
(اسلام کا احسان عظیم)

اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس بارے میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کا عقیدہ اور طرز عمل کیا رہا ہے۔ اس کے بعد ہی اسلام کی رواداری کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

تمام مذاہب کے طرز عمل پر بحث تو باعث طوالت ہو جائے گی اس لیے دنیا کے صرف تین بڑے مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور ہندو دھرم کے عقیدہ اور طرز عمل کو زیر بحث لایا جائے گا، یہودیت اور نصرانیت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (البقرہ 113:2) اور یہود کہتے ہیں کہ عیسائی کسی سچائی پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہود کسی سچائی پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔

یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ مفتری سمجھتے ہیں اور عیسائی یہود کو گمراہ اور قابل نفرت تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں کی عداوت کی داستان سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ جب عیسائیوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آتی تو وہ یہودیوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔

یہودی کا لفظ عیسائی دنیا میں دشنام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

عہد عتیق میں انبیاء علیہم السلام پر اس قسم کے گندے اور فحش الزامات لگائے گئے جن کا مطالعہ ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز باتیں پڑھ کر ایک قاری یہود کے عقیدہ اور طرز عمل سے بخوبی آشنا ہو جاتا ہے۔

یہود غیر یہود کو (Gentile) بے دین اور کافر کہتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی چہیتی اور لاڈلی قوم سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ 5 : 18) یعنی ہم خدا کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں۔

ہندو دوسرے مذاہب والوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھتے ہیں چنانچہ البیرونی قدیم ہندوؤں کی مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے:

''ہندو دین میں ہم سے کلی مغائرت رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والوں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا، ان کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا پینا ناجائز سمجھتے ہیں۔ جس چیز میں کسی دوسری قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہو اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے، گو نجس چیز پاک چیز سے مل کر پاک ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوؤں میں جو شخص ان میں سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونا یا ان کے مذہب کو قبول کرنا چاہتا ہے اس کو اجازت نہیں ہے اور یہ صورت حال انسانیت کے ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے۔

یہ لوگ رسم و رواج اور عادات و خصائل میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری وضع و لباس وغیرہ

سے ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف اور دشمن قرار دیتے ہیں اگر چہ اس کی نسبت ہم لوگوں (مسلمانوں) کی جانب کی جاتی ہے، لیکن اس سے دوسری قوم بھی مستثنیٰ نہیں ہیں وہ سب کو شیطان سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ملک صرف انہی کا ملک ہے۔ انسان صرف انہی کی قوم کے لوگ ہیں، بادشاہ صرف انہی کا بادشاہ ہے، مذہب صرف انہی کا مذہب ہے، علم صرف وہی ہے جو ان کے پاس ہے، یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو کچھ تھوڑا بہت علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور اپنی خود پسندی کی وجہ سے جاہل رہ جاتے ہیں، ان کے اہل علم نہ صرف دوسروں بلکہ اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی علم چھپاتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر ہی نہیں ہیں اور نہ ان کے شہروں کے علاوہ کہیں انسان بستے ہیں اور نہ ان کے علاوہ کسی کے پاس علم ہے اگر ان سے کہا جائے کہ خراسان اور فارس میں بھی علم ہے تو اس کو غلط سمجھیں گے۔ (کتاب الہند)

یہ تو قدیم ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ ہے۔ جدید ہندو مت کے بانی سوامی دیانند نے اسلام اور عیسائیت پر اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں جس قدر ناروا اور دلخراش حملے کیے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔

اسلام کی تعلیم

اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ سب جہانوں کا خدا ہے۔ سب کی ربوبیت اسی کے ذمہ ہے۔ قرآن مجید کی پہلی سورۃ ''فاتحہ'' میں آتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ یعنی سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے یعنی اسلام کا رب صرف اہل عرب کا ہی رب نہیں بلکہ ہندوستان، ایران، شام، انگلستان، امریکہ، روس اور دنیا کے تمام ممالک کے رہنے والوں کا رب ہے جس نے جسمانی ربوبیت کے سامان ہر قوم کو دیئے ہیں اسی طرح روحانی ربوبیت کے سامان سے بھی کسی قوم یا بستی کو خالی نہیں رکھا۔ قرآن مجید نے اس بات کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ٥ (فاطر 35 : 24) یعنی ہر امت میں نذیر (ڈرانے والے) آتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد 13:7) یعنی ہر قوم کی طرف ہدایت دینے والے آئے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس 10 : 47) ہر ایک امت کی طرف پیغمبر بھیجا گیا۔

پھر فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ٥ (المومن 40 : 78) یعنی ہم نے تجھ سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے ہیں ان میں سے بعض رسولوں کا ہم نے تجھ سے ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا۔

پس قرآن مجید کی یہ آیات ہر مسلمان کی نگاہ میں شری مہاراج کرشن، رامچندر، بدھ، زرتشت اور کنفیوشس کو قابل تکریم اور تعظیم ٹھہراتی ہیں۔ اسی وجہ سے تمام مسلمانوں نے انہیں اپنی اپنی قوم کے ہادیان برحق سمجھا ہے۔

مسلمانوں کو تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ 2 : 285) اور ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفرق نہیں کرتے۔ ان سے انکار کرنا کفر اور ضلالت قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء 4 : 136) اور جو شخص خدا کا اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔

رسول کریم ﷺ غیر مسلموں کو مسجد میں ٹھہراتے ،ان کو ان کے طریقے پر مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دے دیتے۔ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا۔آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا۔اس وقت ان کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔اس لیے انہوں نے مسجد میں ہی نماز شروع کر دی۔ بعض مسلمانوں نے روکنا چاہا۔مگر آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا نماز پڑھ لینے دو۔ چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبوی کے اندر نماز پڑھی۔ (زاد المعاد جلد اول ص 5)

دین میں جبر نہیں

اسلام کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو جبر سے مسلمان بنانے کا حامی نہیں۔اس کا یہ واضح اعلان ہے کہ دین میں جبر نہیں: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ 2 : 256) دین میں زبردستی منوانا نہیں، ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف: 18:29) کہہ دو کہ حق (اسلام) تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے پس جو چاہے قبول کرے جو چاہے انکار کرے۔

تبلیغ حکمت اور دانائی کے ساتھ کرنی چاہیے، ارشاد الٰہی ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل 16 : 125) اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعے بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو۔

مذاہب کے باطل معبودوں کو بھی بُرا کہنے کی ممانعت کی ہے: لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام 6 : 108) جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو گالی گلوچ اور برا بھلا نہ کہو یہ لوگ بھی نادانی سے خدا کو بُرا کہنے لگیں گے۔

اسلام کا مقام دیگر مذاہب میں

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام نے تمام مذاہب کا سرچشمہ وحی الٰہی کو قرار دیا ہے۔ جہاں تورات کا ذکر کیا ہے تو اس کے متعلق یہ فرمایا ہے: فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (المائدہ 5 : 44) یعنی اس میں ہدایت اور نور ہے۔جب تمام مذاہب سچے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیئے جائیں تو پھر ہر مذہب والا کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے، اس میں سچائی اور ہدایت کا سامان بھی ہے تو پھر ہم اسلام اور اس کی کتاب کو کیوں مانیں۔

جہاں اسلام نے دوسرے تمام مذاہب کو اللہ تعالیٰ کی جانب قرار دیا ہے تو وہاں اپنا بھی ایک ایسا ارفع مقام بیان کر دیا ہے جس کی وجہ سے دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو اسلام کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔وہ ارفع مقام یہ ہے کہ اسلام تمام نبیوں کا موعود دین ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ o

(آل عمران 3 : 81) اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہا پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں

سے ہوں۔

اس مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ o (الشعراء 26 : 196) اور بے شک پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود دین ہے اور اس کے متعلق ہر مذہب کی کتب میں پیشگوئیاں موجود ہیں۔

یہ مناسب ہوگا کہ مذاہب عالم کی کتب سے وہ پیشگوئیاں اور بشارات درج کی جائیں، جن میں بانی اسلام ﷺ کا ذکر موجود ہے۔

بشارات کے متعلق ایک اصولی بحث

1- بشارات کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خواب کا سا مضمون رکھتی ہیں۔ عام طور پر عوام پر مشتبہ رہتی ہیں اور خواص پر بھی کبھی قرائن سے اور کبھی اس نبی کے ظہور کے وقت جس کی نسبت وہ بشارات ہیں یا اس کے اور دلائل سے ثبوت نبوت کے بعد اور اس مبشر نبی کی تفسیر سے ظہور پاتی ہیں۔ عیسائی نقطہ خیال سے تو جس کی نسبت بشارت ہو کبھی کبھی وہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یوحنا خود ایلیا ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام اسے ایلیا قرار دیتے ہیں۔ (لوقا 1/27 متی 1/14 اور 17/41)

2- بشارات میں بالعموم نام صفاتی ہوتے ہیں ذاتی نہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی قیمت اس کی صفات کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذاتی نام کے لحاظ سے جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا ذاتی نام یسوع ہے، اس نام کی پیشگوئی کتب سابقہ میں نہیں پائی جاتی، مسیح (علیہ السلام) کے نام کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

3- بشارات میں مقامات اور ملکوں کے نام بھی صفاتی ہوتے ہیں۔

4- بشارات کی مدت سے انسانوں کی مدت مراد نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یعنی اللہ کے ہاں ایک دن تمہارے شمار سے ہزار برس ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک بھی برہما کا اور انسانوں کا سال گنتی کے لحاظ سے الگ الگ میعاد کا ہوتا ہے۔

5- کسی بشارت کا کوئی حصہ عقل اور علم کے خلاف ہوگا تو وہ ناقابل قبول ہوگا۔

6- بشارت کا افسانوی حصہ واقعات کی تعبیر کے مطابق قبول کیا جائے گا۔

7- کسی نبی کے متعلق دوبارہ دنیا میں مبعوث ہونے کی بشارت سے مراد اس نبی کی صفات پر کسی دوسرے نبی کا مبعوث ہونا ہے۔ لوقا 17:1 میں مسیح نے ایلیا کے دوبارہ آنے کی تشریح اسی طرح کی اور جناب کرشن فرماتے ہیں کہ ہم کسی اور شکل میں حسب ضرورت اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔

8- اگر کسی مقدس کتاب کی بشارت میں ایک ہی ہستی کے متعلق دو جہتیں ہوں گی تو اس کی ایک ہی جہت قابل قبول ہوگی کیونکہ الہامی کتب تحریف کی وجہ سے کم و بیش اپنی اصلیت ضائع کر چکی ہیں۔ نیز یہ امر خود کتاب کی صداقت کے خلاف ہے کہ وہ ایک ہی ہستی کے متعلق دو مخالف و متضاد خیال رکھتی ہو۔

پارسی مذہب میں نوید آنحضرت ﷺ

زرتشتی مذہب جسے عوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں ایران کا قدیم مذہب ہے۔ اب اسی مذہب کو آتش پرست اور مجوسی

دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب ژندی اور پہلوی دو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتاب میں دو دفتر اہم ہیں، ایک کا دساتیر اور دوسرے کا اوستا یا ژند اوستا نام ہے۔ ان کتب کے دو حصے ہیں۔ خورد دساتیر اور کلاں دساتیر۔ 2۔ خورد اوستا اور کلاں اوستا۔ انہی کو وہ ژند اور مہا ژند کہتے ہیں۔

جناب زرتشت کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے ژند اوستا کی کتاب ژند اوستا فرد دین یشت 13 میں فرمایا:

اس کا نام فاتح مہربان اور اسی کا نام ''استوت ارینا'' (تعریف کیا گیا یا محمد) ہوگا۔ وہ رحمت کا مجسمہ ہوگا کیونکہ وہ تمام جہان کے لیے رحمت ہوگا۔ وہ حاشر ہوگا اس لیے کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے برخلاف مبعوث ہوگا۔ وہ مشرک لوگوں اور ایمان دار لوگوں کی اصلاح کرے گا۔ یعنی مشرکین، بت پرست اور زرتشتی مذہب کے پیرووں کی بدیوں کی اصلاح کرے گا۔''

(جیمس ڈار یٹر مترجم ژند اوستا کا اس آیت پر نوٹ فروردین یشت 28 آیت 129)

دنیا میں ایک ہی عظیم الشان رسول آنحضرت ﷺ ہوئے ہیں جن پر یہ پیش گوئی لفظاً لفظاً صادق آتی ہے۔ وہ تمام صفات جو اس بشارت میں بیان کی گئی ہیں وہ آپ کی ذات مقدس میں پائی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ کا فاتح مہربان ہونا فتح مکہ کے دن ظاہر ہوا۔ اپنے خونخوار دشمنوں کو لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (یوسف 92:2) آج کے کہہ کر چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ کا نام محمد ﷺ۔ آپ ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا، جبکہ آپ ﷺ سے قبل تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کے لیے رحمت تھے۔ آپ ﷺ کا حاشر ہونا یعنی آپ ﷺ کے قدموں پر دنیا کی تمام قوموں کا اکٹھا ہونا، بت پرستوں کی اصلاح کرنا، یہ صرف رسول کریم ﷺ کی خصوصیات ہیں۔

مہاتما بدھ کی پیشگوئی

مہاتما بدھ کی ایک پیش گوئی میتیا (Metteyya) کی آمد پر مشتمل ہے چنانچہ ''چکاوتی سنگھ ناد'' میتیا 3 : 76 میں لکھا ہے:

ترجمہ: بھائیو! اس وقت دنیا میں ایک اعلیٰ ہستی مبعوث ہوگی۔ اس کا نام برگزیدہ میتیا ہوگا۔ کامل معرفت والا، حکمت، نیکی اور سرور مطلق والا، تمام عالمین کا عالم بے نظیر، ہدایت کے متمنی لوگوں کا ہادی، ملائکہ اور انس کا معلم، ایک بدھ اعظم جیسا میں اس وقت ہوں۔ وہ خود کامل طور پر جانے گا اور دیکھے گا۔ گویا کہ یہ کائنات اس کے روبرو اپنی ساری ارواح عرفا جن و شیاطین برہموں کشتریوں، ویشوں (علماء اہل سیاست اور کاروباری لوگوں) کے ساتھ موجود ہے۔ جیسا کہ میں برای العین اسے دیکھ اور جان رہا ہوں۔ صداقت اپنی اصل پیاری کامل اپنی اٹھتی ہوئی خوبصورتی میں ہوگی اور اعلیٰ زندگی کی معرفت مع اپنے کمال و صفائی اصلی روح اور الفاظ دونوں کی وساطت سے ظاہر کی جائے گی۔ جیسا کہ میں اب ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہزاروں صحابہ کی جماعت ہوگی جیسا کہ میرے ساتھ چند سو کی جماعت ہے (بدھ کی کتب مقدسہ جلد 4 ص 74, 73)

لفظ میتیا کے معنی سنسکرت اور پالی لغت میں

جس طرح اس نام کا تلفظ مختلف کتابوں میں مختلف ہے اسی طرح اس کے معنی میں بھی خفیف سا اختلاف ہے:

الف : میتیا کے معنی سنسکرت لغت میں مہربان، دوست یا رؤف الرحیم کے ہیں۔ (سنسکرت انگلش ڈکشنری مولفہ مونیر ولیم صفحہ 18)

ب : بودھی ستو کا نام اور آئندہ آنے والے بدھ کا نام جو موجودہ دور عالم کا پانچواں بدھ ہوگا۔ (بدھ ازم مذکور ص 181)

ج : یہ لفظ میتری سے ہے جس کے معنی دوستی، خیر خواہی کے ہیں۔ (کتاب مذکور ص 128)

د : معلم محبت ہے۔ رحمۃ للعالمین۔ (اقرب فی المودۃ)

ہ : پالی لغت میں اس کے معنی دوستی، رحم، رحمت، محبت، شفقت، ہمدردی، مخلوق کی خیر خواہی ہیں۔ (پالی ڈکشنری مصنفہ ولیم سٹیڈ)

اس پیشگوئی میں میتیہ کا لفظ قابل غور ہے جس کے معنی مہربان دوست یا رؤف الرحیم ہیں۔ قرآن مجید نے رسول کریم ﷺ کو اس صفت کا حامل قرار دیا ہے جس کی شہادت آپ ﷺ کی سوانح حیات میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

الف : وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیاء 21:107) آپ ﷺ کو تمام قوموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ب : فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَا نۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ (آل عمران 3:159) پس اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔

ج : لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ (التوبہ 9 : 128) یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے وہ تمہارے لیے بھلائی کا خواہش مند ہے، مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔ میتیہ کے دوسرے معنی معرفت، حکمت، نیکی و علم، تعلیم و ہدایت میں کمال رکھنے والے کے ہیں۔ یہ تمام صفات رسول کریم ﷺ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق پیشگوئی

مہاتمابدھ کے اصل الفاظ کا ترجمہ کتب مقدسہ جلد 4 ص 74 پر یوں دیا ہے:

The truth lovely in consummation will be proclaimed both in the spirit and in the letter.

''پیغام حق اپنی دلنواز تکمیل اور روز افزوں خوبصورتی میں حافظہ اور حروف دونوں میں شائع کیا جائے گا۔''

اس ایک جملہ میں قرآن مجید کے اکثر خصائص بیان کر دیئے ہیں جو دنیا کی کسی کتاب کو میسر نہیں۔

1- وہ پیغام حق ہے۔

2- قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہے۔

3- اس کی صداقت روز بروز کھل کر سامنے آئے گی۔

4- حفاظ کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔

5- احاطہ تحریر میں آ کر اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہو جائے گا۔

اہل ہنود کی کتب مقدسہ میں پیشگوئی

مہرشی ویاس ہندوؤں کے ایک بڑے مرتاض اور صفا کیش رشی مانے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تالیف 18 مجلدات پران ہیں۔ ان پرانوں کے 18 سمند ہیں۔ ایک بڑے پایہ کی کتاب بھوشیہ پران ہے اس میں آئندہ کی خبریں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے پرتی سرگ پر 3 کھنڈ 3 ادھیاء 3 شلوک 5 تا 8 میں یہ بشارت موجود ہے۔

پیش گوئی کا ترجمہ

ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلم روحانی اپنے صحابہ کے ساتھ آئے گا اس کا نام محمد ﷺ ہوگا۔ راجہ بھوج نے اس مہادیو

(ملائک سیرت) عرب کے رہنے والے کو آب رود گنگا اور پنج گویہ سے غسل کرا کے (یعنی تمام گناہوں سے پاک ٹھہرا کر) دلی ارادت سے نذر و نیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا میں تیرے حضور جھکتا ہوں۔ اے فخر نسل انسانی عرب کے رہنے والے! شیطان کے مارنے کے لیے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے، دشمن ملیچھوں سے محافظت کیے گئے ہو۔ اے پاک ہستی مطلق اور سرور کامل کے مظہر میں تیرا غلام ہوں مجھ کو اپنے قدموں میں آیا ہوا جانیے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

1- اس بشارت میں حضور کا نام محمد ﷺ صاف بتا دیا گیا ہے۔
2- ملک عرب کا آپ کو رہنے والا بتایا ہے۔ (لفظی معنی مرد ستھل کے ریگ زار کے ہیں)
3- آپؐ کے صحابہؓ کا ذکر خصوصیت سے کیا۔ شاید ہی دنیا میں کوئی اور نبی آیا ہوگا جس نے اپنے پیروکاروں کو اپنے رنگ میں اتنا رنگین کیا ہو۔
4- وہ گناہوں سے پاک فرشتہ سیرت ہوگا۔
5- ہندوستان کا راجہ اس سے دلی عقیدت رکھے گا۔
6- آپؐ کی دشمنوں سے حفاظت ہوگی۔
7- آپؐ ہر قسم کی بدی کو مٹانے والے ہوں گے۔
8- آپؐ خدا کے مظہر اتم ہوں گے۔
9- مہرشی اپنے آپ کو آپ کے قدموں میں آیا ہوا قرار دیتا ہے۔
10- آپ کو فخر نسل انسانی بتایا ہے۔

یہ بشارت اس قدر صاف اور واضح ہے جس میں کسی قسم کے شک کی قطعاً گنجائش نہیں۔

اتھروید میں رسولِ کریم ﷺ کی بشارت

کنتاپ سوکت کا پہلا منتر آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک۔

ترجمہ: یہ سنو اے لوگو! ایک قابل تعریف تعریف کیا جائے گا۔ اے کورم ہم نے دشمنوں کے بیچ میں ساٹھ ہزار اور نوے ہزار لیے ہیں۔" یہ ترجمہ پنڈت راجہ رام صاحب پروفیسر ڈی اے وی کالج نے کیا ہے۔

"اے لوگو! یہ احترام سے سنو لوگوں میں تعریف والا انسان تعریف کیا جائے گا۔ اے زمین پر خوش خرامی کرنے والے بادشاہ ساٹھ ہزار نوے دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والے بہادروں میں ہم پاتے ہیں۔ (اتھروید کانڈ 20 سوکت 127 منتر) یہ ترجمہ پنڈت کھیم کرن الہ آبادی نے کیا ہے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

1- آپ کا نام محمد ﷺ ہوگا۔
2- وہ شہزادۂ امن ہوگا۔
3- دشمنوں کی کثرت میں خدا اس کی حفاظت و صیانت کرے گا۔

یہ تینوں امور رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

سام وید میں احمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت

ترجمہ: احمد ﷺ نے اپنے رب سے پُر حکمت شریعت کو حاصل کیا، میں سورج کی مانند (اس سے) روشن ہو رہا ہوں (پر پاٹھک 2 کھنڈ 6 کا منتر 8)

اس بشارت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ہے:

الف : حضور کا نام احمدؐ ہے۔

ب : آپؐ کو شریعت دیئے جانے کا ذکر ہے۔

ج : شریعت کے ساتھ حکمت ملنے کا بھی اظہار ہے۔

د : اس بشارت کو دیکھتے وقت رشی آفتاب رسالتؐ کے نور سے منور ہو رہا ہے۔

تورات مقدس میں مثیل موسیٰ کی پیشگوئی

موسیٰ کی پانچویں کتاب استثناء باب 18 آیات 17 تا 22 میں ملاحظہ کریں۔

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا، تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اور اگر تو کیونکر جانو کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کر جب نبی کچھ خداوند کے نام سے کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے پورا نہ ہو، یا واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ نبی نے گستاخی سے کہی تو اس سے مت ڈر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نبی نے ایسا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ بشارت میں مذکور ہے اور یہودی برابر موسیٰؑ جیسے ایک نبی کی آمد کے منتظر چلے آتے تھے۔

چنانچہ یوحنا 1:19ء میں ہے کہ لوگوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے دریافت کیا کہ تو مسیح ہے تو اس نے کہا نہیں پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا تو الیاس ہے تو اس نے کہا نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا تو وہ نبی ہے تو اس نے کہا: نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود کو ایک مسیح کی آمد کا انتظار تھا اور ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا۔ تیسرے کسی ''وہ نبی'' کا جس کی اس قدر شہرت تھی وہاں نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسیح اور الیاس کی دوبارہ آمد کے سوائے جو بشارت یہود میں مشہور تھی وہ صرف مثیل ہی کی تھی جو استثناء میں مذکور ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی انبیاء کے منتظر تھے: ایک مسیح کا ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا ایک مثیل موسیٰ نبی کا۔ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت یحییٰ الیاس کی دوبارہ آمد کے مصداق قرار پائے مگر ''وہ نبی کے مثیل ہونے کا دعویٰ نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کیا اور نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے۔ ان کے بعد بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت ختم ہو جاتا ہے اور بنی اسماعیل میں سے حضرت رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا اور مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ٥ (المزمل 73 : 15)

(اے اہل مکہ) جس طرح ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا تھا (اسی طرح) تمہارے پاس محمدؐ رسول بھیجے ہیں

جو تمہارے مقابلے میں گواہ ہوں گے۔

قرآن مجید نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ مثیل موسیٰ ہیں۔

دس ہزار قدوسیوں والی پیش گوئی

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔" (استثناء 33 : 2)

سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام ظاہر ہوئے۔

وہ کون سا فاران ہے جس میں سے خدا ظاہر ہوا۔ جہاں سے مسیح کے بعد رسول نکلا۔ اس پر روشن شریعت نازل ہوئی۔ وہ کون سا دین ہے جو فاران سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ وہ مکہ کی وادی غیر ذی زرع ہے جہاں ایک امی نبیؐ پر خدا کی آخری مقدس شریعت نازل ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔

دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے والا ایک ہی انسان دنیا کی تاریخ میں ہے یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ جو دس ہزار مقدس انسانوں کے ساتھ فاتحانہ شان میں مکہ سے داخل ہوئے۔

انجیل مقدس میں رسول کریم ﷺ سے متعلق نوید احسن

ایک اور تمثیل سنو: ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اسے چاروں طرف سے گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اسے باغبانوں کو ٹھیکہ پر دے کر پردیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کر دیا اور کسی کو سنگسار کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ انہوں نے اس سے کہا: ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ (متی 21 : 33)

باغ لگانے والا خداوند بنی اسرائیل ہے۔ (یسعیاہ 5 باب 2 - 3)

انگور بنی اسرائیل کی قوم ہے۔ 8 زبور۔ 9 تا کستان یروشلم ہے غزل الغزلات 8 باب 13 یسعیاء 5 باب 3 - 5 - 17)

اور موسم پر ایک نوکر باغبانوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس انگور کے باغ کا پھل اس کو دیں لیکن باغبانوں نے اس کو مار پیٹ کے خالی ہاتھ پھیرا۔ (دیکھو تفسیر یرمیاہ 27 باب 25 , 28)

پھر اس نے دوسرے نوکر کو بھیجا، انہوں نے اس کو پیٹ کر اور بے عزت کر کے خالی ہاتھ پھیرا۔

تفسیر: یہ شخص اوریا تھا۔ یرمیاہ 26 باب 23۔ یہ اس لیے کہ متی 21 باب 35 میں مار ڈالنا لکھا ہے۔ پھر اس لیے تیسرے کو بھیجا انہوں نے اسے گھائل کر کے نکال دیا۔ تفسیر 2 تاریخ 24 باب 21 - تب باغ کے مالک نے اپنے بیٹے (یہ مسیح ہیں) کو بھیجا شاید اسے دیکھ کر دب جائیں۔

جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے، اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کر لیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔

یہاں بیٹے سے مراد صلح کار کے ہیں۔ بیٹے کا لفظ کتب مقدسہ میں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ متی 5 باب 9 میں لکھا ہے: مبارک دے جو صلح کار ہیں کیونکہ خدا کے فرزند کہلائیں گے اور مسیح صلح کا شاہزادہ ہے۔

مار ڈالا سے مراد سخت ایذائیں ہیں۔

آخر کار باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انہوں نے اس سے کہا ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں گے۔

مالک خود آئے گا:

بیٹے کے قتل کے بعد باغبانوں کو سزا دینے کے لیے مالک خود آئے گا یعنی خدا خود آئے گا اس سے اور رسول کریم ﷺ کی بعثت اور آمد مراد ہے۔ خدا کے آنے سے مراد وہ شخص کامل ہے جو الوہیت کا مظہر اتم ہے، اس میں تمام صفات الٰہیہ ظلی طور پر بدرجہ اتم پائی جائیں۔

باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا سے مراد یہ ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کو دے دی جائے گی۔ متی 31 باب 43 میں ہے۔ اس لیے میں تمہیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لا دے دی جائے گی۔

مذکورہ بالا انگورستان کی تمثیل کے بعد ایک اور تمثیل اس کی تشریح میں بیان کی:

"کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب ہے۔" (مرقس 11, 5:12)

"جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا"۔ (متی 45, 44:21)

"پھر وہ کیا ہے؟ جو لکھا ہے کہ وہ پتھر جسے راج گیروں نے رد کیا وہی کونے کا سرا ہوا ہر ایک جو اس پتھر پر گرے چور ہوگا اور جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا۔" (لوقا 20 : 17, 18)

معماروں سے مراد بنی اسرائیل ہیں جو ہمیشہ اپنے بنی اسماعیل کو رد کرتے رہے۔ آخر کار ان میں سے ہی رسول کریم ﷺ پیدا ہوئے۔ جو کونہ کا پتھر ہے جس سے نبوت کی عمارت کی تکمیل ہوئی۔

تمثیلی زبان میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ بیٹے کو صلیب دیئے جانے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اور مامور ظاہر ہوگا جو کونے کا پتھر کہلائے گا۔ عبری میں لفظ پنّہ ہے جو کونے کے پتھر کے معنی دیتا ہے لیکن لغت میں اس سے مراد شہر کی عمارت کی زمین کی حفاظت کے برج کا وہ محافظ پتھر ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ سلاطین دوم 14:13 یرمیاہ 31:40 سلاطین اول 34:7 ایوب 38:9، تواریخ دوم 24:28 اور 15:26 میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور صفنیاہ 6:3 میں قوموں کی حفاظت کا پتھر معنی دیتا ہے۔ ان معنوں کے علاوہ یہ سب کے سردار، سب پر حکمران اور سب کے محافظ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ دیکھو یشوع 20:2 سموئیل 14:38 یسعیاہ 19:13 زکریا 10 :4)

ان معنوں کی بناء پر کونے کا پتھر رسول کریم ﷺ ہیں۔ جس نے تمام انبیاء علیہم السلام اور مذاہب کی تصدیق کی اور تمام کو من جانب اللہ قرار دیا۔

اس بشارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پتھر جس پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ بھی چور چور ہو جائے گا۔ جب رسول کریم ﷺ کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشارت بھی آپ ﷺ کی ذات بابرکات سے پوری ہوئی کہ جنھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ مقابلہ کیا وہ بھی ہلاک ہوئے اور جن کے ساتھ آپ ﷺ نے مقابلہ کیا وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے۔

احمد ﷺ کی آمد کے متعلق بشارت

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی جدائی کی خبر دیتے ہوئے اپنے غمگین حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

-15 اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں کو مدنظر رکھو۔

-16 میں باپ سے دعا کروں گا اور وہ تمہیں ایک دوسرا فارقلیط دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔

-17 روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اسے نہیں دیکھتی اور نہ اسے جانتی ہے (مگر تم اسے پہچانو گے کیونکہ وہ تم میں ہمیشہ رہے گا)

-18 میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا، میں تمہارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب 14 :15 تا 18) مگر جب مگر فارقلیط آئے گا جسے میں تمہارے پاس باپ کے پاس سے بھیج دوں گا روح حق جو باپ سے آئے گی وہ میری شہادت دے گی۔
(یوحنا باب 15 آیت 26)

-7 تاہم میں تمہیں سچ کہتا ہوں میرا جانا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا۔ اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

-8 جب وہ آئے گا تو وہ دنیا کو گناہ، نیکی اور عدالت سے ملزم گردانے گا۔

-9 گناہ سے اس لیے کہ انہوں نے مجھے نہیں مانا۔

-10 صداقت سے اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے اب نہ دیکھو گے۔

-11 عدالت سے اس لیے کہ دنیا کا سردار آزمایا جائے گا۔

-12 میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں، مگر تم میں ابھی ان کی برداشت نہیں۔

-13 البتہ جب وہ روح حق آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی طرف رہنمائی کرے گی کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گی مگر جو کچھ وہ سنے گی وہی کہے گی اور وہ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی۔ (یوحنا باب 16 آیات 7 - 13)

لفظ فارقلیط پر بحث

فارقلیط کا صحیح ترجمہ پیراکلیطوس ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی احمد ہیں۔ سیل نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ عبرانی لفظ فارقلیط کے معنی احمد ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے انجیل برناس میں تحریف کر کے پاراکلیٹ کو پری کلیوطاس بنا دیا ہے جس سے معنی ستودہ یعنی احمد ہیں۔

پس عیسائیوں کے اپنے اقرار کے مطابق فارقلیط کے معنی احمد ہیں جس کے متعلق مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد آنے کی بشارت دی تھی۔ فارقلیط والی بشارت کو پڑھ کر کئی نیک دل راہب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

قرآن مجید میں بھی آتا ہے "وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ

مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف 6:61) اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ﷺ ہوں۔ میں تصدیق کرتا ہوں توراۃ میں سے اس کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول ﷺ کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ ان کے پاس کھلے دلائل لے کر آ گیا تو انہوں نے کہا یہ ایک صریح جادو ہے۔

انجیل یوحنا میں فارقلیط (احمد) متعلق جتنی نشانیاں بیان ہوتی ہیں وہ سب رسول کریم ﷺ کے وجود باجود سے پوری ہوتی ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بشارت رسول کریم ﷺ کے متعلق ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ اسلام دین موعود ہے جس کے متعلق تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام نے پیشگوئیاں کی تھیں تو اس سے منطقی طور پر حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں جن سے تمام مذاہب عالم میں دین اسلام کو ایک ارفع مقام حاصل ہو جاتا ہے:

1- اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

2- دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

3- دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین نہیں آئے گا۔

اسلام کی عالمگیریت

جیسا کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتدا میں سب اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ پڑی ہوئی تھیں اور ان کی ذہنی اور روحانی استعدادیں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ایک مکمل شریعت برداشت کر سکتیں تو اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ ہر ایک قوم میں الگ الگ نبی آتے اور ان کی استعدادوں اور ضرورتوں کے مطابق الگ الگ شریعت لاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو نامکمل چھوڑ رہے ہیں۔ انجیل یوحنا باب 13,12,8,7:16 میں لکھتا ہے:

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آئے گا...... مجھے تم سے اور باتیں بھی کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔"

یہ ضروری تھا کہ انسانی استعدادیں ارتقائی منازل طے کر کے بلوغت کو پہنچ جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ وہ مکمل شریعت کو برداشت کر سکیں اور وہ وقت آ جائے گا کہ تمام اقوام عالم آپس میں ملنا شروع کر دیں تو یہ ضروری تھا کہ اس وقت ایک ایسا رسول ﷺ آئے جو عالمگیر شریعت لائے، جو ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے ہوتا کہ اقوام عالم کی باہمی منافرت اور مغائرت دور ہو کر ایک عالمگیر اخوت قائم ہو جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر نبی اپنی قوم سے یہ عہد لیتا کہ جب وہ موعود نبی عالمگیر شریعت لائے تو اس کو ضرور ماننا اور اس موعود نبی کی مدد کرنا۔ اگر ہر نبی اس موعود نبی کی بشارت نہ دیتا تو اس کی امت یہ عذر کر سکتی تھی کہ وہ اپنے قومی مذہب کو ترک نہیں کر سکتی۔

دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں اور نہ مذہب جس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو، سوائے اسلام کے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا 34 : 28) اور اے محمد ﷺ! ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(الاعراف 7 : 188) اے نبی کہہ دیجیے کہ میں تم سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ o (الانبیاء 21 : 107) ہم نے آپ ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں:

کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصة و بعثتُ الی کل احمر و اسود (مسلم باب المساجد) ہر ایک نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ اقوام کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یہ آیات اور حدیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی مقدس کتاب ۔نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، ارشاد الٰہی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ 5 : 3) آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

اسلام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام 6 : 38)

یعنی نوع انسان کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔دوسری جگہ آتا ہے: فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینة 3:98) اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔

یعنی اس قرآن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اول وآخرین جمع ہیں۔

دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین اور نبی نہیں آئے گا

دین اسلام کا کامل ہو جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سلسلہ نبوت ترقی اور ارتقاء کی تمام منازل طے کر چکا ہے، اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔اس طرح اکمال دین ختم نبوت ہے۔نبوت کے ختم ہونے کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب 33 : 40) محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ اور خاتم النبین ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے خاتم النبین کی تفسیر ذیل کے ارشادات میں فرمائی ہے:

1- انا خاتم النبین لانبی بعدی میں خاتم النبین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

2- ان النبوة والرسالة قد انقطعت فلا نبی بعدی ولا رسول یعنی نبوت اور رسالت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اب میرے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول۔

3- مثلی و مثل الانبیاء کمثل رجل بنی بیتافاحسنہ و اجملہ الاموضع لبنة فجعل الناس یطوفون حولہ یتعجبون ھلا و ضعت ھذہ اللبنة الاھذہ اللبنة و انا خاتم النبین یعنی میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے

ایک شخص نے مکان بنایا ہوا اور اس کو ہر لحاظ سے خوبصورت کیا ہو ہاں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو لوگ اس مکان کے گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ آخری اینٹ کیوں نہیں لگائی وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

قرآن مجید کے اول مفسر رسول کریم ﷺ ہیں اور وہی مہبط وحی ہیں۔ جس آیت کی تفسیر آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہے وہ صحیح ہے اور اس کو نہ ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے خاتم النبیین کی تفسیر لا نبی بعدی بیان کی ہے جن کے معنی ہیں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لا نفی جنس کا ہے جس نے نبوت کے اجراء کی ہر لحاظ سے نفی کی ہے۔

یہ کہنا کہ بغیر شریعت کے نبی آ سکتا ہے۔ یہ نبوت کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کیونکہ نبی میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ جبرئیل علیہ السلام کا وحی نبوت لے کر اس پر نازل ہونا۔ وحی نبوت کا نازل ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شریعت ابھی مکمل نہیں ہوئی کیونکہ وحی نبوت احکام الٰہیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں نئے احکام الٰہیہ کے نازل ہونے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ قرآن مجید دین اسلام کو اکمل قرار دیتا ہے۔

پس جو شخص نبوت کے جاری ہونے کا قائل ہے وہ دراصل اسلام کو کامل دین نہیں سمجھتا۔ پس دین اسلام کامل ہو چکا ہے۔ اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی رہنمائی یہ دین نہ کرتا ہو۔ اس دعویٰ اور اعلان کے ہوتے ہوئے اجرائے نبوت کا قائل ہونا پھر مدعی نبوت کے ماننے کو جزو ایمان قرار دینا اور ایک ارب مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا نہایت ہی افسوس ناک اور نقصان دہ امر ہے۔ اجرائے نبوت کے عقیدہ سے صرف امت اسلامیہ کا اتحاد ہی پارہ پارہ نہیں ہوتا بلکہ اسلام کا ہی تختہ الٹتا ہے۔

صرف اسلام ہی دین کی غرض و غایت پوری کرتا ہے

1- فطری اقتضاء کی تکمیل

دین ایک فطری چیز ہے۔ صرف اسلام ہی دین کی غرض و غایت کو پورا کرتا ہے۔ فطرت کے اقتضاء آت دو قسم کے ہیں۔ روحانی اقتضاء اور مادی اقتضاء۔

2- روحانی اقتضاء (باری تعالیٰ کا شعور اجاگر کرنا)

روحانی اقتضاء اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ارد گرد گھومتا ہے کیونکہ خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (الزخرف 43 : 9) اگر تو ان سے سوال کرے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ انہیں غالب علم والے نے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (الاعراف 7 : 172) اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد پیدا کی اور ان کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا ہاں ہم گواہ ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔

مذہب اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل اور براہین کے ذریعے محکم ایمان پیدا کرتا ہے، ایمان کے آب زلال سے ہی روحانی زندگی کا شجر سرسبز اور شاداب رہ سکتا ہے۔

اگر تمام مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خدا کی ہستی کا تصور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مذہب کی غرض و غایت اللہ کی ہستی پر یقین پیدا کر کے معرفت کاملہ تک پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر جتنا زیادہ یقین اور ایمان ہوتا ہے انسان اتنا ہی بدیوں سے دور رہتا ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت کرتا ہے کیونکہ حقیقی معرفت ہی انسان کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر سکتی ہے۔ اس کی یوں مثال سمجھیے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ اس بل میں سانپ ہے تو وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا کہ سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اسی طرح کوئی شخص وہ دودھ نہیں پیے گا جس کے متعلق اس کو یہ یقین ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔

پس مذہب کی پہلی غرض اللہ تعالیٰ پر کامل یقین پیدا کرنا ہے۔ تمام مذاہب خصوصاً اسلام نے خدا پر کامل یقین اور معرفت تامہ پیدا کرنے کے اصول بھی بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں عبادت الٰہی، توبہ و استغفار، دعا اور خدمت خلق، جب انسان کو خدا کی معرفت تامہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ایمان باللہ کے ضمنی عقائد یعنی نبیوں پر ایمان، سماوی کتابوں پر ایمان ملائکہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان لے آتا ہے۔

مادی اقتضاء

فطرت کی دوسری اقتضاء مادی ہے جس میں خاندان، معاشرت، معیشت، سیاست اور قانون شامل ہیں۔ تمام مذاہب مذکورہ امور کی تعلیم دیتے ہیں۔ خصوصاً اسلام نے ان امور سے متعلق کامل ہدایت دی ہے۔

عائلی زندگی

خدا کی ہستی اور اخلاق فاضلہ کی تعلیم کے بعد اہم امر عائلی زندگی ہے کیونکہ عائلی زندگی ہی معاشرہ کی پہلی اکائی ہے اور اسی پر معاشرہ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ عائلی زندگی انسانی فطرت کی پہلی مادی جھلک ہے اسی لیے عائلی زندگی کو قواعد ضوابط میں ڈھالنے کے لیے مذہب کی غرض و غایت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانی فطرت میں ہی بقائے نسل کا تخم بو دیا گیا ہے۔ ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی نسل ہو۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دنیا میں ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے گئے ہیں یعنی نر اور مادہ۔ یہی بقائے نسل کا ضامن ہے۔ مرد اور عورت کی پیدائش اسی حکمت الٰہیہ سے ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء 1:4) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

تمام دنیا کی رونق مرد اور عورت کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ تمام مذاہب نے باہمی اختلاط کے قواعد بیان کیے ہیں تاکہ مرد و عورت ان ضوابط کی پابندی سے غلط کاریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ غلط کاریاں ہی معاشرتی زندگی کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں: مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ وِجَاءٌ (بخاری 10:30) جو کوئی تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کے نیچے رکھنے اور شرم گاہوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ جو نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ روزہ رکھے اور وہ خصی کر دیتا ہے (جذبہ شہوت کو دبا رکھتا ہے)۔

ب ۔ معاشرت

جب عائلی زندگی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور انسان گھر سے باہر قدم رکھتا ہے تو معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے اعمال کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ معاشرتی ادارہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس وجہ سے حکماء اور فلاسفہ نے انسان کو مدنی الطبع قرار دیا ہے۔ معاشرہ کے بغیر انسانی زندگی دوبھر بن جاتی ہے۔ تمام مذاہب نے خصوصاً اسلام نے معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اصول مقرر کیے ہیں تا کہ معاشرہ قوانین کی حدود میں رہ کر آگے بڑھے اور انسانی زندگی کو خوشگوار بنائے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے چند اصول مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں مساوات، اخوت، اتحاد، انصاف، جان و مال اور عزت کی حفاظت، حریت و آزادی، ملکیت میں دوسروں کا حق، ذمہ داری کا احساس، تکریم انسانیت، اس کے ساتھ معاشرتی ادارے کے تمام اراکین کے حقوق و فرائض مقرر کر دیئے ہیں۔

معیشت

ابتدائے آفرینش سے روٹی کے مسئلہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس مادی مسئلے کو ہر مذہب نے حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی تکمیل اسلام نے کی ہے۔ اسلام ایک فطری اور امن کا دین ہے اس نے حصول انتفاع اور رفع نزاع کے لیے پابندیوں کے ساتھ ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ حرام کردہ شرعی پابندیاں یہ ہیں۔ سودی کاروبار، جوا، حرام چیزوں کی خرید و فروخت، احتکار، اکتناز، تجنیس، کم ناپ تول، کاروبار میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا جس سے دوسرے افراد یا سماج کو نقصان پہنچتا ہو۔ کوئی ایسا لین دین نہیں کیا جا سکتا جس میں بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے اپنے قبضہ میں نہ ہو۔ روزی کمانے کے وہ ذرائع اور طریقے ناجائز ہیں جو دوسروں کے مادی نقصان کا باعث بنتے ہوں۔ اسی طرح وہ ذرائع بھی ممنوع ہیں جن سے اخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔ لین دین کا کوئی ایسا معاملہ طے نہیں کیا جا سکتا جس کے سارے ضروری پہلو واضح نہ ہوں اور فریقین میں جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ مذکورہ پابندیوں کے تحت جو شخص روزی کمائے گا۔ اس میں بھی سائلین اور محرومین کا حق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذریٰت :19) ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

اسلام نے اس حق کو دو طریقے سے ادا کرنے کی تعلیم دی ہے لازمی اور طوعی۔

لازمی سے مراد زکوٰۃ ہے جو ہر صاحب نصاب پر فرض ہے اس کے علاوہ طوعی ہے کہ ایک صاحب دولت اپنی مرضی سے غرباء کی کفالت کے لیے جتنا چاہے خرچ کرلے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ 2 : 219) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں۔ کیا خرچ کریں کہہ دے جو ضرورت سے زائد ہے۔

سیاست اور قانون

سیاست انسانی فطری مادی اقتضاء کا ایک اہم جزو ہے۔ سیاست معاشرتی زندگی کی آخری حد ہے۔ جب معاشرتی زندگی میں وسعت پیدا ہوئی اسی معاشرتی وسعت کے بطن سے ریاست کا وجود نکلا۔ عہد قدیم سے ہی ریاست کا موضوع مفکرین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مذاہب عالم کے بانیوں نے بھی اس فطری ادارہ کے لیے قوانین مرتب کیے۔ لیکن یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے ریاست کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں جن سے عوام اور ریاست کے درمیان بہترین راستہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسلام نے حکمران کی تقرری عوام کی رائے سے ضروری قرار دی ہے پھر حکمران کے اوصاف بیان کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ شہریوں اور حکمرانوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے ہیں۔ اس سے انسان کی زندگی انفرادی اور اجتماعی طور پر پرسکون اور خوشگوار بن گئی ہے۔[1]

اقتضاءات روحانی ومادی کی تکمیل کا نتیجہ (انسانی فلاح)

اقتضاءات روحانی اور مادی کی تکمیل کا نتیجہ انسانی فلاح ہے جیسا کہ قرآن مجید کے آغاز میں ہی اس کا ذکر ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ o وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ o اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرہ 2:2 تا 5) متقیوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

سورہ مومنون میں بھی فلاح کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ 1- نماز میں عاجزی۔ 2- لغو باتوں سے اعراض 3- پاکیزگی کے لیے کام کرنا (یا زکوۃ دینا) 4- شرم گاہوں کی حفاظت کرنا۔ 5- اپنی امانتوں اور عہد کا پاس رکھنا۔

فلاح کیا ہے:- فلاح کے معنی ظفر و ادراك بغية (امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلب کو پالینا۔ اسلام میں فلاح دنیاوی مال و دولت کا حصول نہیں ہے بلکہ انسانی کے مخفی قویٰ کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بے شمار مخفی استعدادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اسلام ان مخفی استعدادوں کی آبیاری کرتا ہے اور وہ استعدادیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مخفی استعدادوں کی ظہور پذیری میں ہی انسانی فلاح ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے۔ ایک درخت کا بیج ہے اس بیج کے اندر ہی اس کی استعدادیں اور جواہر مخفی ہیں جب زمین میں مناسب ماحول پاتا ہے تو اس بیج سے پودا نمودار ہوتا ہے جو ایک وقت پر اپنے تمام جواہر ظاہر کر دیتا ہے۔ یہی حال ایک انسان کا ہے اس کے مخفی جواہر، روحانی اور مادی اقتضاءات کی تکمیل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں بھی فلاح کے حصول کے لیے دعا سکھائی ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ صراط مستقیم وہ اصول ہیں جن کی وضاحت سورۃ بقرہ کی آیات 2 تا 5 اور سورہ مومنون کی آیات 1 تا 9 میں ہے۔ سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم پر چلنے والوں کو منعم علیہم یعنی انعام یافتہ اور سورہ بقرہ اور سورہ مومنون میں مفلح یعنی فلاح یافتہ کہا ہے حقیقت میں منعمین وہی مفلحین ہیں۔ جو شخص انعام پاتا ہے وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

3- عقل کی رہنمائی

انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ دنیا کے حکماء نے عقل کی کوتاہ بینی کا اقرار کیا ہے۔ سقراط کا یہ مشہور مقولہ ہے: ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اگر انسان کو اپنی عقل سے زندگی کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑتیں اور دنیاوی زندگی بہتر بنانے کے لیے تمام اصول وضع کرنے پڑتے تو عقل کے نقص کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا۔

مذہب نے انسان کی عقل کی رہنمائی کے لیے عائلی، عمرانی، سیاسی، اقتصادی اصول وضع کر دیے ہیں تا کہ انسان ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے ہر قسم کے مسائل کو حل کر سکے۔ اگر انسان کے سامنے وہ اصول نہ ہوتے تو وہ ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گر جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عقل وفہم سے کام لینے کی بہت تاکید کی ہے اور عقل وفہم کے مختلف گوشوں کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ سے واضح کیا ہے۔ کہیں لفظ حکمت سے تعبیر کیا ہے کہیں لفظ لب سے اور کہیں شعور سے کہیں بصیرت سے کہیں تفکر سے کہیں تدبر سے کہیں لفظ توسم سے۔

---

1 مذہب کی غرض وغایت کے عنوان کے زیر تحت جن عنوانات (روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرت، معیشت اور سیاست) پر مختصر بحث کی ہے۔ کامل مذہب وہی ہے جس میں مذکورہ عنوانات پر سیر حاصل تفصیل ہو وہ صرف اسلام ہی ہے۔

قرآن مجید نے مختلف پیرایوں میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو غور وفکر اور عقل وتدبر سے کام لینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ 2:269) جسے حکمت ودانائی عطا ہوئی اسے بے شمار بھلائیاں مل گئیں۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (البقرہ 2 : 44) تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (البقرہ 2 : 9) یہ شعور سے کام نہیں لیتے۔ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (القصص 28:72) تم بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ o (البقرہ 2 : 269) اہل عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ o (الرعد 13: 3) اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا o (محمد 47 : 24) یہ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا دلوں میں تالے پڑے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ o (الحجر 15 : 75) اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مذہب اور عقل کا باہمی تعلق کتنا ہے۔ اسی گہرے تعلق کو بیان کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: دِيْنُ الْمَرْءِ عَقْلُهٗ وَمَنْ لَا دِيْنَ لَهٗ لَا عَقْلَ لَهٗ کنوز الحقائق حرف الدال) انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔

4- حیات بعد الموت کی اطلاع:

انسان خدا تعالیٰ کی ہستی پر یقین کائنات کے محکم نظام پر نظر دوڑا کر پیدا کرسکتا ہے اور انسان کی فطرت میں خدا کا تصور مرکوز ہے۔ مگر جزا وسزا اور حیات بعد الموت کا علم سوائے مذہب کے کہیں سے حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ انسان کی اپنی عقل اس قدر دور کے نتائج کو بھانپ نہیں سکتی۔ پس خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وحی کے ذریعے جزا وسزا کا قانون لوگوں کو بتایا اور جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں گے وہ مستوجب سزا ٹھہریں گے اور جو اس قانون کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں گے وہ انعاموں کے وارث ہوں گے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ o قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ o (الملک 67:8,9) یعنی جب دوزخ میں لوگوں کو ڈالا جائے گا تو ان سے دوزخ کا دربان پوچھے گا کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔

خدا تعالیٰ کی صفت عدل بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ حق وانصاف کا میزان قائم کرنے سے پہلے اپنے برگزیدہ نبیوں کی معرفت جزا وسزا کا قانون بتائے۔ خدا تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے قانون کے تحت سزا دے جس کا انہیں علم ہی نہیں۔

حیات بعد الموت کی اطلاع دین کی اغراض میں سے ایک اہم غرض ہے۔ حیات بعد الموت کا تصور انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ اطلاع وہی شخص دے سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہو۔ توحید کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انسان حیات بعد الموت پر ایمان لائے۔

......☆☆☆......

دین کے اثرات ونتائج

ہدایت وفلاح:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے آغاز میں ہی دین کا یہ اثر اور نتیجہ بیان کیا ہے کہ جو شخص دین کی تعلیم کو مان جاتا ہے تو وہ ہدایت اور فلاح پا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥ (البقرہ: 2:5,4) ہدایت ہے متقیوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو جو کچھ دے رکھا ہے ان میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان آیات میں ایمان کے دو نتائج واثرات بیان کیے ہیں۔ ھدی اور فلاح، ہدایت کے معنی ہیں۔ الاِرشَادُ الدَّلَالَۃُ بلطف اِلَی مَایُوْصِلُ اِلَی الْمَطْلُوْبِ یعنی لطف کے ساتھ لے جانا اور رہنمائی کرنا اس کی طرف جو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ امام راغب نے ہدایت کی چار اقسام بیان کی ہیں:

اول: فطری ہدایت جو عام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدائش کے ساتھ ہی عنایت فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ 20 : 50) کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی راہ) دکھائی۔

دوسری ہدایت وہ ہے جو انسان کو نبیوں کے ذریعے ملتی ہے۔ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (السجدہ 32 : 24) اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔

تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد 47 : 17) اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں وہ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔

چوتھی ہدایت منزل مقصود تک پہنچا دینا ہے۔ جیسے: سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (محمد 47 :5) انہیں منزل مقصود پر پہنچائے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

اس آیت میں ہدی سے مراد وہ راستہ ہے جو چلنے والے کو ابتدائی منزل سے چلا کر آخری منزل تک پہنچا دے۔ دین (مذہب) کو ہدی اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ دین انسان کی تمام روحانی مخفی قوتوں اور استعدادوں کی آبیاری کرتا ہے پھر اس کو زمین سے اٹھا کر نقطہ عروج تک پہنچا دیتا ہے۔ پس ایمان کا نتیجہ ہدایت ہے یعنی انسان کو روحانیت کی راہ پر ڈال کر قاب قوسین کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دینا ہے۔ اس ارفع مقام سے آگے اور کوئی مقام نہیں ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر انسان ایمان کے سایہ کے نیچے اپنی استعداد کے مطابق ہی ترقی کر سکتا ہے۔ ''قاب قوسین'' کا مقام ارفع

بنی نوع انسانوں میں سے صرف رسول کریم ﷺ نے ہی حاصل کیا تھا کیونکہ آپ ان تمام روحانی استعدادوں کے مالک تھے جو فرداً فرداً پہلے انبیاء علیہم السلام اپنے اندر رکھتے تھے۔ اسی مقام کا نام ''مقام محمود'' ہے۔

دوسرا لفظ جو دین کے لازمی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ ''فلاح'' ہے۔ فلاح کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہے۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کسان کو ''فلاح'' کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ظفر اور ادراک بغیۃ ہیں (راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب پالینا۔

جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی قوتیں ظہور میں لائی جاتی ہیں اسی طرح ایمان کے ذریعے انسان کی مخفی اور پوشیدہ استعدادیں ظاہر ہوکر اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان خدا کی صفت رحمانیت اور ربوبیت کے تحت آئے ہیں۔ جہاں بھی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان کا ذکر ہوگا ''رحمٰن'' اور ''رب'' کے الفاظ استعمال ہوں گے۔ متذکرہ بالا آیات میں بھی لفظ ''رب'' استعمال ہوا ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرہ 2 : 5) اس آیت میں لفظ ''رب'' معنی خیز ہے رب کے معنی تاج العروس اور لین انگریز لغت نویس نے پیدا کرنا، پرورش پانا، کمال تک پہنچانا، تنظیم و تکمیل دینا لکھے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ رب وہ ذات ہے جو بتدریج ایک چیز کو کمال تک پہنچاتی ہے۔

اس آیت میں لفظ رب کے تحت دین کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ یعنی رب وہ ہستی ہے جس نے انسان میں بے شمار مخفی استعدادیں رکھ دی ہیں۔ دین کے ذریعے ان تمام راہوں کو تجویز کردیا جن پر چل کر انسان اپنی مخفی استعدادوں کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ یہی ارتقاء کا مسئلہ ہے جسے ڈارون نے ایک غلط طریق سے بیان کیا ہے جس کی اصلاح سپنسر نے کی ہے۔

اس مسئلہ کی حقیقت یہی ہے کہ ایتھر کے ذرات سے لے کر انسان تک جو چیز بھی ہے وہ اپنے اندر بے شمار مخفی استعدادیں رکھتی ہے۔ انسان کی یہ مخفی استعدادیں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ''رب'' کے تحت دین کے ذریعے نشو و نما پاتی ہیں اور نقطہ کمال تک پہنچتی ہیں۔

ان تینوں الفاظ کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دین کا مقصد تکمیل انسانیت ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنا

سورۃ التکاثر میں یقین کے تین مراتب کا ذکر ہے: عِلْمُ الْيَقِين، عَيْنُ الْيَقِين اور حَقُّ الْيَقِين پہلا مرتبہ یقین دلائل علمی سے حاصل ہوتا ہے اس لیے اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جسے عین الیقین کہتے ہیں۔ تیسرا مرتبہ کسی چیز کے اندر داخل ہوجانے سے حاصل ہوتا ہے جسے حق الیقین کا نام دیا جاتا ہے۔

ان مراتب یقین کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص دور سے کسی جگہ دھواں دیکھے اور دھوئیں سے ذہن منتقل ہوکر آگ کی طرف چلا جائے چونکہ دھوئیں اور آگ میں تعلق لاینفک ہے۔ پس اس علم کا نام علم الیقین ہے پھر اگر اور آگے جائے تو آگ کو اپنی برہنہ آنکھ سے دیکھ لے۔ یہ علم عین الیقین کے نام سے موسوم ہوتا ہے پھر خود آگ کے حلقہ میں داخل ہوکر آگ کی حرارت محسوس کرے تو یہ مرتبہ حق الیقین کا ہے۔

جب خدا تعالیٰ کی ذات کا علم کانشس کے ذریعے حاصل ہوگا تو وہ علم، علم الیقین کہلائے گا کیونکہ انسان کے اندر ایک روشنی ہے جو اس کو بتاتی ہے کہ سب سے اوپر ایک اعلیٰ اور برتر ہستی ہے یہ انسانی فطرت کی شہادت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ

فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم 30:30) یعنی خدا کی فطرت جس پر دوسری آیت یہ ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق 50 : 16) اور ہم اس سے اس کی رگ وجان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی ہستی کا شعور انسان کی فطرت میں ہے لیکن جو علم فطرت سے حاصل ہوگا وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہوگا۔

اس کے بعد دوسرا مرتبہ عین الیقین کا ہے۔ اس مرتبہ کے علم سے وہ علم مراد ہے کہ ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً خدا کی ہستی کا ثبوت قرآن مجید کو ٹھہرائیں کیونکہ قرآن مجید ہر پہلو سے اعجازی اوصاف رکھتا ہے۔ جس کی مثل کوئی نہیں لاسکتا۔ قرآن مجید کا بے مثل ہونا، خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایک ٹھوس دلیل ہے، یہ علم الیقین کے نام سے موسوم ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی معرفت سے متعلق سب سے واضح اور بین شہادت دین الٰہی ہے کیونکہ دین ہی انسان کے اندر معرفت کاملہ وتامہ پیدا کرتا ہے۔ یہ علم حق الیقین کے نام سے یاد ہوتا ہے۔

اگر دنیا میں سلسلہ انبیاء جاری نہ ہوتا اور انبیاء خدا کے احکام پا کر لوگوں کو نہ بتاتے اور خدا کی طرف رہنمائی نہ کرتے تو انسان کے اندر سے خدا کے متعلق معرفت تامہ ختم ہو جاتی اور وہ اندھیروں میں خدا کی ہستی سے متعلق ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا۔ پس دین ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو خدا کی کامل معرفت دیتا ہے۔

ذریعہ علم

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام اور صفات سے آگاہ کیا۔ رسول کریم ﷺ پر سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ بھی علم سے تعلق رکھتی ہے۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (العلق 96 : 1 - 5) اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے علم دینے کی بنیاد رکھی ہے کیونکہ علم انسان کے ذہنی قویٰ کو ترقی دیتا ہے۔ علم ہی کسی قوم اور ملک کے عروج کا ذریعہ ہے اس لیے قرآن مجید میں آتا ہے: وَيَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ 58:1) اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور وہ جنہیں علم دیا گیا۔ اس آیت کریمہ میں انسان کی بلندی اور سرفرازی کا ذریعہ ایمان اور علم کو قرار دیا ہے۔ انسان کی فطرت میں طلب علم کی تڑپ پیدا کردی ہے۔ اس وجہ سے اپنے خالق حقیقی سے یہ دعا کرتا ہے: رَبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ 20 : 114) اے میرے رب میرے علم کو بڑھا۔ مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علم کی دولت انسان کو وحی کے ذریعے ہی میسر آئی۔

انسان کو بلند مقام پر کھڑا کرنا

خدا تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے انسان اشرف اور ارفع ہے کیونکہ تمام کائنات کو انسان کے لیے خادم بنایا ہے۔ گویا انسان اور باقی تمام کائنات کا رشتہ خادم اور مخدوم کا ہے اور انسان حقیقی معنوں میں اسی وقت مخدوم ہوگا جب وہ خود تو اپنے مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو اور دوسری مخلوق کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ (جاثیہ 45 : 13) یعنی آسمانوں اور زمین جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے تابع ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شرک کو گناہ عظیم کہا ہے۔ شرک کرنے سے اللہ تعالیٰ کی شان تو نہیں گھٹتی۔ اگر تمام دنیا کے لوگ بھی خدا کا شریک ٹھہرالیں تب بھی خدا کی عظمت اور بڑائی میں فرق نہیں آئے

گا۔دراصل جواللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔وہ اس وجہ سے کہ انسان خود اپنے ارفع مقام سے گر کر نیچے آ تا ہے:قرآن مجید میں آ تا ہے۔مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج 22 : 31) جو شخص (کسی کو) اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے تو گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

شرک کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے وحدانیت کا سبق دیا ہے۔اس سبق میں انسان کے لیے فوائد مضمر ہیں۔پس اگر اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعے شرک کے نقصان اور وحدانیت کے فیوض نہ بتاتا تو انسان کائنات کی ہر چیز کے سامنے جھکا ہوا نظر آ تا۔آج جو سائنس کی ترقی کے نشان نظر آ رہے ہیں وہ کبھی نظر نہ آتے کیونکہ کائنات کی اشیاء نے تو مخدوم ہونا تھا اور انسان نے خادم۔انسان نے کائنات کی اشیاء کو مقدس اور بلند خیال کر کے ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے تحقیق کا دروازہ بند کر دینا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے ذریعے انسان کو اس کا بلند مقام بتایا، پھر دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا رشتہ قائم کیا تاکہ اپنے بلند مقام سے نیچے نہ گرے۔

محاسبے کا تصور

دین نے انسان کو محاسبے کا تصور دیا ہے اور یہ بتایا ہے وہ بے کار پیدا نہیں ہوا کہ وہ دنیا میں کھائے پیئے اور چند دن گزار کر اس دنیا سے اُٹھ جائے بلکہ اس کی زندگی کا ایک ارفع مقصد ہے اور اسے اس کے ماتحت زندگی گزارنی ہے۔وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے احکام کے متعلق زندگی بسر کرے۔اسی کو قرآن مجید کی اصطلاح میں عبادت کہا گیا ہے۔یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا۔اس کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص خدا کے بتائے ہوئے احکام پر عمل نہ کرے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔آخرت میں حکم عدولی کا محاسبہ کیا جائے گا اور حکم عدولی کی سزا پائے گا۔

تکمیل شخصیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی عقل ناقص ہے جس طرح دیگر انسانی حواس کی قوتیں محدود ہیں مثلاً آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے۔اسی طرح کان کی ساعت بھی محدود ہے۔ایک حد تک انسان سن پاتا ہے اسی طرح انسان کی جو عقل ہے وہ بھی محدود ہے۔اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے احکام نازل کر کے اچھائی اور برائی کے تصور کو نمایاں کیا ہے۔اچھائی اور برائی کا تصور ہی انسان کی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً رسول کریم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے۔بعثت انبیاء سے قبل لوگ ضلالت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے،ان کی شخصیت مسخ ہو چکی تھی۔باوجود عقل رکھنے کے انسان ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔انبیاء نے خدا سے ہدایت پا کر اچھے برے کی تمیز بتائی۔عرب کے لوگ زندگی کے ہر شعبے میں گمراہ تھے۔عقل کے ہوتے ہوئے اچھائی اور برائی کی تمیز مٹ چکی تھی۔اسلام نے ان کو بتایا کون سے اعمال اچھے ہیں اور کون سے اعمال بُرے ہیں۔کون سے اعمال شخصیت کو مجروح کرتے ہیں اور کون سے اعمال شخصیت کی تکمیل۔وہی عرب جو دن رات برائیوں میں مبتلا تھے دین اسلام کی روشنی نے ان کو وہ راستہ دکھایا جس پر وہ چل کر باخدا بن گئے۔

تمدنی اثر

اگر غیر جانب دارانہ طور پر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ تمدن اور معاشرت کی بنیاد انبیاء علیہم السلام نے ہی

رکھی تھی۔انسانی تمدن کے پہلے بانی حضرت آدم علیہ السلام تھے پھر وقتاً فوقتاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری رہا۔وہ خدا سے وحی پا کر معاشرتی اور تمدنی برائیوں سے آگاہ کرتے رہے۔صالح اور اچھے اصولوں کی طرف رہنمائی کرتے رہے۔اس طرح تمدن راہ ارتقاء پر گامزن ہو گیا۔ آخر میں رسول کریم ﷺ نے تمدن کی عمارت کو مکمل کر دیا۔وہ تمام اصول بیان کر دیئے جو انسانی تمدن کے لیے ضروری تھے۔وہ اصول ہیں: اخوت، مساوات، رواداری، انصاف، صدق، دیانت و امانت، فرائض کی ادائیگی، ان اصولوں کے ساتھ معاشرے کے تمام عناصر وارکین کے حقوق و فرائض بیان کر دیئے۔اسلام نے تو اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے ایک دوسرے ملنے سونے، اور قضائے حاجت کے آداب بھی بیان کر دیئے ہیں۔اس طرح تمدن کی عمارت میں جو خوبصورتی اور رعنائی نظر آتی ہے وہ دین کے بتائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے ہے۔

گزشتہ مباحث کا ماحصل:

تاریخی شواہد سے یہ بات عیاں ہے کہ صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے بانی کے حالات ماقبل ولادت سے لے کر وفات تک محفوظ ہیں اور جو پیغام ہدایت لے کر آئے اس میں کسی قسم کی تحریف و تبدل کا گزر ہی نہیں ہوا۔وہ بالکل محفوظ اور مصئون ہے۔پہلے مذاہب اپنے اپنے دور کی انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے آئے۔ان میں عالمگیریت نہیں تھی۔صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی رہنمائی کرتا ہے اور دین کے اغراض کو پورا کرتا ہے لہٰذا اگر کوئی دین انسانیت کا دین کہلانے کا حق رکھتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔اسی میں انسانی فلاح کا راز مضمر ہے۔اس لیے جن لوگوں نے اسلام پر اعتراضات کیے ہیں یا تو وہ اسلام کی تعلیم کما حقہٗ سمجھ نہیں سکے یا محض اسلام سے بغض اور حسد کی وجہ سے اسلام پر معترض ہوئے ہیں۔اب میں معترضین کے اعتراضات کی طرف آتا ہوں اور ان کے جوابات تحریر کرتا ہوں ماتوفیقی اِلا باللہ۔اس کے ساتھ ان علمی مباحث کو بھی احاطہ تحریر میں لاؤں گا جن میں مختلف مکاتب فکر میں اختلاف ہے۔ وہ علمی موضوعات بنیادی قسم کے ہیں۔ان پر بحث کرنا ازحد ضروری ہے۔

......☆☆☆......

باب دوم:

مستشرقین اور اسلام

1- سیرت طیبہ اور مستشرقین

اسلام کے بارے میں مستشرقین (مخالفین) کا اندازِ فکر
سیرت طیبہ اور مستشرقین

رسول کریم ﷺ کے دعویٰ نبوت کے ساتھ ہی یہود اور نصاریٰ نے مشرکین کے ساتھ مل کر مخالفت کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسی مخالفت اور بے جا اعتراضات کا رد قرآن مجید میں علم المناظرہ والمباحث کے تحت کیا ہے اور یہود اور نصاریٰ کے متعصبانہ رویہ کے پیش نظر رسول کریم ﷺ کو مخاطب ہو کر فرمایا:

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ (البقرہ2 : 120)

”اور یہودی تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ اور نہ عیسائی یہاں تک کہ تو ان کے مذہب کی پیروی کرے۔ کہہ دے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور اگر تو ان کی (گری ہوئی) خواہشات کی پیروی کرے۔ اس کے بعد جو تیرے پاس علم آیا تو تیرے لیے اللہ (کی سزا) سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔“

دوسری جگہ آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (المائدہ5 : 51)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے انہیں دوست بناتا ہے تو وہ انہی میں سے ہے اور بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

ان دونوں آیات میں متعصب اور بغض وعناد سے بھرے ہوئے یہود اور نصاریٰ کا ذکر ہے۔ جو دن رات اسلام کو زک پہنچانے کے لیے کمر بستہ رہتے تھے۔

دوم یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ یہود و نصاریٰ اسلام کے روز اول سے دشمن ہیں اور اس کے پھلنے پھولنے کی وجہ سے ہر قسم کے عناد اور بے سروپا اعتراضات کی تشہیر کی کوشش میں لگتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اسلام نے اس قسم کے لوگوں سے ترک موالات کی تعلیم دی ہے۔

اسلام کے ان دشمنوں نے مختلف ادوار میں مختلف لباس پہنے اور اسلام کی بیخ کنی کے درپے رہے۔ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد خصوصاً حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ادوار میں یہی یہود و نصاریٰ تھے جنہوں نے نہایت عیاری سے مسلمانوں کے درمیان سنگ تفرقہ پھینکا تھا۔ بہرحال تاریخ شاہد ہے کہ ان دشمنوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

زیر نظر مضمون صرف مستشرقین کے بارے میں ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی اسلام دشمنی کے ماخذ کیا ہیں اور کیوں کر معرض وجود میں آئے۔

لفظ مستشرق باب استفعال سے ہے:

استشراق کے معنی مشرقی علوم میں مہارت حاصل کرنا اور مستشرق کے معنی مشرقی علوم کا ماہر اور مشرقی آداب سے آگاہ ہونا ہیں (Hans Wehy, Dictionary of Modren Written Arabic) معن زلغو مدینہ نے مغرب کے ان محققین اور علماء کو مستشرق کہا ہے جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت اور اسلامی زبانوں میں دلچسپی رکھتے ہوں (مجلہ دارالعلوم دیو بند مارچ 1988ء محمد یوسف رام پوری "تحریک استشراق ص 34, 35) ڈاکٹر عمر فروخ کے مطابق مستشرق علوم اسلامیہ کا وہ مغربی (یورپین اور امریکی) سکالر ہوتا ہے جو غیر مسلم ہو۔ (عمر فروخ، الاستشراق) مالہ۔ وما علیہ، الاستشراق والمستشرقون (عدد خاص مجلہ المنہل، عدد 471، اپریل/مئی 1989ء ص:15)

اسلام کے متعلق سب سے پہلے سینٹ جان آف دمشق (م 753ء) جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے قبل اموی دربار میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے جس نے رسول کریم ﷺ کی ذات کے متعلق من گھڑت اور نازیبا قصے لکھے، ایک منصوبے کے تحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی۔ اس نے اسلام کو (PAGAN) یعنی بت پرست مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت کے طور پر پیش کیا۔ اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر رکیک اور نازیبا حملے کیے۔ آپ ﷺ کے بارے میں مضحکہ خیز قصے گھڑے۔ وہ لکھتا ہے: "بنی اسماعیل کے درمیان محمد کے نام سے ایک جھوٹے نبی نمودار ہوئے۔ وہ تورات اور انجیل سے واقف تھے۔ ایک عیسائی راہب سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ان کی کچی پکی معلومات کے بل پر انہوں نے عیسائیت کی ایک تحریف کردہ شکل وضع کر کے پیش کر دی اور دھوکہ دے کر تسلیم کرا لیا کہ وہ خدا ترس انسان ہیں۔ پھر یہ افواہ پھیلا دی کہ ان پر آسمان سے وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں مضحکہ خیز مواد جمع کر کے انہوں نے اپنے پیروکاروں کے سپرد کر دیا کہ اس کی پیروی کریں۔ عیسیٰ اور موسیٰ کی طرح وہ اپنی وحی کی صداقت پر کوئی گواہ پیش نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی معجزہ۔ ایسے شخص کی بات پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جس نے زید کی بیوی زینب سے شادی کرنے کے لیے اپنی پسند کے مطابق وحی گھڑی (Encounters and Clashes between Islam and Christianity in History, -II, Rome) جان نے تعدد ازواج، طلاق اور دیگر مسائل کو عجیب رنگ پسندی کے ساتھ بیان کیا اور یہ اس کی کتاب DE HAERSI BUS کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔

خلیفہ مامون (813 تا 833ء) کے ایک درباری نے عبدالمسیح بن اسحاق الکندی کا قلمی نام اختیار کر کے الرسالہ کے نام سے ایک خیالی اور فرضی مکالمہ لکھا۔ مغربی محققین اور علماء نے اس کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا۔ انیسویں صدی میں ولیم نے اس کا عربی متن پروٹسٹنٹ مشنری سکول کے استعمال کے لیے 1880ء میں لندن سے شائع کیا۔ ولیم میور نے اس کا تلخیصی ترجمہ زیر عنوان The Apology of Al KINDI لندن سے 1887ء میں شائع کیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ رسالہ کے مرکزی مضامین میں رسول کریم ﷺ کی

نبوت سے انکار، قرآن مجید کا مذاق، سیرت محمدیہ کے فرضی جنسی شہوت اور جنگی جرائم مثلاً لوٹ کھسوٹ قتل و غارت اور دیگر من گھڑت افسانے شامل ہیں۔ یہ وہ جو کتب ہیں جو مستشرقین کے خیالات کا ماخذ اور مصدر بنیں۔

آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے آغاز میں عروج اسلام پر تھیوسوفین (758 - 818ء) نے کرانکل لکھی۔ اس تاریخ "The chronicies of the Dsophane the Confessor" کو اناسٹیسٹس Anastastus نے اپنی تاریخ کلیسا کا حصہ بنالیا۔ کرانکل دراصل عہد وسطیٰ (Middle Ages) میں شائع شدہ خرافات اور من گھڑت کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ اور حیران کن حصہ وہ ہے جس میں رسول کریم ﷺ کی تعلیمات سے بحث کی گئی ہے۔ موصوف نے یہ بات ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے کہ محمد ﷺ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کو امی ٹھہرانا افتراء کذب کے مترادف ہے۔ اس کا واضح مقصد یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کر دیا جائے تو یہ دعویٰ خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے یہود اور عیسائی الہامی کتب کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے۔ ان کی مسخ شدہ معلومات کو اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔ کہانی اس لیے وضع کی گئی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی اسلام کا اصل ماخذ اور مصدر ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل (867 - 886ء) کی فرمائش پر ایک بزنطینی مولف نے رسول کریم ﷺ کے خلاف ایک کتاب (Refutatio Mohammad) تحریر کی۔ جس میں آپ ﷺ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا۔ قرآن مجید کو جھوٹ اور خرافاتی کہانیوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کے عقیدۂ توحید (لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ) کا مذاق اڑایا اور مسلمانوں پر یہ الزام دھرا کہ ان کا خدا کی پرستش سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام چونکہ عیسیٰ بن مریم کے عقیدہ کا حامی ہے اور یہ عقیدہ عیسیٰ ابن مریم کی تردید کرتا ہے اس لیے مولف کے نزدیک اسلام اور اس کا پیغمبر سب کاذب اور جھوٹے ہیں۔

مستشرقین کا جو گروہ ہسپانیہ میں پیدا ہوا وہ بھی ان ہی باطل مصادر کا پیروکار رہا ہے اور اسلام کے اصل ماخذوں کو انہوں نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ حالانکہ ہسپانیہ میں نو سو سالوں تک مسلمان خلفاء نے حکومت کی۔ ان مستشرقین نے بھی کرانکل اور دیگر خرافات سے پر کتب ہی اپنی تصنیفات کی بنیاد رکھی۔

قرطبہ کے پوپ Steuiogius نے اپنی تصنیف "Liber Apologeticus Mar Lirum" کی بنیاد کرانکل اور لاطینی مسودات اور مخطوطات پر رکھی۔ اس نے خود اعتراف کیا کہ اس نے رسول کریم ﷺ اور اسلام کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب بھی محض خرافات کا پلندہ ہے۔ دوسرے ہسپانوی محقق اور عالم سان پرڈو پاسکل (San Perdo Pàscal) کی تالیف (Sobre Elsetonnanometana) کندی کے رسالہ کا چربہ ہے چونکہ مسلمانوں نے نو سو سال تک اسپین پر حکومت کی اور وہ حکومت عیسائی اپنے لیے ایک عذاب سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی نظر میں اسلام عیسائیت کا بدترین دشمن ہے۔ یہی نفرت ان کی تالیفات میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ونسنٹ ڈی بیوس (م 1264ء) نے ان تمام خرافات کو اپنی تالیف (Speculam Historicale) میں جمع کر دیا۔ رسول کریم ﷺ کو (نعوذ باللہ) ایک...... (Pagan) ذلیل (Low Bora) ثابت کیا ہے۔ انہوں نے بھی وہ الزام دھرا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اسلام بزور شمشیر پھیلایا اور وحی کے نام پر فریب کاری کی اور عوام کو دھوکا دیا۔

تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز صلیبی جنگوں کے بعد ہوتا ہے۔ صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سال جاری رہیں۔ یہ جنگیں صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہب کا رنگ دھار گئیں ان میں یورپ کے بادشاہوں اور کلیسا دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1099ء میں پہلی خون آشام صلیبی جنگ ہوئی، دوسری صلیبی جنگ 1147ء میں لڑی گئی۔ تیسری صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین اور شاہ انگلستان رچرڈ کے درمیان 1189ء سے 1193ء تک جاری رہی۔ چوتھی صلیبی جنگ 1205ء 1204ء کے درمیان لڑی گئی اور پانچویں جنگ 1217ء میں ہوئی چھٹی

صلیبی جنگ 1239ء میں ہوئی۔ جب صلیبی جنگیں مسلمانوں کو زیر کرنے میں ناکام ثابت ہوگئیں تو اہل صلیب نے منگولوں کے ساتھ عسکری اتحاد 1239ء اور 1250ء کے درمیان قائم کیا۔ اس اتحاد کے نتیجہ میں سقوط بغداد کا سانحہ 1258ء میں پیش آیا۔ آٹھویں صلیبی جنگ 1271ء میں لڑی گئی۔ نویں صلیبی جنگ 1365ء اور آخری جنگ 1464ء میں ہوئی۔ ان پانچ صدیوں میں یورپ کے پادریوں، شاعروں، ادیبوں اور مفکرین نے اسلام کے خلاف مسیحی لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ جنگوں کو مذہبی رنگ دیا۔ درجہ شہادت حاصل کرنے کے لیے اکسایا۔ صلیبی جنگوں پر سٹی ون رنسی مان Steven Runciman کی تین جلدیں قابل مطالعہ ہیں۔ ہلاکو کی زوجہ خاصہ (Chief wife) ایک عیسائی خاتون تھی۔ جو مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے فوجیوں کو ابھارتی رہی سقوط بغداد کے وقت وہ بھی ہلاکو کے ساتھ تھی۔ ہلاکو کا بڑا قابل اعتماد جرنیل Kowtabuga بھی نستوری عیسائی تھا اور بغداد کی مہم میں شریک تھا۔ بغداد کی تاراجی کے بعد اسی ہزار افراد قتل کیے گئے۔ (رنسی مان کی جلد دوم صفحات 246 تا 400 فلسطین اور بین الاقوامی سیاست باب چہارم ص 176 تا 283 مصنفہ پرویز سید حبیب الحق ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ)

صلیبی جنگوں میں شکست اور مشترکہ عسکری قوت کے خاتمہ کی وجہ سے اہل یورپ ملت اسلامیہ اور اسلام کی نفرت اور غصے کی آگ میں جلنے لگے۔ اسلام کے خلاف نفرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ نثر نگار اور شعراء دونوں میدان مبارزت میں اتر آئے۔ جتنا بھی کسی کے قلم میں زور تھا اس کو استعمال میں لایا اور عجیب وغریب قسم کی خرافات صفحہ قرطاس پر لائی گئیں۔ 1141ء میں پیٹر (Peter the venerable) نے چند عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے۔ رابرٹ (Robert) اور ہرمن نے چار عربی کتب کے تراجم کیے جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے جو خرافات، کذب بیانی اور جہالت سے پُر تھے۔ پیٹر کی سیرت النبی ﷺ پر بھی ایک مستقل تصنیف بعنوان "Laviede Mahomet" ہے جس میں دل کھول کر رسول کریم ﷺ کے خلاف اپنے بغض وعناد کا اظہار کیا۔ پیٹر کی کتب نے یورپ میں اسلام کے خلاف مخالفت کا ایک نیا باب کھول دیا۔ نثر اور نظم دونوں اصناف میں مخالفانہ ادب معرض وجود میں آنا شروع ہوگیا۔ والٹر (Walter of sens) نے لاطینی زبان میں الیگزینڈر (Alexander Duport) نے فرانسیسی زبان میں معاندانہ ادب پیدا کیا۔ ایک شعری مرثیہ گیارہ سو بیالیس اشعار پر مشتمل زیر عنوان Avila Muhamitl لکھا گیا، اسے بارہویں صدی کے شاعر امبری کوف (Embricoof Maime) کے نام منسوب کردیا گیا۔ بعضوں نے اس مرثیہ کو ہلڈوبرٹ (Hildobert of Tours) کے نام منسوب کردیا۔ یہ مرثیہ (نعوذ باللہ) غلاظت، کذب بیانی، افتراء اور خرافات سے پُر ہے۔ اس قسم کی شعری سیرت "او یٹودی محمد" جو 1090 صفحات پر مشتمل تھی، معرض وجود میں آئی۔ نثری اور شعری سیرت کے ساتھ ساتھ صلیبی جنگوں پر تالیفات آنی شروع ہوگئیں۔ چنانچہ مشہور مصنف گلبرٹ (Guilbert of Nogent) نے پہلی صلیبی جنگ پر ایک کتاب زیر عنوان گستا (Giesta Dei Der Frahceo) لکھی جو 1112ء سے قبل مکمل ہوگئی۔ اس میں رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ پر ایک باب ہے۔ از منہ وسطی میں جو خرافات لکھی گئی تھیں ان کی مکمل طور پر آئینہ دار ہے اور عجیب عجیب داستانیں گھڑ کر پیش کی گئیں۔ ایک کہانی پڑھنے کے لائق ہے۔ مولف لکھتا ہے کہ الگونڈریا (Alexandri) کے پیٹر یارک (Patriarch) کا الیکشن ہونے والا تھا۔ اس انتخاب میں حصہ لینے والا پادری اپنے انتخاب سے مایوس ہوگیا تو اس نے چرچ کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ بنایا اور محمد ﷺ کے ساتھ ساز باز کی اور عیسائیت میں تفرقہ ڈالنے کے لیے محمد ﷺ کو تربیت دی اور آپؐ کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہؓ سے کروا ڈالی اور پادری نے محمد (ﷺ) کی حمایت کی اور ان کی نبوت کا اعلان کیا تاکہ عیسائیت پر کاری ضرب پڑسکے۔ اس طرح محمد (ﷺ) نبی بن گئے اور مذہب اسلام کی دعوت دینی شروع کردی۔ اس طرح مسیحیت میں تفرقہ پڑ گیا۔

اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ بیان کی گئی کہ محمد (ﷺ) خود پادری (Cardinal) تھے اور پوپ کے مرتبہ پر ترقی پانے کے

امیدوار تھے مگر جب انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو روم سے بھاگ کر عرب آ گئے اور وہاں دعویٰ نبوت کر دیا۔

ایک روایت کے مطابق یروشلم کے بشپ سرگیس (Sergius) نے محمد (ﷺ) کو نبوت کے دعویٰ پر آمادہ کیا اور ان کے لیے قرآن نامی کتاب لکھی۔

قارئین اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان مستشرقین نے اپنی کتب کو کس قسم کی خرافات سے مزین کیا ہے۔ جن کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

1271ء میں ولیم (William of Tropoli) نے رسول کریم (ﷺ) کی حیات طیبہ پر کتاب لکھی۔ جس میں خرافات کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اس دور کے مستشرقین میں صرف دو ایسے مصنف نظر آتے ہیں جو ایک حد تک گمراہی کے طریقے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ ہیں William of Mal Mesbury اور الفونسو (Alfonso)۔

اطالوی شاعر دانتے (Dante) (1268 - 1321ء) جو اپنے دور کا روشن خیال اور وسیع المشرب شاعر اور اٹلی کی نشاۃ کا بانی مبانی خیال کیا جاتا ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اس کا کردار نمایاں ہے اس کی مشہور نظم (The Divine Comedy) نشاۃ ثانیہ کی مشعل راہ خیال کی جاتی ہے۔ موجودہ تحقیق کی روشنی میں شاعر نے احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے۔ دوم ابن العربی کی کتاب فتوحات مکیہ اور المعری کے رسالہ المغفر ان سے بھی فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔

اس نظم کا وہ اقتباس نہایت ہی شرمناک ہے جس میں رسول کریم ﷺ کا ذکر آیا ہے۔

دانتے پر صلیبی جنگوں کی شکست کا بہت ہی گہرا اثر ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے دل میں اسلام کے خلاف شدید نفرت اور بغض تھا۔ اس نے اپنے بغض کو الفاظ میں لا کر یورپ کو ہلا دیا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد ایک نئی رومانی تحریک نے جنم لیا۔ اس نے رومی اور یونانی تہذیب کی کہنہ زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور ایک نئی یورپی تہذیب کی سحر نمودار ہوئی۔ مذہبی تعصب، تنگ نظری، رجعت پسندی کے خلاف نئے مکتبہ ہائے فکر معرض وجود میں آئے۔ اس روشن خیالی کے باوجود اسلام کی تعبیر و تفسیر لاطینی مصادر کے مطابق ہی کی جاتی رہی۔ کیونکہ وہ مواخذ اور مصادر یورپین کے نزدیک آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے اور ان پر نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ کو ملحد اور بے دین گردانا گیا اور بزعم خویش محمد (ﷺ) نے عیسائیت میں تفرقہ ڈالا تھا اس لیے آپ ؐ کو عیسائیت کا ازلی دشمن قرار دیا گیا۔ (معاذ اللہ)

انگریزی ادب کے باوا آدم چاسر (1340 - 1400ء) کی ایک نظم میں رسول کریم ﷺ کو (Termagent) کے نام سے متعارف کیا گیا۔ جس کی تشریح یہ ہے وہ (نعوذ باللہ) وہ بت ہے جسے مسلمان پوجتے ہیں۔ سولھویں صدی کے ایک مشہور ڈرامہ نویس مارلو (Marlowe) (1564 .... 1593ء) نے اپنے ڈرامے (Tamburlaine) سے رسول کریم ﷺ کی نعش مبارک کے متعلق ایک خیالی افسانہ گھڑا۔

انگریزی ادب کی دو ممتاز شخصیتوں شکسپیئر (Shakespeare) (1564 - 1616ء) اور لارڈ بیکن (Lord Bacon) (1561 - 1626ء) نے بھی سیرت طیبہ پر خامہ فرسائی کی۔ لیکن یہ بھی جہالت، تعصب اور تنگ نظری کے پردہ سے باہر نہ نکل پائے۔

استعماریت کا دور

سترہویں صدی استعماریت کے عروج کی صدی ہے۔ عالم اسلام انگریز، ہالینڈ اور فرانس کے پنجہ اسیری میں آ چکا تھا۔ اس لیے نئے نئے مسائل رونما ہو چکے تھے۔ یورپین اقوام کو اسلامی کلچر اور عوام سے براہ راست سابقہ پڑا۔ مستشرقین سیاحوں نے مسلم ممالک میں جو دیکھا اور پایا وہ لاطینی اور بزنطینی مصادر کا ضد تھا۔ مزید برآں لوٹ مار سے اسلامی علوم کے مصادر، مسودات اور مخطوطات یورپ کی لائبریریوں کی زینت بن گئے۔ جب یہ علمی خزانہ زیر مطالعہ آیا تو صحیح حقائق سامنے آنے لگے۔ 1649ء میں قرآن مجید کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شائع ہوا۔ 1636ء میں بڑھتی ہوئی علمی سرگرمیوں کے زیر اثر کیمبرج یونیورسٹی میں عربی چیئر قائم ہوئی۔ اسی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی عربی علوم کی تدریس شروع ہوگئی۔ جامعات میں عربی علوم کے صدر اسلام دشمن مشنری تھے جن میں میک براڈ اور لی مشہور ہیں۔

جامعات میں عربی علوم پڑھانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کے اصلی مصادر کو پڑھا جائے اور حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یورپ میں وقفے وقفے کے بعد نئی نئی تحریکات جنم لے رہی تھیں۔ انہی تحریکوں میں لوتھر کی تحریک تھی۔ جس نے چرچ اور چرچ کی غلط رسومات پر ایک کاری ضرب لگائی۔ لیکن ایک مذہبی مصلح ہونے کے باوجود رسول کریم ﷺ کا دشمن رہا اور آپ (ﷺ) کو گاگ اور میگاگ (Gog - Magog) قرار دیا۔ اسی طرح آپ کو ﷺ کو عیسائیت کی تباہی کا ذمہ دار گردانا۔

سترہویں صدی میں مشہور مصنف بیڈول (Bed well) (م 1632ء) نے اپنی تصنیف (نعوذ باللہ) ''محمد کاذب'' میں رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر گستاخانہ حملے کیے۔ جین برڈ (Gane Bard) نامی کیتھولک مصنف نے یہ الزام لگایا کہ قرآن مجید کی تالیف کسی مہذب زبان لاطینی، عبرانی اور یونانی میں نہیں کی گئی بلکہ ایک وحشی زبان میں کی گئی اور رسول کریم ﷺ (العیاذ باللہ) خود ایک وحشی درندے تھے۔ اس لیے قرآن کو اسی زبان میں تحریر کیا۔ اینڈری (Andre) نے چند عربی کتب کے انگریزی ترجمے کیے۔ ساتھ ہی 1949ء میں قرآن مجید کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ بھی کیا۔

سترہویں صدی کی سیرۃ طیبہ پر مشہور کتب میں سے ہمفری پری ڈیکس کی کتاب "The True Name of imposture fully displayed in the life of Muhomet" ہے۔ یہ کتاب 1692ء میں شائع ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اگلے سال فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ہمفری اکسفورڈ یونیورسٹی سے عبرانی کے استاد ہونے کے علاوہ کرائسٹ چرچ کے ڈین جیسے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ اس کتاب کے مصادر بھی قرون وسطیٰ کی مذکورہ کتب تھیں۔ پرانی شراب نئی بوتل میں ڈال دی گئی۔

اس دور میں ایک مستشرق پیکاک (Edward Peacoke) پرانی ڈگر سے ہٹ کر لکھنے والا نظر آتا ہے۔ اس نے رسول کریم ﷺ کی سیرت پر نظر ثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا۔ اٹلی کے مستشرق پادری (Abb) نے قرآن مجید کا لاطینی ترجمہ کیا۔ اپنی کتاب "Prodomiusad Rufutationem" میں اسلام پر نہایت رکیک حملے کیے اور رسول کریم ﷺ کو کاذب نبی قرار دیا۔ اسی دوران ایک اور ممتاز سیرۃ نگار سائمن آکلے (Simon Ockley) (1678 - 1720ء) گزرے ہیں۔ یہ بھی کیمبرج یونیورسٹی کے استاد اور کلیسا کے عہدے دار تھے۔ موصوف نے The History of Saracens تصنیف کی۔ اس میں بطور ضمیمہ (The Life of the Prophet) شامل ہے۔ جس میں مصنف نے مشرقی کلیسا کی تباہی کا باعث حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قرار دیا ہے۔ سترہویں صدی میں الیگزینڈر راس (Alexander Ross) نے اپنی تصنیف پنڈبلیا (Pandeblia) 1653ء میں تقابل ادیان پر لکھی اور پرانی ڈگر سے ہٹ کر اسلام کے بارے میں چند اچھے کلمات لکھے۔ پادری چپلن (Chaplain) مسمی Addison (Addirson) نے کتاب ''حیات و

وفات محمدؐ (Life and Death of Muhammad) 1678ء میں لندن سے شائع کی۔ اس کے مصادر بھی لاطینی خرافات تھے اور بڑا اعتراض یہ کیا کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن مجید شائع نہیں کیا۔

موئیس نیور کولی اپنی کتاب ''دین حق کی جستجو'' میں رقمطراز ہے: ''مشرق میں ایک نیا دشمن پیدا ہوا یعنی اسلام جس کی بنیاد ہی طاقت کے استعمال اور بے انتہا تعصب پر ہے۔ محمد (ﷺ) نے اپنے متبعین کو تلوار دی، مقدس اخلاقی روایتوں کا کوئی لحاظ نہ رکھا، اپنے پیروکاروں کو بدی اور غصب ونہب کی اجازت دی۔ جنگ میں ہلاک ہونے والوں سے جنت میں دائمی لطف ولذت کے وعدے کیے۔ کچھ ہی عرصہ میں ایشیا کوچک، افریقہ اسپین ان کا شکار ہو گئے۔ اٹلی تک ان سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس آندھی سے نصف فرانس اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ شہر میں یہ آفت آ چکی تھی مگر مسیحیت نے شارلیمان کی تلوار سے بواتیہ کے پاس (752ھ) اسلام کی فتوحات کا راستہ مسدود کر دیا پھر تقریباً دو صدیوں (1099ھ تا 1254ھ) تک صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یورپ ہتھیاروں سے لیس ہو گیا اور مسیحیت کو نجات ملی۔ صلیبی پرچم کے سامنے ہلالی (حربی) قوت پسپا ہو گئی۔ انجیل کو قرآن اور اس کی عام اخلاقیات پر فتح نصیب ہوئی۔ (1)

موسیو کیموں اپنی کتاب ''مائتھالوجی آف اسلام'' میں لکھتا ہے: ''محمدی ایک کوڑھ ہے جو لوگوں میں پھیلا اور ان کو تباہ کرتا چلا گیا بلکہ خوف ناک مرض، ایک عمومی فالج اور دماغی خلل ہے جو انسان میں کاہلی اور پژمردگی کو جنم دیتا ہے اور ان میں اگر خوابیدگی پیدا ہوتی ہے تو صرف خون ریزی اور شراب نوشی کے لیے اس لیے وہ برائیوں کے عادی بن جاتے ہیں۔ مکہ میں محمد ﷺ کی قبر کیا ہے؟ ایک بجلی گھر ہے جو مسلمانوں کے اذہان میں دیوانگی پھیلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان پر جب ہسٹریائی دورے پڑتے ہیں تو دماغی جنوں میں اللہ اللہ کا ورد شروع کر دیتے ہیں اسلام چند باتوں کو انسان کی فطرت ثانیہ بنا دیتا ہے جیسے لحم خنزیر اور شراب موسیقی سے نفرت، اور طبائع کو سختی اور حیات پرتعیش کا عادی بنا دیتا ہے۔ (2)

جولیلیان اپنی کتاب ''تاریخ فرانس'' میں رقمطراز ہے: ''مسلمانوں کے مذہب کے بانی محمد (ﷺ) نے اپنے متبعین کو حکم دیا ہے کہ دنیا کو زیر کرتے ہوئے تمام مذاہب کی جگہ اسلام کو نافذ کریں۔ ان بت پرستوں اور عیسائیوں میں کتنا فرق ہے، عربوں نے طاقت کے زور پر مذہب کو مسلط کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ اسلام قبول کر دیا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ (جب کہ) متبعین مسیح نے نیکی اور حسن سلوک کے ذریعے سکون بخشا۔ اگر ہم پر عربوں کا غلبہ ہو جاتا تو دنیا کا کیا حال ہوتا؟ تب تو ہم بھی الجزائر اور مراکش کے لوگوں کی طرح مسلمان ہوتے۔ (3)

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب ''عالمی عیسائی مشنریوں میں پیش رفت'' جو 1940ء میں نیویارک سے شائع ہوئی) میں لکھتا ہے ''محمد کی تلوار اور قرآن کی تہذیب سچائی اور حریت کے سب سے بڑے دشمن یہی ہیں۔ یہ ایسے تباہ کن عوامل ہیں جن سے دنیا اب آشنا ہے۔ (4)

قرآن پلندہ ہے نیم سچائیوں بے سروپا کہانیوں اور مذہبیات کا جو تاریخی غلطیوں اور بے بنیاد افسانوں کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ مزید براں اس میں اس قدر ابہام ہے کہ تفسیر کے بغیر کوئی اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے، بے نیاز ہے، وہ کسی کا باپ نہیں وہ کسی کی اولاد نہیں، یہ بھی ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ہی بادشاہ ہے، زبردست اور غالب ہے مگر اس کا مخلوق اور رعایا سے کوئی رشتہ نہیں'' (5)

ڈاکٹر گلوور اب رسول کریم ﷺ کی ذات کو ہدف بناتے ہوئے لکھتا ہے: ''محمد ایک مطلق العنان حاکم تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کا حق ہوتا ہے کہ رعایا اس کی خواہشات کی پیروی کرے یہ خیالات ان کے دل ودماغ پر پوری طرح مستولی تھے۔ ان کا یہ عزم تھا کہ ایسے تمام لوگوں کا سر قلم کر دیا جائے جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہوں۔ ان کا عربی لشکر تہدید دینے اور ظلم وزیادتی کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ رسول (ﷺ) نے ان کو ہدایت دی تھی کہ ہر اس شخص کو قتل کر دیا جائے جو ان کی بات ماننے سے انکار کر دے اور ان کے رستہ پر چلنے کے لیے تیار نہ ہو۔ (6)

سفاری جس نے 752 میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا یہ لکھتا ہے کہ "محمد (ﷺ) نے خداوندی اقتدار کا سہارا لیا کہ لوگ اس عقیدہ کو تسلیم کریں۔ چنانچہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ لوگ ان کو خدا کا رسول تسلیم کریں ان پر ایمان لائیں حالانکہ یہ جھوٹا عقیدہ انہی کی عقل کا پیدا کردہ تھا۔" (7)

(مذکورہ بالا معلومات کے لیے دیکھیے محمد البہی : الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی ص 507)

گریوے باؤم نے حجر اسود کے بارے میں تحریر کیا کہ کعبے کے پرستاروں کے لیے حقیقی کشش ایک یہ سیاہ پتھر میں تھی۔ یہ قدیم الایام پتھر اس کی دیواروں میں نصب تھا۔ رسول کریم ﷺ کو بادل نخواستہ اس پتھر کے تقدس و احترام کو اسلامی رسوم میں جگہ دینا پڑی جہاں وہ اب بھی اس امر کا ثبوت کے طور پر موجود ہے کہ اسلام قدیم رسوم سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہا (Mediaeval Islam P: 68.)

نکلسن:

نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن پر دیباچہ تحریر کیا جس میں رسول کریم ﷺ کے خلوص کو تو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر قارئین کا ذہن زہر آلود کر دیتا ہے کہ جب حالات کے جبر کے تحت پیغمبر ایک حکمران اور قانون ساز بن گئے تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت ہے کہ وہ خود کو الٰہی پیغامات کا منتخب ذریعہ سمجھے۔

When by force of circumstances, the prophet in him had grown into the ruler and legislater, it was a psychological necessity he should still feel himself to be chosen meduim of the divine message (Introduction to the Quran by E.H. Palmer)

ویبر:

ویبر انیسویں صدی کا مشہور مستشرق ہے، موصوف کو مکی زندگی میں رسول کریم ﷺ میں نبوت کی رمق نظر آتی ہے جب کہ مدنی زندگی میں اس شان سے خالی نظر آتے ہیں اور آپ کی عظمت سیاسی اور فوجی قوت کی مرہون منت ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مدینے میں ان کی حیثیت اطالیہ کے پودستا (شہر کا حکمران اور جینوا کے کالون (پروٹسٹنٹ فرقے کا ایک دینی ناظم) کے بین بین تھی۔ جس نے بنیادی طور پر ان کے خالصتاً پیغمبرانہ نصب العین سے نمو پائی تھی۔ وہ ایک تاجر اور مکہ میں پرہیزگارانہ اجتماعات کے قائد تھے۔ یہاں تک انہوں نے واضح طور پر سمجھ لیا کہ جنگجو قبائل کی حصول مال غنیمت میں دلچسپی کا لحاظ، ان کے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔

اٹھارویں صدی

اس صدی میں مستشرقین نے اسلام کے حقیقی مصادر کا براہ راست مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ گو مجموعی طور پر مستشرقین کا رویہ اسلام کے بارے میں معاندانہ ہی تھا اور تعصب کے دائرے سے باہر نکل نہ پائے اور لاطینی روایات کے قائل ہی رہے۔ بعض ایسے مصنف بھی پیدا ہوئے جن کے رویہ میں نمایاں تبدیلی تھی۔ ان میں سے ایک ڈچ مستشرق ایچ ریلان تھا۔ اپنی تصنیف "مذہب محمد" (De - Religion Mahomedica) جو 1704ء میں منصۂ شہود پر آئی جس میں اسلام اور بانی اسلام کے ساتھ انصاف اور رواداری برتی اور مستشرقین پر زور دیا کہ وہ اسلام کے حقیقی مصادر کی طرف رجوع کریں۔ یہ پہلا مصنف ہے جس نے واضح طور پر لکھا کہ یورپ میں اسلام کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور یہ بات زور دے کر کہی کہ اسلام کو صحیح سمجھنے سے عیسائیت کا ہی فائدہ ہے۔ اس تصنیف نے مستشرقین کے اذہان کو ضرور متاثر کیا۔ کاؤنٹ (Count) نے کتاب (Vie De Mahomet) 1930ء میں لندن سے شائع کی۔ اس میں واضح طور پر اسلام اور رسول کریم ﷺ کے متعلق رویہ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ مصنف نے اسلام کو ایک عقلی مذہب قرار دیا اور رسول کریم ﷺ کو ایک سچا نبی تسلیم کیا۔ اس میں اسلام کے خلاف یورپ کے بوسیدہ عقائد اور بازنطینی خرافات کی نفی تھی۔ کاؤنٹ کے خلاف تحریک چل پڑی۔ سیل اور راڈویل نے شدت کے

ساتھ اسلام کے مخالف بازنطینی خرافات کو بنیاد بنا کر رسول کریم ﷺ کو کاذب نبی اور اسلام کو مفسد مذہب قرار دیا جین گیگنٹر (Jean Gagenter) نے دو کتب لکھیں۔ ایک 1733ء میں اور دوسری 1748ء میں شائع ہوئی۔ جس کے ذریعے کاؤنٹ کی کتاب کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی گئی اور کاؤنٹ کے بالمقابل اپنی تصنیف اسی نام سے 1738ء میں ایمسر ڈیم سے شائع کی۔ مؤلف نے (العیاذ باللہ) مقدمہ میں رسول کریم ﷺ کو انسانیت اور خدا کا دشمن قرار دیا۔

جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلم ممالک پر یورپین غلبہ کی وجہ سے مسلمانوں سے رابطے، یورپ میں علوم جدیدہ کے احیاء، روشن خیالی اور اسلام کے حقیقی مصادر کے براہ راست مطالعہ سے مستشرقین کے اذہان میں ضرور تبدیلی آئی۔ مزید برآں خال خال حقیقت پسند علماء بھی پیدا ہو گئے۔ جن کی تحریرات نے قدیم باطل نظریات کی نفی کی۔ انہی حق پسند مستشرقین میں سیوری (Savery) بھی ہے۔ موصوف نے 1752ء میں قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ کیا اور اس میں رسول کریم ﷺ کی مختصر سوانح بھی لکھی۔ آپ ﷺ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت قرار دیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کو سچا نبی تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ رسول کریم ﷺ نے عقیدہ توحید یہودیت اور عیسائیت سے مستعار لیا ہے۔ ایڈورڈ گبن (Edward Gibgon) جس نے زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ 1710ء میں کتاب مذکورہ کے پچاسویں باب میں اسلام اور محمد ﷺ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا اور رسول کریم ﷺ کو (العیاذ باللہ) کاذب نبی قرار دیا۔ مزید برآں یہ بھی لکھا کہ آخری عمر میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی کا شکار ہو گئے اور محمد ﷺ ظلم، فریب کاری اور ناانصافی کے پیکر تھے اور اسلام بزور شمشیر پھیلا۔

اٹھارویں صدی کی ایک اور روشن خیال اور انقلابی شخصیت والٹیر (Voltare) ہے۔ اپنے اندر انقلابی اور روشن خیالی روح رکھنے کے باوجود اسلام اور محمد ﷺ کے متعلق فرسودہ اور باطل نظریات سے نجات نہ پا سکا۔ اپنے دور کا یہ وہ شخص ہے جس کے خیالات سند کے طور پر تسلیم کیے جاتے تھے۔ یہ شخص بھی اسلام دشمنی کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکا۔ اس نے اپنے ڈرامہ (Play) دین محمد مسمّٰی (Le Fanatlsme ou Mahomat laprophets) جو 1743ء میں شائع ہوا میں اسلام کے خلاف لکھا اور ان مصنفین کی مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمد ﷺ کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا۔ اس نے بھی بازنطینی ماخذ پر بنیاد رکھ کر رسول کریم ﷺ کو کاذب نبی (العیاذ باللہ) اور مسلمانوں کو وحشی قصہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اپنے مقالات (1756ء) میں بھی والٹیر نے رسول کریم ﷺ اور اسلام سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ والٹیر اپنے دور کا ایک عظیم مفکر گردانا جاتا تھا۔ اس کے قلم سے لکھے ہوئے الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ مستشرقین کے قلوب و اذہان میں اسلام کے خلاف اور نفرت پیدا ہو گئی۔ ان میں سے ایک ڈیڈراٹ (Diderat) ہے۔ جس نے رسول کریم ﷺ کی ایک بدنما سیرت پیش کی۔ رسول کریم ﷺ کو (العیاذ باللہ) شہوت پرست، حسین عورتوں کا دلدادہ قرار دیا اور اسلام کو عقل کا دشمن ثابت کیا۔ اس طرح فرانسیسی مستشرق رینان (1832ء تا 1892ء) (Rennan) نے بھی اسلام کو عقل کا دشمن مذہب قرار دیا۔

انیسویں صدی

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے انیسویں صدی کے مستشرقین پر نظر دوڑاتے ہیں۔ اس صدی کا مشہور مصنف لارڈ میور ہے جس نے سیرۃ طیبہ پر (Life of Muhammad) لکھی اور مستشرقین کی تمام کتب سے زیادہ اس کتاب کو شہرت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ مصنف کی زندگی میں ہی اس کے تین ایڈیشن ختم ہو گئے۔ اس کتاب کا انداز بھی اسلام دشمنی تھا۔ دل کھول کر رسول کریم ﷺ کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کے خلاف لکھتا ہے:

The sword of Muhammad and the Koran, are the most stubborn enemies of Civilisation, Liberty, and Truth which the world has yet known.

پھر رقم طراز ہے کہ: ''محمد (ﷺ) کو (معاذ اللہ) خود اپنی ہی وحی پر وحی یقین نہ تھا۔

(Life of Mohamet vol 1, P : 142)

سرسید نے اپنی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' میں لارڈ میور کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا ہے۔ اسی دور کا ایک مشہور سیرت نگار سپرنگر (Aloys Sprenger) ہے۔ اپنی تصنیف "Das Lebenunddie Leherdes Mohammed" میں اسی پرانے اعتراض مرض ''صرع'' پر زور دیا ہے اور نبوت اور وحی کا مفہوم طبی اصطلاحات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں اس نکتہ پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا پیغام سوائے عصری حسیت کے اور کچھ نہیں۔

مستشرقین میں سے ہنری لیمنس (1937ء - 1862ء) مشہور سیرت نگار ہے اس کی سیرۃ پر کئی کتب ہیں۔ جن میں سے چند ایک نام حسب ذیل ہیں:

1- Quran et tradition comment fut composee la vie de Mahomet Rechereches de science religieuse (1910)

2- Mahomet fut-Il sincere (1911) 1,11

3- L'aage de Mahomet et is chornologie de la sira, Journal Asiatique (1911) XVII

4- Fatima et less filles de Mahomet, notes critiques pourl' etude de la sira (Rome 1912)

موصوف مشنری رسالے ''البشیر'' کا مدیر تھا۔ مشنری ہونے کے ناطے رسول کریم ﷺ کو عیسائیت کا دشمن قرار دیتا ہے۔ تعدد ازدواج پر اپنے تعصب اور بغض کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اپنی تصنیف (Republique Marachande) کے ذریعے سیرت نگاری کو ایک نیا رنگ دیا۔ اس تصنیف میں موصوف نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب معاشرتی، سیاسی، معاشی لحاظ سے منتشر تھا۔ حالات اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ کوئی مصلح اٹھے جو عرب میں اتحاد پیدا کرے چنانچہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر آپؐ نے مختلف قبائل کو ایک پرچم کے تلے جمع کر کے عرب قومیت کو فروغ دیا۔ الغرض اسلام محض سماجی یا سیاسی اور معاشی عزائم پر مبنی ایک ایسی تحریک ہے جس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک مشہور اور نمایاں نام جرمن مستشرق Heirrich Grimme ہے۔ اس نے بھی عرب کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"The conditions under which ...... socialistic movements appear were existent in Mecca at the time of Mohammad. A wealthey class ...... stood over against a numerous propertyless class who were suffering.

انیسویں صدی میں رسول کریم ﷺ پر اعتراضات کی نوعیت بدل گئی اور اسلام کو محض عرب کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار قرار دیا گیا۔ قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کوئی ایسا دین نہیں ہے۔ اسی نکتہ کو بیسویں صدی میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر گب (H.A.R. Gilb) نے مزید آگے بڑھایا ہے۔ اپنی تصنیف (Mohammadanism) کے آغاز

میں لکھتا ہے۔

Muhammad succeeded because he was a Meccan" (P.26)

موصوف مستشرق کے نزدیک مکہ ایک تجارتی شہر تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی جس وجہ سے اخلاقیات کا کوئی نام نشان نہ تھا۔ سماجی اور اخلاقی جرائم عام تھے۔ محمد ﷺ نے ان حالات کے پیش نظر ایک سماجی تحریک کا آغاز کیا۔ غرباء طبقہ آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو گیا۔ امراء کے مفادات پر زد پڑتی تھی۔ وہ آپ ﷺ کے خلاف ہو گئے۔ آخر کار مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آ گئے۔ جہاں آپ ﷺ کو بہت مقبولیت حاصل ہو گئی۔ جس وجہ سے دل میں اقتدار کی خواہش نے جنم لیا اور لڑائیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ غزوات اور جہاد کی بنیاد محض مادیت اور ہوس اقتدار قرار دی ہے۔ مصنف نے قارئین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اسلام مارکسی رنگ کی ایک مادی تحریک ہے جس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔

سیرۃ نگاروں میں ایک اطالوی مستشرق (Leon Caetani) ہے۔ موصوف نے اپنی دونوں تصنیفات Annali dell' Islam (1907) اور studi di storia Orientale میں اسلام کو ایک مادی تحریک قرار دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہے۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر مارگولیتھ (Dr. David Margoluith) نے بھی اپنی تصنیف Mohammad and the Rise of Islam یا انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں اپنے مقالہ جات میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کی بنیاد طبقہ وارانہ جنگ پر ہے جو عرب کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔

اس صدی کے ایک اور مشہور سویڈن کے مستشرق و سیرۃ نگار تور انڈرے Tor Andrae ہیں۔ انہوں نے جرمن زبان میں سیرت پر کتاب (Mohammad Sein Leben und sein Glaube)(1932) میں لکھی۔ اس کتاب کی عوام میں مقبولیت کے پیش نظر فرانسیسی، اسپینی اور اطالوی زبانوں میں تراجم ہو گئے۔ مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں رسول کریم ﷺ کو متعدد نفسیاتی عوارض کا شکار ٹھہرایا۔ جنہوں نے معاشرہ میں ایسی سماجی تبدیلیاں کیں جن کے عرب کے حالات متقاضی تھے۔ مصنف نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اسلام پر عیسائیت کا گہرا اثر ہے۔ اسلام کوئی نیا دین نہیں بلکہ یہودیت اور عیسائیت کا ملغوبہ ہے۔ اس فکر کو ابراہیم گیگر Abraham Geiger نے اپنے مقالے What did Islam adopt from Judaism (1833ء) میں آگے بڑھایا۔ پھر مستشرقین کی کتب میں یہ مستقل موضوع بن گیا۔ واٹ (Watt) رقمطراز ہے:

"Quotations from the Bible began in Muslim works (Islam and the Integration of Society. (Edinburgh 1961)

اسی بات کو الفریڈ گلام (Alfred Gulliaume) نے اپنی تصنیف کتاب سیرت (The life of Muhammad) میں دہرایا ہے۔ بیسویں صدی کے مستشرقین نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رسول کریم ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اس فکر کے دو مستشرق واٹ (Watt) اور کینتھ کریگ (Kenneth Cragg) داعی ہیں۔ چنانچہ کریگ رقمطراز ہے۔

"The transition (Hijrah) also marks an evident development in the function of the Prophet, implicit in the emergence of preacher into ruler, the warner into warrior (The Call of theMinaret) (New York ء1956) P.72

دور حاضر کے مفکر اور مورخ ٹائن بی (Toyonbee) نے اپنی مشہور کتاب (A Study of History 1961) میں

جہاں کہیں بھی رسول کریم ﷺ کا ذکر آتا ہے وہاں اسی فکر کو دہرایا ہے۔

مشہور مستشرقین کی کتب (سیرۃ طیبہ) پر مختصر جائزہ پیش کر دیا گیا۔ ویسے اس موضوع پر لکھی گئی کتب اور مقالہ جات کی تعداد ہزاروں تک ہے۔

میرے خیال میں یہ موضوع نامکمل رہے گا اگر چندان مستشرقین کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ پر لکھتے ہوئے انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور قدرے نرم اور معقول رویہ اختیار کیا ہے۔

جارج برنارڈ شا رقمطراز ہے:

"اگر کوئی ایسا مذہب جو نہ صرف انگلستان بلکہ تمام یورپ پر چھا سکے وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ محمد ﷺ کے مذہب کی تعظیم کی ہے کیونکہ اس میں ایک حیران کن حرارت ہے۔ میرے نزدیک یہ واحد مذہب ہے جس میں ایسی گنجائش ہے جو زندگی کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتی ہو اور ہر زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔

میں نے اس شخص (محمد ﷺ) کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میری دانست میں وہ نوع انسانی کے نجات دہندہ ہیں کجا کہ انہیں (العیاذ باللہ) (خدانخواستہ) دجال کہا جائے...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان (محمد ﷺ) جیسا کوئی شخص موجودہ دنیا کا حاکم بن جائے تو وہ تمام مشکلات کو اس طرح حل کرے گا کہ امن اور خوشی کا دور دورہ ہو جس کو دنیا ترس رہی ہے۔ میں یہ پیشگوئی کر چکا ہوں کہ محمد (ﷺ) کا دین کل کے یورپ کو بھی اسی طرح قابل قبول ہوگا جیسا کہ اسے آج کے یورپ نے اپنانا شروع کر دیا ہے۔ (TheGeniusofIslam Vol.1 P.8(1936)

لیمر ٹائن (Lamar Tine)

اگر انسانی منزلت کی انتہا تین چیزوں سے متعین کی جاتی ہے۔ یعنی (1) ہدف کی عظمت (2) وسائل کی کمی (3) حیرت انگیز کامیابی تو پھر تاریخ میں بڑی سے بڑی شخصیت کا مقابلہ محمد (ﷺ) سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے مشہور ترین لوگوں نے صرف ہتھیار بنائے۔ قوانین مرتب کیے اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ انہوں نے فقط مادی قوت پیدا کی۔ جو اکثر و بیشتر ان کی آنکھوں کے سامنے ہی برباد ہو گئی۔ لیکن اس شخص (ﷺ) نے نہ صرف فوجی لوازمات اور قواعد و قوانین بنائے اور اس کے ساتھ حکمرانوں اور عوام کو پیدا کیا بلکہ اس وقت کی دنیا کی ایک تہائی آبادی کو بھی متحرک کر دیا۔ اس سے بڑھ کر مصنوعی بتوں کو مٹایا۔ عقائد درست کیے، ذہنوں کو جلا بخشی اور انسانی روح کو پیدا کیا۔

فتح کے بعد اس نے ضبط اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ کیونکہ اس کا مطمح نظر انسانی سوچ کو درست کرنا تھا۔ نہ کہ حکومت اور سلطنت کے لیے تگ و دو کرنا...... وہ متواتر دعا میں مصروف رہا۔ خدا سے ہم کلام رہا۔ اس کی وفات اور بعد کی فتوحات حیران کن واقعات ہیں۔ کیا یہ سب کچھ ایک مصنوعی دعویدار کی نشانیاں ہیں یا ایک مجسم ایمان کی جس نے صحیح عقائد کو پھر سے زندہ کیا؟ اس ایمان کے دو اجزا تھے۔ پہلا خدا کی وحدت اور اس کی مادیت سے بلند ہونا۔ دوسرا یہ بتانا کہ خدا کیا نہیں ہے۔ ایک جزو نے مصنوعی خداؤں کو گرا دیا اور دوسرے جزو نے صحیح عقائد کو کھول کر بیان کر دیا۔ وہ فلاسفر بھی تھا، مقرر بھی، پیغامبر بھی۔ قانون رائج کرنے والا بھی، ضرورت کے وقت لڑنے والا بھی دلائل کی جنگ جیتنے والا بھی اور ایسے صحیح عقائد رائج کرنے والا بھی جو کسی بھی مادی آلائش سے پاک ہوں...... اسے بیس مملکتوں کا خالق بھی کہا جا سکتا ہے اور صرف ایک روحانی مملکت کا منبع بھی۔ یہ تھا وہ شخص جسے ہم محمد (ﷺ) کے نام سے جانتے ہیں...... اگر ہم وہ تمام پیمانے نظر میں رکھیں جن سے انسانوں کی عظمت جانچی جاتی ہے تو کیا ہمیں کوئی محمد (ﷺ) سے بڑی شخصیت نظر آتی ہے؟

(Historic de la Torqnie Paris 1854, Vol. 2, PP. 276, 277)

تھامس کارلائل (Thomas Carlyle):

مجھے یہ حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شخص نے کیسے مختلف سیلانی اور پراگندہ قبائل کی خانہ جنگی کو ختم کر کے انہیں یکجا کر کے فقط دو عشروں میں ایک طاقت وراور مہذب قوم بنا دیا۔ جو بہتانوں کا طومار مغرب نے (بزعم خود نیک نیتی سے محمد (ﷺ) پر عائد کیا ہے کہ وہ سراسر ہمارے لیے شرم کا باعث ہے۔ وہ ایک خاموش منش تھے۔ جو اس گروہ میں سے تھے جو کلیتاً سنجیدہ اور پرعزم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے رب کے حکم کے مطابق دنیا کو روشن کر دیا۔

(Heroes and Hero Worship)

میخائل ایچ ہارٹ (Michael, H.Hart)

میں محمد (ﷺ) کو ان تمام اشخاص سے افضل سمجھتا ہوں جنہوں نے اس دنیا پر دائمی اثرات چھوڑے۔ ممکن ہے میرے اس بیان پر کچھ لوگوں کو حیرانی ہو اور بعض معترض بھی ہوں۔ لیکن وہ (ﷺ) واحد شخص ہیں جنہوں نے دینی اور دنیوی دونوں میدانوں میں کمال درجہ کی کامیابی حاصل کی۔

(Influential Persons in History. New York 1978, P.33)

اس کتاب کا پہلا باب رسول کریم ﷺ کی مختصر سیرت طیبہ پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے وہ وجوہ بیان کی ہیں جن کی بناء پر اس نے رسول کریم ﷺ کو تاریخ کی موثر کن شخصیت قرار دیا ہے جنہوں نے تاریخ عالم پر سب سے زیادہ گہرے اور انمٹ نقوش ثبوت کیے ہیں۔ اس کے بعد کتاب میں دنیا کی دوسری 99 اہم شخصیات کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔

پروفیسر ہرگ رونج (Professor Hurgronje):

اسلام کے پیغام نے مختلف اقوام کو ایک لڑی میں پرو کر بین الاقوامی یگانگت کی بنیاد رکھی اور یہ اعلان کر کے کہ تمام قومیں ایک ہیں اور سب انسان بھائی بھائی ہیں، ایک ایسا اصول قائم کیا جس کو تمام اقوام کی سوچ پر فوقیت حاصل ہے...... یہ حقیقت ہے کہ کوئی اور قوم یہ کام نہ کر سکی جو اسلام کے اصولوں نے اجماع اقوام کے لیے کیا اور اس طرح بالآخر قوموں کی تنظیم (League of Nations) ظہور میں آئی۔

مارٹن لنگو:

مارٹن لنگو نے ایک کتاب بعنوان محمد (ﷺ) لکھی جو 1983ء میں اسلامک ٹیکسٹ سوسائٹی لندن نے شائع کی۔ 395 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تعصب، تنگ نظری اور پرانی معاندانہ خرافات سے ہٹ کر رسول کریم ﷺ کی ذات پر بحث کی ہے اور رسول کریم ﷺ کو "رحمت کی کنجی اور صداقت کی روح" قرار دیا ہے۔

جان ڈیون پورٹ:

مصنف نے این اپالوجی فار محمد (ﷺ) اینڈ دی قرآن لکھی جو 1882ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں رسول کریم ﷺ کی زندگی کے حالات ہیں۔ جو 57 صفحات پر مشتمل ہے دوسرا حصہ قرآن پر مشتمل ہیں جو 65 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ تیسرا حصہ ان اعتراضات کے رد پر مشتمل ہے۔ جو رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر لگائے گئے۔
اس کتاب میں خصوصاً چار اعتراضات پر مفصل بحث کی گئی ہے:

1- رسول کریم ﷺ کا ایک نئے اور جھوٹے مذہب کی تبلیغ اور اسے الہامی بنا کر پیش کرنا حالانکہ یہ ان کی ذاتی اختراع تھی۔
2- محمد ﷺ کا اسلام تلوار کے زور سے پھیلانا۔
3- جنت کے وعدے کر کے اسلام کی تبلیغ کرنا۔
4- کثرت ازدواج

کتاب کا چوتھا حصہ جمال قرآن کے عنوان سے 14 صفحات پر پھیلا ہوا۔

ٹالسٹائی:

ٹالسٹائی نے ''پیغمبر اسلام ﷺ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ روس کا یہ فلاسفر رسول کریم ﷺ کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے: ''محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے اہل عرب جنگ کے قیدیوں اور اپنی اولاد کی قربانیاں کرتے تھے۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ جنگ وقتال کا بازار ہر وقت گرم رکھتے تھے۔ غرض سنگ دلی، انتقام، خونریزی وغیرہ بُرے اخلاق سے متصف تھے۔ آپؐ نے ان سب اوصاف کا قلع قمع کر کے عرب کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کی دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ کے یہ عظیم الشان کارنامے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپؐ بہت بڑے مصلح تھے اور آپؐ میں فوق العادت طاقت تھی۔

مستشرقین اور سیرت کی کتب کے تراجم:

غیر مسلموں نے انگریزی اور دیگر زبانوں میں سیرت کی کتب کے تراجم بھی کیے ہیں اور بعض نایاب کتب کی تحقیق بھی کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اے گلیلام نے 1955ء میں سیرت ابن اسحاق کے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کے آغاز میں 65 صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ لکھا۔

زین العابدین کی فارسی کتاب پیغمبر (ﷺ) کا ترجمہ ایلول سلٹن نے ''دی میسنجر'' کے نام سے کیا جو 1984ء میں اٹلی میں شائع ہوا ہے۔ لیکن اس کا پہلا ایڈیشن 1965ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح الصحیفہ الصادقۃ کا ترجمہ ولیم کٹک نے کیا اور 1988ء میں لندن سے شائع ہوا۔ وان کریمر نے واقدی کا ترجمہ 1856ء میں جرمن زبان میں شائع کیا۔ ڈاکٹر ویل نے سیرت ابن ہشام کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ یونگ نے سیرت ابن ہشام کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا اور لندن سے شائع ہوا ساتھ ہی عربی متن بھی ہے۔ [1]

---

[1] مذکورہ عنوان ''مستشرقین اور سیرت رسول کریم ﷺ'' تحریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کتب اور رسالہ جات سے استفادہ کیا ہے: سیرت النبی اول شبلی نعمانی، علوم الحدیث (ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر)۔ سیرت النبی محمد ﷺ جلد دوم (طالب حسین کرپالوی)۔ سیرت طیبہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ہمارا خالق (محمد ضیاء اللہ)...... رسالہ الحق مضمون از پروفیسر سید حبیب الحق ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ، المعارف ولاہور اگست 1973ء مضمون ''سیرت نبوی اور مستشرقین'' از ظہور احمد اظہر۔ ترجمان القرآن جولائی 1966ء اشارات، الحق مستشرقین کا طریق واردات اور استعمار کی حمایت از مولانا عبدالقدوس ہاشمی ...... نقوش ''سیرۃ طیبہ پر بیسویں صدی کے مستشرقین کی تصانیف'' از ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی۔ علوم اسلامیہ اور مستشرقین ترجمہ اور تلخیص ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، اسلام، پیغمبر اسلام (ﷺ) اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی۔

ب۔ قرآن مجید اور مستشرقین

جس طرح مستشرقین اور مخالفین نے رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ پر غلط مفروضات پر اپنی علمی تحقیقات کی بنیاد رکھ کر دل کھول کر گمراہ کن اور بے بنیاد الزامات دھرے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق اپنی جہالت کی بناء پر بے سروپا جھوٹے قصے گھڑے ہیں۔ جن میں کوئی علمی اور تاریخی حقیقت نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق چند مستشرقین کے اعتراضات قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کا انداز فکر معلوم ہو سکے۔

وحی الٰہی کے متعلق مستشرقین کا انداز فکر:

یہ ایک حقیقت ہے کہ وحی الٰہی ایک ادق موضوع ہے۔ آغاز سے ہی اس موضوع کو سمجھنے میں مشرکین عرب نے ٹھوکر کھائی۔ مثلاً جب رسول کریم ﷺ پر وحی نبوت کی آمد سے ایک بوجھ اور ثقل محسوس ہوتا تھا مشرکین اسے جنون اور سحر کا نام دے دیتے تھے۔ آج مستشرقین وحی کی جو تشریح کرتے ہیں اس میں اور مشرکین مکہ کی تشریح و وضاحت میں کوئی فرق نہیں فرانسیسی مستشرق گستاو لیبان (Guetave Le Bon) لکھتا ہے "کہا جاتا ہے کہ محمدؐ پر مرگی/جنون کا اثر تھا لیکن عربوں کی تاریخ میں مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے اس کی قطعی تصدیق ہو سکے۔ ان کے ہم عصروں سے (جن میں حضرت عائشہؓ بھی شامل ہیں) صرف معلوم ہو سکا ہے کہ محمدؐ پر جب وحی آئی تھی تو ان کا پیشاب رک جاتا تھا، سخت دباؤ محسوس کرتے تھے اور دہن سے لعاب بہنے لگتا تھا لیکن ہر دیوانہ کی طرح اگر تم محمدؐ کی اس کیفیت کو نظر انداز کر کے دیکھو تو تم کو وہ عقل و فہم کے لحاظ سے پختہ اور سلیم الفکر نظر آئیں گے علمی نقطہ نگاہ سے محمدؐ کو ان کی وارفتگی مزاج کے باوجود سب سے بڑا بانی مذہب تسلیم کرنا پڑے گا ان کے مرض کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے کیونکہ بانیان مذاہب یا تمام مفکرین بارد مزاج رکھنے والے نہ تھے پریشان دماغ اور دیوانگی سے متاثر لوگوں نے بھی اس طرح کے کردار ادا کیے انہوں نے مذاہب کی بنیاد ڈالی حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ انسانی گروہوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا اور ان کی رہنمائی کی۔ دنیا پر اس دیوانگی کے بجائے اگر عقل کو سیادت نصیب ہوتی تو انسانی تاریخ کا رنگ ہی دوسرا ہوتا (تمدن عرب عربی ترجمہ از عادل زعیتر ص 141 - 145)

"قرآن کا عمومی پیرایہ اظہار اور طفلانہ لاہوتی بیانات...... جو کہ آسمانی مذاہب کا خاصہ ہیں کو ہندوؤں کے فکر و فلسفہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ (تمدن عرب ص 67)

لیبان قرآن مجید کی جامعیت اور کمال کا منکر نظر آتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قرآن وقتی افادیت کا حامل ہے، بعد کی صدیوں میں انسانی تقاضوں کو پورا کرنے سے وہ قاصر رہا بلکہ لیبان کے نزدیک قرآن ہی مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب ہے۔

(تمدن عرب ص 680، ص 723)

مستشرق ویلز (E.Wells) کی یہ رائے ہے کہ مقدس اشخاص کی صف میں شامل ہونے کے لیے محمدؐ کو ادھیڑ عمر میں ان کے حوصلہ مندانہ جذبات نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنے پر آمادہ کیا، اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے خرافاتی عقائد اور سطحی رسوم و روایات کا

ایک مجموعہ تیار کیا۔ اپنی قوم میں اس مجموعہ کی اشاعت کی اور کچھ لوگوں نے ان کی پیروی بھی کی۔ (الاسلام والثقافۃ العربیۃ فی مواجھہ والاستعمار ص 239۔

گولڈ زیہر لکھتا ہے:

"نبی عربی ﷺ کا پیغام دراصل ان مذہبی خیالات اور معلومات کا منتخب خلاصہ تھا جو آپ کو یہودی اور عیسائی حلقوں سے روابط کی بنا پر حاصل ہوئیں۔ ان خیالات سے آپ ﷺ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے ذریعے اپنے ہم وطنوں میں سچے مذہبی جذبات کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ بیرونی تعلیم آپ کے وجدان میں سرایت کر گئی اور آپ سمجھنے لگے کہ رضا الٰہی کے مطابق ان کے ذریعے انسانی زندگی کو ایک رنگ دیا جاسکتا ہے۔ محمدؐ اس قسم کے خیالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ آپ کا عقیدہ بن گئے۔ لیکن آپؐ ان کو وحی سمجھتے رہے (العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام (عربی ترجمہ از یوسف موسیٰ مصر 1949 ص 17,13

فرانسیسی مستشرق بلاشیر (Blachere) بزعم خویش قرآن مجید کے اصل سرچشمہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی و مسیحی حکایات میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس خیال کے میں ابتدائی مکی سورتوں میں مسیحی اثرات بہت زیادہ نمایاں ہیں اور انجیل کے غیر تسلیم شدہ نسخوں خصوصاً کتاب پیدائش جو اس زمانہ میں عام تھی اور قرآن کے واقعات میں مشابہت موجود ہے۔ بلاشیر اس سلسلہ میں کچھ دوسرے مستشرقین کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بانی اسلام اور مسیحی راہبوں کے درمیان مکہ میں تعلقات استوار تھے (Blachere Le probleme de Mohamad (Paris, 1952) P.60)

تاریخ ادیان عالم (Maniel de l, Histore dos Religions) میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "دعوت کے ابتدائی دور میں قرآن میں نبی کا پیرایہ بیان جذباتی تھا مختصر جملوں اور شاندار اسلوب میں نمایاں طور پر رنگ آمیزی کر کے جزا و سزا کی کیفیات بیان کرتے تھے جن سے بسا اوقات آیتوں کی تکرار سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہیں کہیں یہ تکرار الٹا مفہوم پیدا کر دیتی ہے کچھ عرصہ کے بعد نبی کا یہ ابتدائی اسلوب بدل گیا۔ اب وہ خوبصورت آہنگ میں نبیوں کے واقعات پیش کرنے لگے، یوسف اور ان کی بیوی (بوتیفار) کی داستان محبت کو انہوں نے اسی انداز میں پیش کیا ہے یہ انداز ایران اور ترکی کے بہت شاعروں کے لیے خیال انگیز ثابت ہوا آخری دور میں نبی کے اسلوب نے گرمی بیان اور فن کاری کو کم کر دیا۔ اب وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے پر فریفتہ نظر آتے ہیں (بحوالہ عن القرآن از محمد صبیح مصر 1939ء ص 144 - 147)

فلپ ارنگی نے پیرس سے شائع ہونے والے ایک رسالہ میں ایک مضمون لکھا۔ اس میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمدؐ کی مکہ میں اکثر یہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یہودیت اور مسیحیت کے بارے میں معلومات کے حصول کے لیے اکثر ان سے سوالات کیا کرتے تھے پھر یہ بھی لکھا ہے کہ مدینہ میں محمدؐ یہودیوں کے شاگرد رہے اور یہود نے ہی یہ شخصیت تیار کی۔

(المجلۃ الاسویۃ 1904ء 1904ء Journal asiatique گویا مستشرقین قرآن مجید کو رسول کریم ﷺ کی وہ تصنیف سمجھتے ہیں جو آپؐ نے یہود اور عیسائیوں کے خیالات سے استفادہ کر کے تیار کی تھی۔

فرانسیسی مستشرق کلیمنٹ حوارٹ (Clement Haurt) نے اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا ہے کہ قرآن مجید امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہے۔

اسی طرح ایک مستشرق "الحداد" قرآن کے بارے میں تحریر کردہ حواشی میں یہ رائے دیتا ہے کہ محمدؐ نے ورقہ بن نوفل سے تورات

اور انجیل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مدینہ میں بھی نبی کے گرد یہود اور عیسائی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا اسلام کا ساتھ دیا۔ موذن رسول بلال حبشی، عیسائی دولت مند صہیب رومی، عیسائی سلمان فارسی اور یگانہ روزگار عبداللہ بن سلام جو کعب احبار کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے یہ سب لوگ رسول کریم صلعم کی محفل میں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی گفتگو کا اصل محور تورات اور انجیل کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے لہٰذا محمد اور قرآن کا علمی سرچشمہ یہی احباب ہیں نہ کہ وحی اور نزول آیات (الحداد، القرآن و الکتاب، قسم 2، اطوار الدعوۃ القرآنیۃ ص 1060-1059)

جرمن مستشرق نولدکے اپنی تصنیف "تاریخ قرآن" میں حروف مقطعات کو جزو قرآن تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب سے قبل مسلمانوں کے پاس جو قرآن موجود تھے ان میں یہ حروف "اسماء مولفین قرآن" کی علامتوں کے طور پر موجود تھے۔ مثلاً مغیرہ کے نسخہ کے لیے "م" ابوہریرہ کے نسخہ کے لیے "ھ" اور سعد بن ابی وقاص کے نسخہ کے لیے "ص" علامات کے طور پر لکھے ہوتے تھے، اسی طرح حضرت عثمانؓ کے نسخے کے لیے 'ن' کی علامت تھی۔ نولدکے نزدیک یہ حروف ان اسماء کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی ملکیت میں وہ نسخے تھے۔ جو مصحف عثمانی میں غلطی سے بعض سورتوں میں باقی رہ گئے تھے اور مرور زمانہ کے ساتھ وہ قرآن کا حصہ بن گئے۔

تھامس کارلائل کے نزدیک "قرآن بے ربط، پُر تکان، گنجلک اور پُر پیچ ہے"۔

"On Hero, Hero worship and the Heroic in the History". PP 64, 65)

نکلسن لکھتا ہے: "قرآن کی روایات یہود کے مضامین اور بائبل کے غیر مستند مواد پر مشتمل ہیں۔

R.A. Nicholsons Introduction to W.H. palmer's translation of Koran.)

قرآن کا اولین ایڈیشن ملت نے تسلیم نہ کیا، موجودہ نسخہ نظر ثانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔ (Muir, life of Mohammad PP 555-557)

مستشرقین کے نزدیک قرآن مجید کے متن میں بھی اضطراب ہے۔ چنانچہ جرمن مستشرق گولڈ زیہر اپنی کتاب "اسلامی تفسیر کے مکاتب فکر میں لکھتا ہے کہ کسی مذہبی گروہ کے نزدیک تسلیم شدہ مذہبی صحیفہ میں جس کو وہ گروہ وحی قرار دیتا ہے اور زمانہ دراز سے اس کے متون کو پیش کرتا آرہا ہے وہ اضطراب نہیں ملتا جو اضطراب قرآن کے متن میں ملتا ہے (الحداد، القرآن و الکتاب ص 298)

دور نبوت میں اس فطری رجحان کے بموجب مسلمانوں نے قرآن کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت بھی نہیں تھی جیسا کہ انہوں نے رسول کا جانشین طے کرنے کی بھی قبل از وقت فکر نہ کی۔ (گولڈ زیہر، اسلامی تفسیر کے مکاتب فکر ص 40)

مستشرقین کے دیگر قرآنی موضوعات کے علاوہ ایک اہم موضوع "قراءتوں کا اختلاف رہا ہے۔ آر اے نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن کا دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں لکھتا ہے کہ دور نبوی (ﷺ) میں ایسے کئی افراد تھے جنہوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے خود اپنی راہ متعین کر لی تھی اور یہ کہ یہ لوگ حنیف کہلاتے تھے پھر قیاس کیا کہ قبل نبوت رسول اللہ ﷺ سے تعلقات ان لوگوں سے ضرور رہے ہوں گے نیز یہ کہ تجارتی سفروں نے حضور ﷺ کو یہ مواقع بہم پہنچائے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تبادلہ خیال کر سکیں جس کے نتائج قرآن میں محفوظ ہیں:

R.A. Nicholson, Introduction to the Koran.

(Translation of Quran from Arabic to English by E.H Palmer, PP. X-XIX)

قرآن مجید کی ترتیب وتدوین کے بارے میں لکھا ہے چونکہ وفات نبوی کے بعد اس کی تدوین کرنے والے اس کی صحیح طریقے سے تدوین نہیں کر سکے اس لیے انہوں نے آسان طریقہ یہ اختیار کیا کہ طویل سورتیں پہلے اور مختصر سورتیں آخر میں جمع کر دیں اور یہ کہ اگر طریقہ کار اس کے برعکس ہوتا تو قارئین کے لیے شکایت کی گنجائش کم تھی۔ (حوالہ بالا)

سیل، میور اور نولدکے نے بھی قرآن مجید کی جمع وتدوین پر اعتراض کیا ہے جن کا تاثر یہی ہے کہ حضرت زیدؓ نے جیسی بھی تحریر پائی درج کر دی اور مطالب ومعنی محل ومقام سے غیر متعلق ہے نیز یہ کہ ان کے مجموعے میں نہ تو پورا قرآن مدون ہو سکا اور نہ ان کا ایڈیشن ملت نے تسلیم کیا۔

(ef. Muir) life of Mohammad P.P. 555, 557 Nolde Ke, Dictionary of Islam PP. 486, 487) sale, Essays on Islam PP. 218, 224.

ج۔ حدیث اور مستشرقین:

کلین (Klein) لکھتا ہے: احادیث وضعی ہیں دوسری صدی پیغمبر اسلام کی عظمت بڑھانے یا قرآنی مباحث کی تشریح کے لیے وضع کی گئیں The Religion of Islam PP. 4 شاخت ایک معروف مستشرق ہے جس نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں مقالات اور کتب تصنیف کی ہیں۔ موصوف کی دو کتابیں ''مقدمہ اسلامی قانون (Introduction to Islamic Law) اور اسلامی فقہ کی بنیادیں (Origins of Muhammaden Jurisprudence مشہور ہیں۔ شاخت واضح طور پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کسی بھی فقہی حدیث کے بارے میں یہ کہنا بڑا دشوار ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے (Introduction to Islamic Law P. 34)

د۔ اسلام اور مستشرقین:

1۔ اسلام مذہب ہی نہیں — Bryans Turner, weber and Islam P.1

2- اسلام جنگی ٹولے کا ضابطہ اخلاق ہے (حوالہ بالا)

3- اسلام عام مذاہب سے جدا ہے اس لیے عمرانیات مذہب سے خارج ہے (حوالہ بالا)

4- اسلام عرب جاہلیہ کی ''مروۃ'' کا بدلا ہوا نام ہے۔ — (Goldziher Muslim studies P. 22)

5۔ اسلام دنیاوی مذہب ہے۔ اسلام مذہب نجات نہیں۔ — (P. Hardy; Muslims of British India. P. 175)

6۔ اسلام لوٹ ہے۔ — (Maxim Rodinson; Mohammad P. 77)

7 - اسلام انفرادی مذہب ہے۔ (حوالہ بالا)

8- اسلام یہودیت اور عیسائیت کا مرہون منت ہے۔ (Klein, E.A. The Religion of Islam, P.21)

9- داعی اسلام دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام دین ابراہیمی کی تجدید ہے جب کہ حقیقتاً یہ ایک نیا مذہب ہے۔

(Davonport J. An Apology for Mohammad P. 138.)

10- اسلام عیسائیت کا رقیب دشمن ہے۔

11- اسلام کے ارکان دوسرے مذاہب سے مستعار ہیں۔ توحید اور عبادات یہودیت اور عیسائیت سے حج مشرکین عرب سے طواف کعبہ، حجر اسود کا بوسہ اور جانوروں کی قربانی مقامی مذاہب سے مفاہمت کی نشانی ہے پس اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔

H. Krammer; The Christian Message in Non -Christian world.)

12- اسلام بزور شمشیر پھیلا (عام اور متعدد مستشرقین کا اعتراض)

13- مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ (متعدد مستشرقین) 14- اسلام میں شدید جمود ہے۔ (متعدد مستشرقین)

قانون اور مستشرقین:

شاخت لکھتا ہے اسلامی قانون کا مطالبہ کرنا کسی مہمل خیال کے پیچھے دوڑنے کے مترادف ہے کیونکہ شریعت کا تعلق مذہب سے ہے ہی نہیں، یہ تو مذہب سے الگ ایک چیز ہے، نیز فقہ اسلامی کے نام سے جو چیز ہمارے سامنے موجود ہے اس کا قرآن اور حدیث سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے بیشتر حصے یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے قوانین سے ماخوذ ہیں اور جو فقہ ان کے علاوہ ہے وہ مجتہدین کے ذاتی اجتہادات کا نتیجہ ہے اسی طرح دیگر مستشرقین اسلامی فقہ کو ایک فرسودہ اور بوسیدہ نظام قرار دیتے الغرض مستشرقین نے قرآن، حدیث، سیرت طیبہ اور اسلام اور فقہ پر ہی اعتراضات نہیں کیے بلکہ مسلمانوں کے دیگر علوم مثلاً فلسفہ، تاریخ، اسلامی سائنس، جغرافیہ، سیاسیات، سماجیات، فنون و جمالیات، معاشیات پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔

مستشرقین کے علاوہ ہندوستان میں عیسائی رہنما آتھم اور سراج دین اور ہندومت کے پیروکاروں مثلاً لیکھرام، مرلی دھر، سوامی دیانندی مصنف ستیارتھ پرکاش دھرم پال مصنف تارک اسلام نے اسلام پر دل کھول کر حملے کیے ہیں یہ ایک عجیب توارد ہے کہ وحی، قرآن مجید کے من جانب اللہ اور تدوین حدیث میں بعض مسلم علماء اور مستشرق ایک کشتی میں سوار نظر آتے ہیں۔ بعض مستشرق بھی مسلم علماء کی طرح قرآن مجید کی وحی کو محض قلبی واردات قرار دیتے ہیں اور قرآن مجید کو رسول کریم ﷺ کی تصنیف و اسی طرح تدوین حدیث کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصہ کے بعد محدثین نے حدیثوں کو جمع کرنے کی طرف توجہ کی۔ دونوں کے انداز بیان میں فرق ہے۔ اس کتاب میں مسلم مفکرین کے شبہات کا بھی ازالہ کیا گیا ہے۔

---

[1] **مصنف کا نوٹ:** مذکورہ عنوان مستشرقین اور اسلام تحریر کرتے ہوئے حسب ذیل کتب اور رسالہ جات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ سیرت النبی مصنفہ شبلی نعمانی حصہ اول، 2- علوم الحدیث مصنفہ ڈاکٹر عبدالروف ظفر، 3- سیرت النبی جلد دوم مصنفہ طالب حسین کرپالوی، سیرت طیبہ (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی رسالہ الحق مضمون پروفیسر سید حبیب الحق ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ، المعارف لاہور اگست 1973ء مضمون "سیرت نبوی اور مستشرقین از ظہور احمد اظہر، ترجمان القرآن جولائی 1966ء اشارات، الحق مستشرقین کا طریقہ واردات اور استعمار کی حمایت از مولانا عبدالقدوس ہاشمی، نقوش نمبر "سیرۃ طیبہ پر بیسویں صدی کے مستشرقین کی تصانیف از ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین ترجمہ اور تلخیص ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، اسلام اور پیغمبر اسلام (ﷺ) اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر از ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی۔

باب سوم:

مستشرقین اور معترضین کے اعتراضات پر علمی محاکمہ

وحی کے بارے میں شبہات واعتراضات (سر سید احمد کے نظریہ وحی پر علمی بحث)

وحی خارج سے آتی ہے یا فطرت انسانی کے اندر سے اٹھتی ہے

مذہب اور بنی نوع انسان کی ہدایت کی بنیاد وحی پر ہے اس کا آغاز ابتدائے افرینش سے ہی ہے۔ کیونکہ ہدایت پانا انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ وحی کا سلسلہ شروع کیا۔ وحی ایک ایسا علمی بحث ہے۔ جس، کی وضاحت اور تشریح میں حکماء، فلاسفہ اور علماء کا اختلاف چلا آرہا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس علمی موضوع پر بحث کی جائے۔

بنو عباس کے عہد میں وحی کے بارے میں معتزلہ اور اشعریہ کا شدید اختلاف تھا۔ ربانی علماء نے معتزلہ کے نقطہ نظر کو دلائل کے ساتھ رد کیا۔ خلیفہ ماموں الرشید کے دور میں معتزلہ کے نقطہ نظر کے مخالفین علماء ربانی پر بہت تشدد کیا گیا۔

دور حاضر میں بھی وحی کے بارے میں شدید اختلاف ہے۔ سر سید اس دور کے عبقری ہیں۔ اور ان کے علم کلام کا گہرا اثر ہے۔ اور ان کی مسلمانوں کے لیے علمی ادبی سماجی، سیاسی، تعلیمی خدمات قابل قدر ہیں۔ وحی کے متعلق ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ وحی ایک عطیہ فطرت ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو خارج سے آتی ہو یہ ایک ایسی قوت استعداد ہے جو خدا نے انسان کے اندر پیدا کی ہے جس طرح شاعر کے اندر شاعری کا ملکہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں پیدا کر دیا ہے۔ جب شاعر اس ملکہ کو حرکت دیتا ہے تو شعر زبان پر آجاتا ہے۔ اسی طرح وحی کے الفاظ بمعہ معانی انسان کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں خارج سے دل پر نازل نہیں ہوتے۔

چنانچہ سر سید صاحب لکھتے ”خدا اور پیغمبر میں بجز ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ اس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اس کا دل وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے وہ خود ہی مجسم ہوتا ہے جس میں خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں وہ خود ہی کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا ہے خود اسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اس کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے اس کو کوئی نہیں بلواتا بلکہ وہ خود بولتا ہے اور خود ہی کہتا ہے: وما ینطق عن الھوی ان ھُوَ الاوحی یُوحی جو حالات و واردات ایسے دل پر گزرتے ہیں وہ بھی بمقتضائے فطرت انسانی اور سب کے سب قانون فطرت کے پابند ہوتے ہیں وہ خود اپنا کلام نفسی ان ظاہری کانوں سے اسی طرح سنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہے وہ خود اپنے آپ کو ان ظاہری آنکھوں سے اسی طرح دیکھتا ہے جیسے

دوسرا شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

پس وحی وہ چیز ہے جس کو قلب نبوت پر بسبب اسی فطرت نبوت کے مبدءِ فیض نے نقش کیا ہے فعل انعکاش قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے انہیں کانوں کے سنائی دیتی ہے۔ اور کبھی وہ نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے، نہ بولنے والا۔ خدا نے بہت سی جگہ قرآن مجید میں جبرئیلؑ کا نام لیا ہے مگر سورۃ بقرہ میں اس کی ماہیت بتادی ہے۔ جہاں فرمایا ہے کہ جبرئیلؑ نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے دل پر اتارنے والی یا دل میں ڈالنے والی وہی چیز ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اس کی خلقت سے جس کے دل میں ڈالی گئی ہے، جدا گانہ ہو، (مضامین سرسید مرتبہ محمد اکرام چغتائی صفحہ 100 سن اشاعت 2008)

اسی طرح دور حاضر کے ایک اور بڑے عالم فاضل علامہ نیاز محمد فتح پوری ہیں جن کی تحریرات سے کئی لوگ متاثر ہیں۔ یہ بھی کئی کتب کے مصنف ہیں ''من ویزداں'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ جس پر علماء کرام نے دل کھول کر تنقید کی ہے مشہور رسالہ ''نگار کی ادارت کرتے رہے ہیں۔ وہ بھی وحی کے سلسلہ میں سرسید کے ہم خیال تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم متکلمین کا یہ عقیدہ غیر مسلم حکماء وفلاسفہ کے خیالات ونظریات کا مرہون منت ہے۔ وہ بھی وحی کو کوئی خارجی شے تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ اس کا منبع دل کو گردانتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس نظریہ پر بحث کی جائے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید اور علامہ نیاز محمد فتح پوری اپنے علمی رتبے کے لحاظ سے بہت بلند ہیں ان کے علم کلام سے ارباب علم اصحاب متاثر ہیں ان کی علمی خدمات بھی بہت ہیں میرا وہ مقام نہیں ہے کہ ان کے نظریات کو رد کروں لیکن خاکسار نے علماء ربانی کی کتب کا مطالعہ کیا ہے ان کی روشنی میں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سرسید وغیرہ کا عقیدہ وحی اسلام کی روح کے منافی ہے لہٰذا میں جو بھی لکھوں گا وہ دراصل علماء ربانی کی کتب کا ماحصل ہوگا میرا کام صرف یہی ہے کہ میں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اگر کوئی فاضل اس میں لغزش پائے تو وہ میری ہوگی۔

......☆☆☆......

وحی خارجی معاملہ ہے

وحی ایک بہت ہی دقیق اوراہم موضوع ہے۔ یہ موضوع تفصیل کا متقاضی ہے۔اس لیے اس پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔
وحی کے لغوی معنی ہیں وہ اشارہ سریعہ جوایک شخص کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں لفظ وحی کا استعمال دوطرح پر ہوا ہے اول لفظ وحی کی نسبت خدا کی طرف سے دوم غیر اللہ کی طرف

وہ آیات جن میں خدا تعالیٰ نے وحی کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔موحی الٰھیہ کی رعایت سے ہر جگہ وحی کے معنی مختلف ہیں۔
1- ثُمَّ اسْتَوٰی وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا وَّ کَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ o فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰم السجدہ41: 12,11) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوااور وہ دھواں تھا سواسے اور زمین کوکہا آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے انہوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہوتے ہیں پس اس نے سات آسمانوں دو دن میں بنائے اور ہر آسمان میں اس کا امر وحی ہے۔
”اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا o وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا o وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا o یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا o بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (الزلزال 99 : 1 - 5)
جب زمین اپنا ہلانا ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا ہے؟ اس دن وہ اپنی خبریں (زبان حال) سے بیان کردے گی کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی ہوگی۔
پہلی مثال میں خدا کا آسمانوں اور زمین سے کلام کرنا اور آسمان کی طرف اپنی وحی بھیجنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک قسم کی ایسی وحی ہے جس کے ذریعے قوانین الٰھیہ اس وسیع کائنات میں کام کرتے ہیں۔
دوسری آیت میں اس انقلاب عظیم کو بھی ایک قسم کی وحی قرار دیا ہے جو زمین پر لایا جاتا ہے۔
20- وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (النحل 16 : 68)
اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔
اس آیت کریمہ میں شہد کی مکھی جو عمل اپنی طبع حس سے کرتی ہے اس کو وحی کا نام دیا ہے وہ اپنی طبعی حس کے ذریعے چھتہ بناتی اور چھتے میں ایسے شش پہلو خانے بناتی ہے جس میں شہد جمع کرتی ہے شہد کی مکھی کا چھتہ انجینئرنگ کا بہترین ماڈل ہے۔جس کو دیکھ کرانجینئر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔مختلف پھولوں سے رس چوستی ہے، اپنے پیٹ میں ہی اس کو شہد میں منتقل کرتی ہے پھر اس کو چھتہ میں جمع کرتی ہے کوئی کیمسٹ بھی اس شہد کی نقل نہیں بنا سکا۔یہ سب کچھ بغیر کسی شعور کے محض ہدایت فطرت کے تحت کرتی ہے۔
4- اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الانفال 8 : 12) جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں کہ جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو۔
اس آیت میں فرشتوں کو وحی کی گئی ہے۔فرشتوں کی طرف وحی یہ ہے کہ جو کام ان کے سپرد کردیئے گئے ہیں ان کو سرانجام دیں جیسا

کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ کائنات میں فرشتوں کو مختلف قسم کے کام سرانجام دینے کے لیے سپرد کر دیئے گئے ہیں وہ خود بخود انجام دیتے رہتے ہیں۔

5- مسیح علیہ السلام کے حواریوں کے لیے: وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ أَنْ آمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (المائدہ 5 : 111) اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

6- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوْسَى أَنْ أَرْضِعِيْهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ إِنَّا رَادُّوْهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (القصص 28 : 7)

اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا پھر جب اس کے متعلق مجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ خوف کرنا اور نہ غم کرنا ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور انبیاء میں سے بنائیں گے۔

پانچویں اور چھٹی مثال میں وحی غیر نبی کو کی گئی ہے جس سے مراد وحی ولایت اور مبشرات ہیں اور یہ بھی واضح ہوتا ہے وحی محض دل کی آواز نہیں ہے کیونکہ کسی ماں کے دل میں بچے کو دریا میں ڈال دینے کا خیال نہیں آ سکتا۔ یہ اللہ کی طرف سے آواز آئی ہے کہ بے شک بچے کو دریا میں ڈال دینا کیونکہ اللہ ہی اس بچے کا محافظ تھا۔ پھر یہ بھی خبر دی کہ رسول ہوگا مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ یہ دل کی آواز نہیں ہے یہ الفاظ خارج سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں مزید برآں ام موسیٰ کو یہ بھی کامل یقین تھا کہ وہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے ہی ہیں اور وہی اس کے بچے کا محافظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین کی وجہ سے ام موسیٰ نے اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا۔

وہ آیات جن میں غیر اللہ کی طرف وحی کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موحیٰ الیہ کی رعایت سے ہر جگہ وحی کے معنی مختلف ہیں۔

1- رسول فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا اشارہ سے کہا کہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔

2- فرشتے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (الشوریٰ 42 : 51) اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر وحی سے پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔

3- شیطان: وَإِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إِلَى أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام 6 : 121) یعنی بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام 6 : 112) اور اس طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا اور دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

ماحصل:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز اور مختلف مفاہیم میں لفظ ''وحی'' استعمال کیا ہے لہٰذا موحیٰ الیہ کی مناسبت سے معنی متعین کیے جائیں گے۔ علماء نے معنی متعین کرنے کے لیے مختلف اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ہر علم میں اصطلاحیں وضع کی جاتی ہیں۔ وہی اصطلاحیں اس علم کا حسن ہوتی ہیں۔ علم حدیث میں اصطلاحیں وضع کی گئیں علم فقہ میں اصطلاحوں سے کام لیا گیا اور تصوف میں اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسے الفاظ ہیں جو اصطلاح کے طور پر بیان کیے گئے ہیں لیکن لغت عرب میں ان کا مفہوم اور ہے مثلاً الصلوٰۃ کا لفظ۔ عربی زبان میں یہ لفظ دعا، برکت اور جلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن میں جہاں یہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے وہاں اس کا مفہوم اور ہے قرآن مجید میں بیان دعا، برکت اور جلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور خاص اصطلاح کے طور پر بھی لہٰذا جب معنی کیے جائیں گے تو موقع محل سامنے رکھا جائے گا۔

وحی کی اقسام:

علماء کرام نے وحی کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے وحی کی اقسام بیان کی ہیں، وہ اقسام ہی وحی کی اصطلاحیں ہیں۔ ان کا ماخذ قرآن مجید ہی ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں وحی کے لفظ کے معنی متعین کرنے کے لیے علماء نے حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں:

وحی فطری:

فطری وحی جیسے شہد کی مکھی اپنی طبعی حس سے چھتہ بنا کر اس میں شہد جمع کرتی ہے اسی طرح دیگر حیوانات بھی اسی وحی کے تحت کام کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (النحل 16 : 68) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔

یہ صرف شہد کی مکھی کا یہ فطری کارنامہ نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں اس قسم کے گھونسلے بناتی ہیں ان کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اگر کسی انجینئر یا معمار سے کہا جائے کہ وہ اس کی مانند بنا دے تو وہ ہرگز نہ بنا سکے گا پھر اس گھونسلے میں انڈے دیتی ہیں اور بچے نکالتی ہیں اپنی طبعی حس سے بچوں کی پرداخت کرتی ہیں بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان کو غذا مہیا کرتی ہیں۔ غرض کہ تمام حیوانات میں طبعی حس ہے جو اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ہے۔ علماء ربانی نے اس وحی کو وحی فطری کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس اصطلاح کا ماخذ قرآن مجید کی سورۃ النحل آیت 68 ہے اپنی طرف سے نہیں وضع کر لی گئی۔

وحی ایجادی:

جب کوئی شخص کسی چیز کی ایجاد پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دیتا ہے تو قدرت الٰہی اس شخص کے ذہن پر اس چیز کی نقشہ مرتسم کر دیتی ہے تو وہ موجد اپنی مطلوبہ کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ وحی اور الہام عام انسانوں کو ہوتا ہے چاہے وہ مومن ہوں یا غیر مومن۔ ارشاد الٰہی ہے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل 17 : 20) ہم سب کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی (مومن اور غیر مومن) تیرے رب کی عطا سے اور تیرے رب کی عطا کبھی رکتی نہیں۔

کئی سائنس دانوں کے حالات زندگی میں مذکورہ حقیقت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے کہ خود سائنس دان اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ بعض اوقات وہ کسی دقیق مسئلہ پر غور وخوض کر رہا ہوتا ہے تو دفعتاً اس لاینحل اور دقیق نکتہ کا حل اس کے دل میں آ جاتا ہے یہی وہ عطاء ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے اور یہی وہ عطا ہے جس سے علم ترقی کر رہا ہے۔

وحی الابتلاء:

وحی الابتلاء بعض اوقات ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ وحی الابتلا ہر شخص کو نہیں ہوتی۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بعض جسمانی طور پر اندھے، گونگے اور بہرے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بعضوں کی روحانی قوتیں کالعدم ہوتی ہیں لیکن بعض لوگ اس قسم کے بھی

ہوتے ہیں وہ قدرت کی طرف سے ایسا دماغ اور فطری استعداد یں لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ ان کو سچی خوابیں اور سچے الہام ہوتے ہیں لیکن ان کو خدا کے قرب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر تحقیق اور تدقیق سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسی خوابوں میں فاسق، فاجر، کافر، ملحد، زانی مرد اور، زانی عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں وہ اس روشنی اور نور سے بالکل محروم ہوتے ہیں جو مقربین اور اہل اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔

دنیا میں بے شمار ایسے آدمی ہو گزرے ہیں جن کو اپنے الہاموں اور خوابوں پر ناز تھا۔ لیکن جب ان کی نجی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایسے افعال قبیحہ میں مبتلا تھے جن کی سنگینی خود گناہوں کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ اگر ان کے بد افعال کی سیاہی دنیا میں پھیلا دی جائے تو دنیا سے نیکی کا نور بھی دب جائے۔ وہ ہر وقت شیطانی طاقتوں اور حدیث النفس سے مغلوب رہتے تھے ان کی سچی خوابیں اور الہام کسی روحانی وجاہت، بزرگی اور قرب الٰہی پر صادنہیں۔ ابن سیرین بہت بڑے معبر ہو گزرے ہیں۔ آپ کے پاس ایک شخص نے بیان کیا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ اس کی آستین میں چڑیاں گھستی اور نکل جاتی ہیں۔ آپ نے تعبیر کی کہ یہ شخص قاتل ہے جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی دیکھا تو بے شمار مقتولوں کی ہڈیاں نکلیں۔ اسی طرح ایک شخص نے دیکھا کہ وہ انڈوں کی زردی چھوڑ دیتا ہے آپ نے یہ تعبیر کی کہ یہ چور ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ذلیل کردار کے مالکوں کی بھی خوابیں سچی نکل آتی ہیں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ان کی باطنی ژرف نگاہی اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کی بات بیان کر دیتے ہیں راسپوٹین نے زار کی سویت کے خاتمہ کے متعلق پہلے بیان کر دیا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ راسپوٹین کی نجی زندگی سے کون ناواقف ہے وہ دنیا میں بدکاری کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کی سچی خوابیں آنے کی دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ وہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے لیے حجت ہیں اگر وہ سچی خوابوں کی حقیقت آشنا نہ ہوں۔ تو وہ خدا کے سامنے یہ عذر کر سکتے ہیں کہ ان کو نبوت کی حقیقت کا علم نہیں تھا دوسری وجہ یہ ہے کہ عنایت ازلی نے انسانی فطرت میں قرب الٰہی کے حصول کے لیے تخم ریزی کی ہے۔ بعضوں کو سچی خوابیں اور الہام اس وجہ سے ہو جاتے ہیں تا کہ ان کو معلوم ہو سکے کہ ان کے لیے آگے قدم رکھنے کے لیے ایک کھلا روحانی میدان ہے جس کو طے کر کے قرب الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ان پر سچی خوابوں کا دروازہ بند ہو جائے تو وہ بیج جو خدا نے اپنے ہاتھ سے انسان کی فطرت میں بویا ہے بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

وحی الابتلاء کے ضمن میں ایک اور گروہ بھی ہے۔ جن کو سچی خواب اور الہام ہوتے ہیں۔ ان کا خدا سے کچھ تعلق بھی ہے۔ وہ اپنی اصلاح نفس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور خدا کے قرب کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ ایک سطحی قسم کی نیکی کی تاثیر ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس وجہ سے ایک محدود دائرہ تک رویائے صادقہ کے انوار ان میں پیدا ہو جاتے ہیں مگر ظلمت، تاریکی اور ابتلاء سے خالی نہیں ہوتے۔ وہ تقویٰ کی باریک راہوں سے نابلد ہوتے ہیں راست بازی اور قلبی طہارت سے خالی ہوتے ہیں ان کے دل کے پردوں میں تکبر، نخوت، عجب، دنیا پرستی مضمر ہوتی ہے شیطان ان کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش کے وقت ان کے گھر کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ ان کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ ہاں اگر خدا کا فضل ان کے شامل ہو جائے تو وہ پردے میں ہی اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ ان کی مثال اس طرح کی ہے کہ صاف شفاف پانی ہو، اس کے نیچے گوبر اور گند ہو اگر ہوا کا جھونکا نہ آئے تو گند اپنی جگہ ہی ساکن رہتا ہے لیکن ذرا تیز ہوا کا جھونکا آ جائے تو پانی کی لہریں ہی گند کو پانی کی سطح کے اوپر لے آتی ہیں اور گند ظاہر ہو جاتا ہے۔

وحی الاصطفاء:

وحی الاصطفاء کے دائرہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو خدا کی محبت اور عشق کی آگ میں داخل ہو کر گناہوں کی آلائشوں کو بالکل جلا دیتے ہیں وہ اکمل اور اتم طور پر خدا سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے اللہ تعالیٰ سے قرب اور تعلق کی یہ نشانی ہوتی ہے وہ خدا کی صفات کے مظہر بن جاتے

ہیں اپنے اوپر ایک موت وارد کر لیتے ہیں ایسی روحانی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں جو بالکل پہلی زندگی سے متغائر ہوتی ہے یہ لوگ روشنی کے اس ارفع مینار پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں تاریکیوں اور ظلمتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ شیطان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں۔ نہ ان پر نفس امارہ غالب آ سکتا ہے نہ حدیث النفس اور نہ شیطان اپنے وساوس ان کے قلوب میں ڈال سکتا ہے۔ وہ بالکل خدا کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت 29 : 69) اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں۔

وحی الاصطفاء کی اقسام

وحی الاصطفاء کی دو قسمیں ہیں۔

1۔ وحی نبوت (وحی متلو):

یہ وحی، وحی شرعی بھی کہلاتی ہے اور اس کا نام ''کتاب'' ہے۔ قرآن مجید کے آغاز میں ذکر ہے ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ 2 : 2) یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ اس آیت کریمہ میں کتاب سے مراد وحی نبوت ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل کی گئی۔ یہ وحی صرف انبیاء علیہم السلام سے مختص ہے۔ شرعی اصطلاح میں وحی نبوت کی تعریف یہ ہے۔ ''کلام اللہ المنزل علی نبی من انبیاء (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ص 18 ج 1 دار الطباعۃ العامرہ استنبول مصنفہ بدر الدین) اللہ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔

یہی وہ کتاب ہے جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: فاران ہی کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اس کے داہنے ہاتھ میں پیدائشی شریعت ان کے لیے تھی۔ (استثناء 2:3:)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔'' (یوحنا 16 :11) سچائی کی راہ دکھائے گا کے الفاظ ھدی للمتقین کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں وحی نبوت 'کتاب' کے معنی میں بے شمار جگہ آئی ہے۔

2- وحی غیر متلو:

وحی نبوت کے علاوہ جو وحی نبی پر نازل ہوتی ہے وہ وحی غیر متلو کہلاتی ہے اور وہ شیطانی تحریکات واثرات سے بالکل منزہ ہوتی ہے۔ نبی اس وحی کی مدد سے شریعت کے اصول کی تشریح کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے اوتیت الکتاب و مثلہ یعنی مجھے کتاب اور اس کی مثل بھی دی گئی ہے۔ کتاب سے مراد وحی متلو (وحی جلی) یعنی قرآن مجید ہے اور مثل سے مراد وحی غیر متلو (وحی خفی) یعنی قرآن مجید کے مجملات، متشابہات اور فروع کی توضیح وتشریح ہے۔ وحی متلو کا یہ خاصہ ہے اس کے ساتھ تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔

اول مکاشفات صحیح:

اس کی مثال رسول کریم ﷺ کو اس دنیا میں کشفی رنگ میں بہشت اور دوزخ کا نظارہ دکھایا جانا ہے۔ قرآن مجید میں جنت اور دوزخ کی خبر ہے۔ کشف نے اس خبر کو معائنہ ومشاہدہ میں بدل دیا۔ اسی طرح آپ کی گزشتہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ بھی کشفی رنگ میں ہوئیں۔

دوم، رویاء صالحہ:

رویا صالحہ کے ذریعہ علم استعارات وحجابات انسان پر کھل جاتا ہے اور علوم تعبیر میں مہارت پیدا ہوتی ہے، اس وجہ سے نبی کمالات اور معارف یقینیہ کی طرف تیزی سے ترقی کرتا ہے۔

سوم۔ وحی خفی:

جو تفہیمات الٰہیہ کے نام سے موسوم ہوتی ہیں اس کو وحی غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔ صوفی اس کو وحی خفی اور وحی قلب کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس وحی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وحی متلو کے بعض مجملات اور اشارات نبی پر کھل جائیں مثلاً نماز کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے لیکن جس رنگ میں آج مسلمان نماز ادا کر رہے ہیں اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے اس مجمل حکم کو وحی خفی نے رسول کریم ﷺ پر کھول دیا۔

وحی ولایت:

جب یہ غیر متلو وحی غیر نبی کو ہوگی تو اس وحی کو وحی ولایت کہیں گے۔ اولیاء کرام اسی وحی سے مختص ہوتے ہیں۔ ولی کی یہ وحی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ علم کلام کا عام مسئلہ ہے "وَالْإِلْهَامُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عِنْدَالشَّرْعِ یعنی ولی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔

سر سید اور دیگر حکماء کی غلطی:۔ جب سر سید اور ان کے ہم خیال حکماء اور علماء کے نظریہ وحی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحی کی پہلی قسم کو ہی انسان کے لیے وحی ہدایت سمجھتے ہیں۔

جس طرح چرند پرند اور حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے فطرتی وحی ودیعت کر رکھی ہے اسی طرح انسان کو بھی وحی فطرت دے رکھی ہے جس سے وہ ہدایت پاتا ہے گویا انسان اور حیوان وحی فطرت کے لحاظ سے ایک ہی زمرہ میں آتے ہیں۔ نیچری انسان کو اس سے بلند مقام نہیں دیتے جب کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ:

حیوان سے برعکس انسان کے دو حصے ہیں ایک تو وہ حصہ جو قدرت کی ہدایت کے مطابق بے اختیار اور بغیر قوت ارادی کے چل رہا ہے مثلاً ہمارے جسم کا اندرونی نظام وغیرہ۔ انسان کا دوسرا حصہ ملکوتی ہے جو انسان کو دنیا کی تمام اشیاء سے امتیاز بخشتا ہے جس کے تحت انسان علم حاصل کر کے تمام کائنات کا حاکم بنتا ہے انسانی عقل، ادراک اور شعور کا مرکز قلب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قلب کو حصول علم کے لیے حواس ظاہری اور حواس باطنی عطا فرمائے ہیں۔ ہم حواس ظاہری سے سن کر، دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس علم کو قلب میں منتقل کر دیتے ہیں پھر قلب عقل وشعور کے سامنے پیش کرتا ہے اور عقل صحت اور عدم صحت کا حکم نافذ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس علم کے حصول کے ذرائع خارج میں پیدا کیے ہیں۔ اس بات سے اتفاق نیچری حکماء وفلاسفہ کو بھی ہے لیکن اختلاف ہے تو وحی کی ماہیت اور نوعیت پر۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس ظاہری کے مقابل پر حواس باطنی بھی عطا فرمائے ہیں۔ ظاہری حس باصرہ کے بالمقابل باطنی آنکھ، حس سامعہ کے بالمقابل باطنی کان، حواس ذائقہ، شامہ ولامسہ کے بالمقابل باطنی حواس ذائقہ، شامہ ولامسہ ہیں جس طرح ظاہری حواس کو نقصان پہنچتا ہے بعض اوقات معطل بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح باطنی حواس کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کا قلب گناہوں کی میل سے پاک رہے۔ جب انسان کا قلب گناہوں کی میل سے پاک صاف رہتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ انسان کے قلب مطہر پر وحی نازل کرتا ہے۔ انسان کے باطنی حواس، ظاہری حواس کی طرح نظارے دیکھتے ہیں ذائقے چکھتے ہیں خوشبو سونگھتے ہیں آوازیں سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ

نے صرف انسان کے دل کو ہی بااختیار و بارادہ بنایا ہے کہ وہ صحیح علم حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے اس لیے یہ ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ قلب کو ہی اپنی وحی کے لیے جائے نزول بناتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہی ایک نعمت گراں قدر عنایت ہوئی ہے جو دوسری مخلوق کو نہیں ملی۔

انسانی قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا ہے:

وحی الٰہی ایک علم ہے جو انسان کے مقصد حیات کو پورا کرنے کے لیے اس کی رہنمائی کرتا ہے چونکہ یہ علم باطن سے تعلق رکھتا ہے اس لیے براہ راست قلب کے حواس باطنی پر پڑتا ہے۔ جب اس علم کا نزول قلب کی حس باصرہ پر پڑتا ہے تو وحی ایک نظارے کی شکل میں ہوتی ہے جسے کشف اور رؤیا کہا جاتا ہے۔ جب قلب کی حس سامعہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو موحی الیہ کو ایک لطیف، پُرشوکت، پُررعب اور لذیذ کلام سنائی دیتا ہے۔ جب قلب کی حس ذائقہ پر نزول ہوتا ہے تو موحی الیہ ایک خوش ذائقہ چیز کی حلاوت اور لذت زبان پر محسوس کرتا ہے جب قلب کی قوت شامہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو ایک عجیب خوشبو کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پیراہن سے خوشبو محسوس کی اور فرمایا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف 12 : 94) یقیناً میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو۔

یہ قلب کی باطنی قوت شامہ کا احساس تھا اس طرح جب قلب کی قوت لامسہ پر اس کا نزول ہوتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کسی کلام نے آ کر اس کے دل کے پردوں کو چھوا ہے اور وہ الفاظ دل کے باطنی کانوں کو سنائی دیتا ہے۔ یہ عجیب و غریب احساس ہوتا ہے جس کی لذت اور کیفیت وہی بیان کر سکتے ہیں جو صاحب حال اور روحانی کوچہ سے آشنا ہوتے ہیں جن کے حواس باطنی گناہوں، دنیاوی الائشوں، تکبر و نخوت کے دبیز پردوں سے ناکارہ ہو چکے ہیں وہ اس الٰہی راز کو نہیں سمجھ سکتے۔

ظاہری حواس اور باطنی حواس کا باہمی تعلق:

ظاہری حواس اور باطنی حواس میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ تعلق قائم رہے تو ظاہری حواس خارج سے علم حاصل کر سکتے ورنہ نہیں۔ مثلاً قلب کا نظام خراب ہو جائے تو انسان کی آنکھ دیکھ رہی ہوتی۔ چونکہ قلب کا نظام خراب ہو چکا ہے اس وجہ سے انسان کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو قلب میں منتقل نہیں کیا یا دیکھی ہوئی چیز کا شعور قلب میں منتقل نہیں ہوا۔ اس وجہ سے انسان باوجودیکہ وہ خارج میں کسی چیز کو دیکھ رہا ہے لیکن اس کا شعور ذہن میں منتقل نہ ہونے کی وجہ سے وہ علم کا درجہ نہیں پاتا۔ اس طرح خارج سے آواز سن رہا ہے لیکن قلب میں منتقل نہ ہونے کی وجہ سے وہ شعور علم کا درجہ حاصل نہیں کر رہا یہ مرض ہے۔ ہزاروں مریض ایسے دیکھے جا سکتے ہیں کہ وہ دیکھ رہے سن رہے ہیں لیکن ان کو کوئی شعور نہیں ہوتا کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں اور کیا سن رہے ہیں۔ بعض ایسے آدمی بھی ہوتے ہیں جو رنگوں میں تمیز نہیں کر پاتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی وہ قلبی قوت مردہ ہو چکی ہے جو رنگوں میں تمیز کرتی ہے اس طرح ایسے آدمی بھی پاتے ہیں جو ذائقہ میں تمیز نہیں کر پاتے۔ ان کو بھی یہی بیماری ہے۔

الغرض ظاہری حواس اور قلبی حواس میں ایک گہرا واسطہ ہے اس سے انسان اعلیٰ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر ظاہری حواس میں سے آنکھ ضائع ہو جائے تو وہ اندھا ہے اگر شنوائی ختم ہو جائے تو وہ بہرا ہے اس کے ساتھ اگر ظاہری حواس ٹھیک ہیں لیکن قلبی حواس میں سے کوئی حس ضائع ہو گئی ہے تو پھر بھی ظاہری حس بیکار ہے کیونکہ ظاہری حس کا تعلق (قلبی و باطنی) حس سے منقطع ہو چکا ہے انسان زندہ ہے لیکن ظاہری حس کا باطنی حس سے رشتہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے ایک مردہ کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ بات آج سائنس نے ثابت کر دی ہے اس لیے باطنی

حواس سے انکار محض جہالت ہے۔

قلب پر نزول وحی کی کیفیت:

قلب پر نزول وحی کے متعلق تین امور کا جاننا ضروری ہے۔

1- حواس ظاہری کا تعلق:

جب اللہ تعالیٰ انسان کے حواس باطنی پر وحی نازل کرتا ہے تو حواس ظاہری اس وقت معطل ہو جاتے ہیں تا کہ عالم ظاہر کے محرکات و تاثرات سے عالم باطن کے محرکات و تاثرات خلط ملط نہ ہو جائیں۔

2-ایک ہی وقت میں متعدد حواس پر وحی کا نزول:

بعض اوقات وحی کا نزول ایک ہی وقت میں کئی حواس باطنی پر ہوتا ہے یعنی قلب ایک ہی وقت میں دیکھتا بھی ہے سنتا بھی ہے چکھتا بھی ہے۔

3-باطنی و ظاہری حواس میں اشتراک:

انسان کے حواس باطنی اور ظاہری میں ایک حس مشترک ہے کہ انسان باطن کی ہر ایک حس کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح وہ ظاہر کی حس کو محسوس کرتا ہے مثلاً وحی کے وقت کسی انسان کو باطن کی آنکھ کے احساس کی کیفیت اسی طرح ہو گی جس طرح آنکھ سے دیکھنے کے وقت ہوتی ہے۔ حس مشترک کی وجہ سے موحیٰ الیہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی آنکھ ہے جس سے وہ دیکھ رہا ہے اسی طرح دوسرے حواس کا معاملہ ہے غرض کہ یہ حس مشترک باطنی حواس کو ظاہری حواس کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ بعض اوقات موحیٰ الیہ کو مغالطہ لگ جاتا ہے کہ آیا جو نظارہ اس نے دیکھا ہے وہ عالم ظاہر کا ہے یا عالم باطن کا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب آگ کی روشنی دیکھی تھی وہ باطنی نظارہ تھا لیکن مشترک حس نے اس قدر غلبہ اختیار کر لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں محسوس کیا کہ وہ ظاہری آنکھ سے آگ کی روشنی دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ باطنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے لیکن عالم باطن کی آواز نے اس مغالطہ کو دور کر دیا۔

کلام الٰہی کی تین صورتیں:

ظاہری حواس اور باطنی حواس کی اس وضاحت کے بعد اہم یہ بات رہ جاتی ہے کہ انسان پر نازل ہونے والے کلام الٰہی کی کتنی صورتیں ہیں۔

قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ کی انسان کے ساتھ ہم کلامی کی تین صورتیں ہیں قرآن مجید میں آتا ہے کہ مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَایَشَآءُ (الشوریٰ 42 : 51)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں:

وَحْیًا (وحی)۔ 2- مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (پردے کے پیچھے سے) 3- یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَایَشَآءُ (رسول کے ذریعے وحی)۔

صورت اول میں وحی سے مراد مسلمہ طور پر ''القائی الروع'' لیا گیا ہے کیونکہ وحی کے معنی اشارہ سریعہ کے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف

سے سرعت کے ساتھ ایک خیال بغیر کسی غور وخوض کے اچانک دل میں ڈالا جاتا ہے وہ ایک نیا علم ہوتا ہے۔ جو دل میں بجلی کی سرعت کے ساتھ آتا ہے اور اسرار الٰہیہ سے پردہ اٹھا دیا جاتا ہے۔ تمام پوشیدہ حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں جس طرح تاریک کمرہ میں روشن چراغ آجائے کمرہ کی تمام تاریکی کافور ہو جاتی ہے ہر ایک نشیب وفراز سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اس کو وحی خفی کہتے ہیں یہ وحی کی ادنیٰ صورت ہے اس میں نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہوتے ہیں۔

وحی کی دوسری صورت مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ہے یعنی پس پردہ اس میں رویاء کشف اور الہام شامل ہیں۔ اس صورت میں انسان کو علم حواس باطنی کے ذریعے خارج سے آتا ہے واضح طور پر محسوس کرتا ہے مگر متکلم اور نظارہ دکھانے والے کو نہیں دیکھتا۔ اس صورت میں بھی نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہیں۔

وحی کی تیسری صورت: اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ہے یعنی جبرائیل امین کے ذریعے وحی انسان کو پہنچائی جاتی ہے اس کا نزول بھی خارج سے حواس باطنی پر ہوتا ہے لیکن اس وحی کے لیے حواس سامعہ اور باصرہ مخصوص نہیں۔ یہ وحی انبیاء علیہم السلام پر ہی نازل ہوتی ہے غیر نبی اس میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ وحی کی اعلیٰ ترین واضح اور بین اور یقینی صورت ہے۔ قرآن مجید اور دوسری کتب سماوی اس وحی اعلیٰ کی حامل ہیں۔ اس وحی کو وحی متلو بھی کہتے ہیں یعنی وہ وحی جو الفاظ میں پڑھی جاتی ہے اس کو وحی نبوت بھی کہتے ہیں اور قرآنی اصطلاح میں اس کو کتاب کہتے ہیں۔ کتاب اس وجہ سے کہ وہ ایک شاہی فرمان کی حیثیت رکھتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نبی پر نازل کرتا ہے تاکہ نبی اسے بنی آدم تک پہنچا دے اور لوگ اس فرمان کے مطابق زندگی گزاریں۔

پس قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے نبی کے دل پر وحی کرتا ہے۔ یہ وحی خارج سے آتی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ 2 : 97) کہہ جو جبرائیل کا دشمن ہو اس کو تو غصے میں مر جانا چاہیے بے شک اس نے اللہ کے حکم سے تیرے دل پر اتارا۔

پس قرآن مجید کی رُو سے وحی کا تعلق خارج سے ہے۔ یہ ایک علم ہے اور ایسا علم جس کی روشنی سے انسان اپنی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے ایک نعمت ہے اسی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کے مقام پر کھڑا ہے۔ اگر وحی کو محض قلب کی آواز ہی قرار دے لیں کہ قلب سے اٹھتی ہے اور قلب میں ہی گر جاتی ہے تو انسان اور حیوان کے درمیان سے تمیز ہی اُٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ حیوان بھی قلبی وحی کا حامل ہے اور اسی کے ذریعے زندگی گزار رہا ہے۔

......☆☆☆......

وحی کی ضرورت واہمیت

بعض حکماء، فلاسفہ اور مفکر اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دے دی ہے تو پھر زندگی کے معاملات چلانے کے لیے وحی یا اس قسم کے کسی اور نظریہ پر بنیاد رکھنا انسانی عقل کی توہین ہے بعض تو وحی کے تصور کو ہی لایعنی اور دقیانوسی خیال کرتے ہیں۔ بعض ایسے مسلم مفکر ہیں جو کسی قسم کی وحی جاری ہونے کے مخالف ہیں اور نہ وہ وحی کی تقسیم مانتے ہیں۔ وہ وحی صرف وحی نبوت قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی اختراع قرار دیتے ہیں۔ مسلم مفکرین میں سے ایک اہم مفکر علامہ غلام احمد پرویز صاحب ہیں۔

دراصل یہ اسلام کی حقانیت، برکات اور فیوض کا انکار اور فلسفہ وحی کا استہزاء ہے۔

وحی کی ضرورت:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے اور خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا اور اشرف المخلوقات بنایا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ انسانی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ نے برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے سقراط کا مقولہ مشہور ہے ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم واضح الفاظ میں اقرار کرتا ہے کہ ''انسان ذی عقل مخلوق ہے اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی عقل وفہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت واذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔

(ہیومن انڈر اسٹینڈنگ مصنف ڈیوڈ ہیوم بحوالہ فہم انسانی ص 5 مترجم پروفیسر عبدالباری)

دیمقراطیس کا قول ہے سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں (لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ بیا گرافیکل ہسٹری آف فلاسفی) ص 107 بحوالہ فہم انسانی ص 11)

جب انسان کی عقل ناقص ہے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو اپنی عقل کے ناخن تدبیر سے پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کرے گا وہ صحیح نہ ہوں گے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے وہ صدیوں تک دنیا میں مقبول اور رائج رہے آخر آج موجودہ فلسفہ یورپ نے ان کو بالکل باطل قرار دے دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج جو فلاسفہ عقل کے زور سے جن نظریات کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں وہ مستقبل میں بھی قائم ودائم رہے گی۔

دور حاضر میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ سود کو اقتصادی نظام کے لیے بہتر سمجھتے ہیں اور بعض اس کو بالکل متضاد سم قاتل سمجھتے ہیں۔ صرف ایک ہی معاملہ نہیں بے شمار معاملات ہیں جن کے بارے میں دانشوروں کا اختلاف ہے۔ اس لیے ہی قرآن مجید نے انسان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ خُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ پھر عقل انسانی کا فائدہ کیا جب وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر رہنمائی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل پھر بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت اور نعمت ہے جس طرح خدا کے دوسرے حواس مثلاً

قوت سامعہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ اور قوت باصرہ نعماء عظمیٰ میں سے ہیں اسی طرح انسانی عقل بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی حواس ایک حد کے اندر محدود ہیں۔ انسان کی آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے جو چیز اس کی حد سے باہر ہوگی اس کو نہیں دیکھ سکے گی اور اگر کوئی فیصلہ صادر کرے گی تو غلطی کا قوی امکان ہے اسی طرح کان ایک حد تک سُن سکتے ہیں اگر اس حد سے باہر کی آواز کو سننے کی کوشش کریں گے تو وہاں بھی غلطی کا امکان ہے۔ اسی طرح روحانیت کے بے شمار معاملات ہیں جو انسان کی عقل سے بالاتر ہیں ان کا احاطہ کرنا انسان کی عقل سے بعید تر ہے اور عقل کا ٹھوکر کھانے کا احتمال ہے۔ ایسے معاملات میں وحی الٰہی کا عقل کی دست گیری کرنا لازمی اور لابدی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے امور میں مدد اور دست گیری نہ کرے تو اللہ کی صفت رحمانیت پر زد پڑتی ہے اور قیامت کے روز انسان اپنی لغزشوں کے بارے میں حق بجانب ہوگا۔ جب باریک در باریک، نہاں در نہاں امور سے متعلق اس کی رسائی ہی نہیں تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی ہی نہیں کی تو پھر اس کا حساب کتاب کیسا؟

جس طرح ایک انسان اپنی قوت باصرہ کے لیے خوردبین اور دوربین باریک اور دور کی اشیاء دیکھنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے وہ آلے انسان کی قوت باصرہ کو اس کی حد سے پرے کی اشیاء کو دیکھنے پر مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی عقل انسانی کو اس کی حد سے باہر نکال کر ایسے امور کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے جو حواس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ پس وحی عقل کے خلاف نہیں ہے بلکہ عقل کے لیے روشنی کا مینار ہے تاکہ انسان ان چیزوں کا احاطہ کر سکے جو اس کی عقل سے بالاتر ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسانی رہنمائی کے لیے سلسلہ انبیاء شروع کیا۔ انبیاء کو احکامات سکھائے تاکہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ کس طرح خلیفۃ اللہ بن کر زندگی گزارنی ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکامات کی روشنی میں اپنی عقل کو استعمال کیا اور تہذیب و تمدن کی عمارت استوار کرتا چلا آیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے یہ انسانی ارتقاء اسی وقت ہو سکتا تھا جب انسان کو عقل جیسی نعمت عطا کر کے اس کو وہ احکامات بھی سکھا دیتا جن کی روشنی میں ان پر عمل کرتا اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتا۔ احکامات ہمیشہ باہر سے آتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ریاست کا نظام چلانے کے لیے حاکم ہی احکامات جاری کرتے ہیں اور عوام ان پر عمل کرتی ہے۔ اگر حکومت احکامات جاری نہ کرے تو عوام کی عقل پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود ہی اپنی سمجھ سے کام چلاتے رہیں تو دنیا میں انارکی اور فساد برپا ہو جائے گا یہی معاملہ خدا کی حکومت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک ضابطے کے تحت زندگی بسر کرنے کے لیے انبیاء کے ذریعے احکامات نازل فرمائے۔ تاکہ انسان ان پر عمل کر کے ایک منظم زندگی بسر کر سکے۔ گویا وحی عقل کی نقیض نہیں بلکہ اس کی معاون اور روشنی کا ذریعہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا وحی تا قیامت جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس ظاہری کے مقابل پر حواس باطنی عطا کیے ہیں حواس ظاہری کو کام میں لانے کے لیے قدرت نے خارج میں ہر قسم کا سامان مہیا کیا ہوا ہے تو پھر یہ کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ حواس باطنی پہلے تو انسانوں میں موجود تھے اب مفقود ہیں اور ان کی تربیت کا سامان ختم ہو چکا ہے، وحی ولایت کے ختم کرنے کے ساتھ یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان میں حواس باطنی مفقود ہو چکے ہیں لیکن یہ خلاف واقعہ بات ہے۔ انسان کے اندر حواس باطنی جیسے پہلے موجود تھے اب بھی موجود ہیں جب انسان کے اندر حواس باطنی موجود ہیں۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کی تربیت اور پرورش کے لیے وحی ولایت کا دروازہ کھلا ہے اور نسل انسانی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے ہمیشہ متمتع ہوتی رہے گی۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں سے اجرائے وحی ولایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس 10 : 63) اور جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوش خبری ہے اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

"البشریٰ" جو ایک متقی انسان کو اس زندگی میں دی جاتی ہیں رسول کریم ﷺ کی حدیث کی رو سے رویائے صالحہ صادقہ ہیں۔ حدیث صحیح میں اس کی صریح موجود ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ (بخاری 7 : 91) نبوت میں سوائے مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہا۔

صحابہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟

آپ (ﷺ) نے فرمایا رویا صالحہ (بخاری 5: 91) بخاری میں ابوسعید خدریؓ سے روایت اَلرُّؤْيَاءُ الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ یعنی رویاءِ صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ قرآنی آیت اور احادیث یہ بات واضح کرتی ہیں کہ وحی ولایت اپنی ادنیٰ صورت میں جاری ہے۔ ہاں وحی نبوت جو جبرائیل امین نبی پر لے کر آتا ہے قیامت تک بند ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی نبوت احکام شریعت پر مبنی ہوتی ہے۔ جب احکام شریعت قرآن مجید کی شکل میں مکمل ہو چکے ہیں تو وحی نبوت کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بصیر، سمیع، مجیب اور باسط وغیرہ ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے کلام کرنا بھی اس کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بھی معطل نہیں ہو سکتی، اس سے نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے پاک اور منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ اگر مبشرات کا دروازہ بند تسلیم کر لیا جائے تو انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ انسانی پیدائش کی غرض ہی یہ ہے کہ وہ اپنی روحانی استعدادوں کو زندہ رکھے۔ روحانی زندگی اس وقت تک میسر نہیں آ سکتی جب تک کہ وہ مبشرات اور رویاء صالحہ کے پانی سے سیراب نہ ہو۔

امت محمدیہ ﷺ کے تمام اولیاء کرام و علماء عظام اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف ہو جاتا ہے۔ کتاب فتح ربانی کی 53 ویں مجلس میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے کسی نے سوال کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول جبرئیل فرشتہ آتا ہے اور اولیاء کی طرف اس کا کون رسول آتا ہے جواب میں فرمایا ان کا بھی بلاواسطہ وہی رسول ہے (فتح ربانی مطبوعہ مصر مجلس 53)

وحی ولایت کا شرعی مقام:

وحی ولایت کسی کے لیے قابل حجت نہیں نہ اس کا اتباع فرض ہے۔ کتب کلام کا مسئلہ ہے و الالہام لَيْسَ بِحُجَّةٍ عند الشَّرع وحی کا الہام شرعی قانون نہیں بن سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے مختلف مواقع پر بحث کی ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر کسی وحی کا الہام ظاہراً حکم شرعی کے خلاف جو تو فتویٰ ظاہر شریعت کے مطابق ہوگا۔ علامہ الشاطبی فرماتے ہیں کہ اگر کسی کشف، الہام یا خواب کے ذریعے کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن و سنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک درست ہیں۔

(الاعتصام ص 351 فمابعد ج 1 مطبعۃ المنار مصر 1331ھ بحوالہ البلاغ جمادی الاول 1393ھ شمارہ 5)

......☆☆☆......

رویاء (خواب) پر فرائیڈ کا اعتراض

فرائیڈ خواب کی بنیاد محض تمنا اور خواہش پر رکھتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ جو شخص دن بھر تمنائیں اپنے قلب و ذہن میں لیے پھرتا ہے وہ ان کو رات کے وقت خواب کی شکل میں دیکھ لیتا ہے۔

دوسرے علم تجزیہ نفس کے علماء مثلاً ژونگ وغیرہ نے فرائیڈ کے نظریہ خواب کے رد پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن پہلے قارئین کے سامنے مختصراً اسلامی نظریہ بیان کیا جاتا ہے۔

انسان میں خواب دیکھنے کی استعداد:

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قلب انسانی ایک شیشہ کی طرح ہے جو عالم جسمانی اور عالم روحانی کے درمیان برزخ کی طرح واقع ہے وہ عالم اجسام سے بھی متاثر ہوتا ہے اور عالم روحانی سے بھی اور انسان جو خواب دیکھتا ہے وہ یا تو عالم اجسام کے زیر اثر دیکھے گا یا عالم روحانی کے زیر اثر۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ انسان کے اندر جو یہ استعداد رکھی گئی ہے بے سود اور بے مقصد نہیں۔

جب عالم جسمانی کے تحت کوئی خواب آئے گی تو وہ حدیث النفس یا اضغاث الاحلام کہلائے گی۔

جب عالم ارواح کے تحت کوئی خواب آئے گی تو رویاء صادقہ ہوگی۔ قرآن مجید میں رویاء صادقہ کو "مِن وَرَاءِ حجاب" کے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی پس پردہ اس میں رویاء کشوف شامل ہیں اس حالت میں خواب دیکھنے والا نظارہ دکھانے والے کو نہیں دیکھتا محض ایک نظارہ نیند میں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ احادیث میں رسول کریم ﷺ کی ابتدائی خوابوں کا ذکر موجود ہے۔ وہ فلق صبح کی طرح پوری ہو جاتی تھیں اس قسم کی خوابوں کا دیکھنا صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں۔

قلب پر عالم ارواح کے انعکاس کا طریقہ:

قلب پر عالم ارواح کا اثر دو طریقے سے پڑتا ہے۔ یا تو جو نظارہ انسان کے قلب پر وارد ہوا ہے وہ فلق صبح کی طرح پورا ہو جاتا ہے اس میں کسی قسم کی دھندلک اور شبہ نہیں ہوتا۔

بعض اوقات عالم ارواح کے زیر اثر جو خوابیں آتی ہیں ان میں استعارات اور مجازات ہوتے ہیں۔ وہ تشریح طلب ہوتے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید کی سورت یوسف میں آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو قیدی تھے۔ دونوں سزائیں کاٹ رہے تھے۔ ایک نے جو بادشاہ کا ساقی تھا خواب میں دیکھا کہ وہ انگور سے شراب نچوڑ رہا ہے۔ اس کا جواب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیا کہ وہ قید سے رہا ہو کر بادشاہ کا ساقی ہی رہے گا۔

دوسرے نے دیکھا کہ وہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے لے جا رہا ہے اور پرندے اس میں سے کھاتے ہیں۔ حضرت یوسف

علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر کی کہ اس کو صلیب دی جائے گی اور اس کے سر سے پرندے گوشت اور مغز نوچ نوچ کر کھائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پہلی خواب واضح نظارے میں تھی جو ظاہری الفاظ میں پوری ہوگئی جب کہ دوسری خواب استعارہ کے رنگ میں تھی اور تشریح طلب تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے استعاراتی نظارے کی وضاحت کر دی۔ اس طرح بادشاہ نے بھی خواب دیکھی درباریوں نے اس کو اضغاث الاحلام قرار دیا جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو رویاء صادقہ قرار دے کر تعبیر کی۔

فرائیڈ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنے علم کو عالم اجسام تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے خوابوں کو محض تمناؤں اور خواہشوں کا ظل قرار دے دیتے ہیں اس کو حقیقت کا لباس نہیں پہناتے جب کہ اسلام فرائید کا نقطہ نظر رد کر کے یہ بھی رہنمائی کرتا ہے کہ انسان کے دل پر صرف عالم اجسام کا ہی اثر نہیں ہوتا بلکہ عالم ارواح کا بھی اثر ہوتا ہے۔ اسلام میں اس کی ایک مثال نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں ایسے انسان ملیں گے جن کو خوابیں عالم ارواح کے زیر اثر آئی ہوں گی۔ جتنا کسی کا قلب صاف شفاف ہوگا اس پر گناہوں کی میل نہیں ہوگی اور وہ توبہ اور استغفار کے پانی سے اپنے دل کی میل کو صاف کرتا ہوگا۔ وہ رویاء صادقہ کی نعمت سے ضرور متمتع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ استعداد محض اس وجہ سے رکھی ہے تا کہ انسان روحانی سلوک کی منازل طے کرتا چلا جائے۔

......☆☆☆......

قرآن مجید

قرآن مجید کے متعلق مولانا نیاز فتح پوری کے دس شبہات اوران کے جوابات

قرآن مجید کلام الٰہی نہیں، اس کا رد:

دور حاضر کے ایک اور بڑے عالم فاضل مولانا نیاز فتح پوری ہیں۔ ان کی تحریرات اور نگارشات سے ہندوستان اور پاکستان کے بعض صاحب علم حضرات ضرور متاثر ہیں، کئی کتب کے مصنف ہیں۔ ''من و یزداں'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ رسالہ ''نگار'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں وہ قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کا یہ نظریہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔

ان کے علاوہ آغاز اسلام میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے رہے ہیں جو قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے تھے ابوجہل، ابولہب اور دیگر عمائدین کفار وغیرہ اگر قرآن مجید کو کلام الٰہی مان لیتے تو پھر یقیناً وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے۔ اسی طرح دور حاضر میں مستشرقین اور ہندو علماء مثلاً دیانند سرسوتی وغیرہ قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس وجہ سے دونوں گروہوں (مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ) کا رد الگ الگ ہوگا۔ کیونکہ مسلم گروہ رسول کریم ﷺ کو سچا جانتا ہے لیکن قلب و ذہن میں کہیں کجی ہے جس کے نتیجہ میں قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے منکر ہیں یہ آج کا عقیدہ نہیں بلکہ مسلمانوں میں ایک پرانا عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ قرآن مجید مخلوق ہے۔ پہلے علامہ نیاز محمد فتح پوری کا نظریہ ان کے اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے پھر یہ انہی کے الفاظ میں یہ تجزیہ کیا جائے گا کہ کس حقیقت پر اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہیں جب تک مریض کے مرض کی تشخیص نہیں ہوتی مرض کا علاج مشکل ہوتا ہے علامہ صاحب کہتے ہیں:

''کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں''۔ (نگار جون 1940ء ص 68)

اسی طرح متعدد مستشرقین اور مغرب کے دانشور اور ہندو مفکر مثلاً دیانند سرسوتی بھی قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں مانتے، سرسوتی نے اس کا اظہار ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب اعتراض 135 میں کیا ہے۔

''اگر قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے کلام مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے''۔ (نگار اگست 1940ء ص 6) مولانا کے اس اعتراض کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی۔ دیانند سرسوتی نے اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر اسی قسم کا اعتراض کیا ہے۔ بہر حال میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ علامہ صاحب سرسوتی سے متاثر ہوئے ہیں بس یہی سمجھتا ہوں کہ علامہ صاحب کی اپنی سوچ اور سمجھ ہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے یا کلام رسول۔ تمام مذاہب میں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ بے شمار صفات کا مالک ہے۔ ان صفات میں سے ایک صفت کلام ہے۔ قرآن مجید اور دیگر کتب سماوی کلام الٰہی کا ہی مظہر ہیں جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (بقرہ) ان پیغمبروں میں سے بعض نے خدا سے باتیں کیں۔
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء) اور خدا نے موسیٰ سے باتیں کیں
وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ (اعراف) اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔
مذکورہ آیات سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ کلام کرنا خدا کی صفت ہے۔ جس کا اظہار اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے کلام کے اظہار کے طریقے بھی بیان کر دیئے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (شوریٰ 42 : 51)
کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کے پیچھے یا رسول بھیجے اور اپنے حکم سے اس کے ذریعے جو جی چاہے وحی کرے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی تین صورتیں بیان کی ہیں:
1-وحیا 2 من ورای حجاب (پس پردہ) ۔ 2- یرسل رسولاً فیوحی باذنہ مایشآءُ۔ (رسول و جبرائیل کے ذریعے) صورت اول میں وحی سے مراد مسلمہ طور پر ''القائی الروع'' ہے۔ دوسری صورت من ورای حجاب سے مراد رویاء، کشف اور الہام ہیں۔ اس صورت میں انسان کو علم حواس باطنی کے ذریعے خارج سے آتا ہے۔ انسان متکلم اور نظارہ دکھانے والے کو نہیں دیکھتا۔
کلام الٰہی کی تیسری صورت: ''اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ'' ایک رسول یعنی جبرائیل کے ذریعے وحی پہنچائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کا نزول آخری شکل میں ہوا ہے فرشتہ خدا کا کلام لاتا تو رسول کریم ﷺ اس کلام کو محفوظ کر لیتے تھے۔
نزول قرآن کا فاعل اللہ ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن میں نزول قرآن کا فاعل خود اللہ تعالیٰ ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف 12 :2) ہم نے اس کو (قرآن) کو عربی زبان میں اتارا۔
اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ o
(الرعد 13 : 37) اور اسی طرح ہم نے اسے عربی (زبان) میں اتارا اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم آ گیا تو تیرے لیے اللہ کے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ہو اور کوئی بچانے والا۔
تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ o (الرعد 13 : 1) کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔
اس آیت کریمہ میں قرآن مجید کے نزول کا فاعل خود اللہ تعالیٰ ہے پھر فرمایا جو تیری طرف نازل ہوا ہے حق ہے۔ پھر خدا کی طرف سے نزول کا انکار کرنے والوں کے متعلق فرمایا: ''اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اکثر لوگ نہیں مانتے۔
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا o (الدھر 76 : 23) ہم نے تجھ پر قرآن کو (تھوڑا تھوڑا کر کے) اتارا ہے۔
وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (محمد 47 : 2) اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر اتارا گیا وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ o بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعراء 26:192.... 195) یہ (قرآن) جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ جبرائیل امین اسے لے کر اترا ہے تیرے دل پر تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو کھول کر بیان کرنے والی

زبان میں (منارا گیا) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِo (ابراہیم 14 : 1) (یہ) کتاب (ہے) جو ہم نے تیری طرف اتاری تا کہ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے اس کے رستہ کی طرف جو غالب تعریف کیا گیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی قرآن مجید کے نزول کا فاعل خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو قرار دیا ہے۔ دوم رسول کریم ﷺ کی بعثت کی غرض بھی بیان کردی ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لایا جائے یعنی لوگوں کے فاسد عقائد کی اصلاح کی جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر 15 : 9) ہم نے ہی اسے (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔" اس آیت کریمہ میں حرف تاکید "اِنَّ" کے ساتھ نزول قرآن مجید کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کو (قرآن) کو اللہ تعالیٰ ہی نے اتارا ہے۔ دوم اس کی حفاظت کی پیشگوئی بھی فرمائی۔ جو نصف النہار کی طرح پوری ہوئی وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (النمل 27 : 6) اور یقیناً تجھے قرآن حکمت والے اور علم والے کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء 4 : 82) بھلا قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف ہوتے۔ اس آیت میں واضح طور پر قرآن مجید کے نزول کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔ ساتھ یہ دلیل دی ہے کہ یہ قرآن اختلافات سے پاک ہے۔

دوسری دلیل:-

قرآن مجید کے نزول کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ o اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o (القيمة 75 : 16 - 18) اس کے ساتھ اپنی زبان کو مت ہلا تا کہ اسے جلدی لے لے۔ ہمارے ذمہ اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے۔

بخاری میں ہے کہ ابتداء میں جب رسول کریم ﷺ پر وحی نازل ہوتی قوم تو آپ اسے جلدی جلدی لینے کی کوشش کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور تسلی دی کہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی یہ آیت واضح بتا رہی ہے کہ خارج سے قرآن مجید کے الفاظ آتے تھے رسول کریم ﷺ ان الفاظ کو جلدی یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر وحی قلب سے ہی اٹھتی تھی تو پھر الفاظ کو جلد لینے اور یاد کرنے کی کیا تک تھی۔ کیا اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز کے الفاظ کو یاد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کی وحی نہیں ہوتی تھی تو پھر تحریک لسان کی کیا ضرورت تھی۔

تیسری دلیل:

ارشاد الٰہی ہے مَا كَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَا اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ (یونس 10 : 2) کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ لوگ رسول کریم ﷺ پر وحی کی شکل میں نزول قرآن کو حیرانگی سے دیکھتے تھے اگر وحی محض اندر کی آواز ہوتی یا محض معمولی سوجھ بوجھ ہوتی تو اہل عرب اتنا کیوں تعجب کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کا ایک ایسا طریقہ تھا جو لوگوں کی سمجھ سے بالا تھا۔ یہ طریقہ خلاف عقل نہیں تھا۔ وہ لوگ محض عالم ارواح سے ناواقف تھے۔ ایک مسلمان کا محض جاہل آدمیوں کے پیچھے چلنا خود باعث

حیرانگی ہے۔

چوتھی دلیل:

نزول قرآن کے وقت رسول کریم ﷺ کی کیفیت:

احادیث میں رسول کریم ﷺ پر نزول وحی کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ کبھی وحی صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی آواز) کی طرح آتی۔ یہ صورت بہت ہی سخت ہوتی۔ دوسری صورت فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے پاس آ کر پیغام الٰہی پہنچاتا۔ وحی کی اس صورت میں آپ ﷺ کوئی دشواری اور بوجھ محسوس نہیں کرتے تھے۔

نزول وحی کے وقت رسول کریم ﷺ کی ظاہری حالت بدل جاتی تھی۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں: لَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ (بخاری 1:1) کہ میں نے سخت سردی کے دن آپؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھا کہ اس عمل سے آپ کو پسینہ چھوٹ جاتا۔ عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ وحی کی حالت میں کرب لِذٰلِكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ یعنی آپ سخت بے چین ہو جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ ایک اور حدیث ہے کہ آپؐ سر جھکا لیتے تھے۔ احمد بن حنبل کی روایت ہے تربد جلدہ ایک اور روایت۔ تربّد لذلك جسده و وجهُه کہ آپؐ کے جسم اور چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وحی آئی تو رسول کریم ﷺ کی ران کے نیچے اُن کی ران تھی مجھ پر اتنا دباؤ پڑا مجھے خیال ہوا کہ میری ران کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ (بخاری 12:8)

قرآن مجید نے بھی اسے قَوْلًا ثَقِيْلًا (وزنی کلام) کہا ہے۔ اس صورت میں وحی کے اَشَدّ اور اَثقل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کو مادیت سے منخلع ہو کر کلی طور پر عالم روحانی کی طرف منتقل ہونا پڑتا تھا تاکہ سامع (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) اور حامل وحی یعنی جبرائیل علیہ السلام) میں مناسبت سماع پیدا ہو جائے چونکہ اس وقت آپ کی جہت بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وحی کی یہ صورت آپ ﷺ پر اثقل اور شدید تر ہوتی تھی۔

رسول کریم ﷺ کی یہ حالت انفعالیت ظاہر کرتی ہے کہ آپ کوئی خارجی حقیقت قبول کر رہے ہیں۔ یہی حالت ظاہر کرتی ہے کہ وحی خارج سے آتی ہے اگر اندرونی چیز ہوتی تو آپ پر انفعالیت کے آثار نہ ہوتے اور آپ کا اس میں کوئی اپنا ارادہ شامل نہیں ہے۔

مولانا فتح پوری کی علمی غلطی کا کھوج:

مولانا صاحب علمی شخصیت کے مالک ہیں لیکن کسی صاحب علم شخصیت کا علمی مغالطہ میں پڑ جانا کوئی بعید نہیں۔ اسی علمی مغالطہ میں بنو عباس کے دور کے علماء بھی پڑے تھے اور علماء ربانی نے ان کے مغالطہ کی اصلاح کی۔ وہ مغالطہ آج بھی کتب میں ہی لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ آج خال خال معتزلہ کے نقطہ نظر کے حامی نظر آئیں گے اور انہی میں سے ایک محترم شخصیت نیاز محمد فتح پوری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خاکسار تو اُن کی علمی شخصیت کے سامنے ہیچ ہے لیکن علماء ربانی کے علم کلام کی روشنی میں علامہ نیاز فتح پوری کی مغالطہ آمیزی پر قلم اٹھا رہا ہوں۔

مولانا کے رسالہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موصوف وحی کی کیفیت و ماہیت سے ناواقف ہیں۔ اور انہوں نے وحی کی تعریف بھی عربی لغت سے ہٹ کر کی ہے مولانا لکھتے ہیں:

"وحی کے لغوی معنی اشارہ سریع یا الہام یا سرعت کے ہیں اُردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا

ہے'' (نگار جولائی ص 59)

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد وہ تاثرات ہوں گے جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے پہلے تو امام راغب کے عام لغوی معنی لکھے ہیں، اس کے بعد لفظ ''وحی'' کا اپنا خود تراشیدہ مفہوم ''برمحل سوجھ بوجھ'' کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی، ماہر لغت نے بھی یہ معنی نہیں کیے۔ جب ہم ماہرین لغت عربی کے بیان کردہ معانی پر نظر دوڑاتے ہیں تو وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں: الوحی الاشارة الکتابة والرسالة والکلام الخفی وکل ماالقیه الی غیر یعنی وحی کے معنی اشارہ کرنا۔ لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپ کر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیال میں ڈالو۔ کسائی عرب کا محاورہ لکھتا ہے: وحیت الیه بالکلام واوحیه الیه هوان تکلم بکلام تخفیة من غیره یعنی کسی سے اس طرح کلام کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔

ابو اسحاق لغوی کہتا ہے: اُصل الوحی فی اللغة کلها اعلام فی خفاء یعنی وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔ مفردات میں امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: اصل الوحی الاشارة السریعة لتضمن السرعة قبل امروحی ذاك یکون بالکلام علی سبیل الرمز والتعریض و قدیکون بصوت مجرد عن الترکیب وباشارة ببعض الجوارح وبالکتابة یعنی وحی کے اصل معنی ہیں اشارہ سریعہ اسے سُرعت یعنی جلدی کی وجہ سے کہا جاتا ہے امر وحی یعنی جلد سے جلد ظاہر ہونے والی بات اور یہ کبھی تو گفتگو سے ہوتی ہے کبھی اشاروں سے ہوتی ہے اور کبھی تحریر کے ذریعے ہوتی ہے۔

اقرب الموارد میں ہے:

وحی الیه اشاره (اشارہ کیا)

وحی و اوحی الکتاب کتب (لکھ)

وحی الیه الکلام کلمه خفیا (آہستہ بولا)

وحی الرجل اسرع (تیزی اختیار کی)

وحی الذبیحة ذبحها ذبحاً وحیاً (سرعت کے ساتھ ذبح کر دیا)

وحی الله فی قلبه الهمه (الہام کیا)

وحی الیہ ارسل اللہ رسولاً (رسول بھیجا)

مذکورہ بالا معانی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے لفظ کے معنی میں سرعت اشارہ اور اخفا کا مفہوم مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی ماہر لغت عربی کے معنی مولانا کے معنی وحی پر منطبق نہیں ہوتے۔ لہٰذا مولانا کی علمی لغزش کی بڑی وجہ عربی زبان کے ماہرین سے ہٹ کر معنی کرنا ہے۔

دوسری وجہ:

1۔ علامہ صاحب کی غلطی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ''لفظ'' وحی مختلف مواقع پر مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی

ہے: وَ اَوْحٰی فِی كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (12:41) اور ہر آسمان میں اس کا امر وحی ہے۔

2۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (الزلزال 99 : 1 - 5) جب زمین اپنا ہلا نا ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا ہے؟ اس دن وہ اپنی سب خبریں (زبان حال) سے بیان کر دے گی۔ کیونکہ تیرے رب نے اس کے لیے وحی کی ہے۔

پہلی مثال میں خدا کا آسمانوں اور زمین سے کلام کرنا اور آسمانوں کی طرف وحی بھیجنا ظاہر کرتا ہے کہ ایک قسم کی ایسی وحی بھی ہے جس کے ذریعے قوانین الٰہیہ اس وسیع کائنات میں کام کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں اس انقلاب عظیم کو بھی ایک قسم کی وحی قرار دیا ہے جو زمین پر لایا جاتا ہے۔

3۔ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا (النحل 16 : 68) اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں پر گھر بنا۔

اس آیت کریمہ میں شہد کی مکھی جو عمل اپنی طبعی حس سے کرتی ہے اس کو وحی کا نام دیا گیا ہے۔

4۔ اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الانفال 8 : 12) جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا۔ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو۔ اس آیت میں وحی فرشتوں کو کی گئی ہے۔

5۔ مسیح کے حواریوں کے لیے وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَ بِرَسُوْلِىْ (المائدہ 5 : 111) اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

6۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَ لَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (القصص: 7:28) اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلائے پھر جب اس کے متعلق تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور نہ ڈرنا اور نہ غم کرنا ہم اسے تیری طرف واپس لائیں گے اور مرسلوں میں سے بنائیں گے۔ پانچویں اور چھٹی مثال میں وحی غیر نبی کو کی گئی ہے۔ جس سے مراد وحی ولایت اور مبشرات ہیں۔

7۔ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ۔ (الانعام 6:121) یعنی بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے ہیں۔

8۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (الانعام 6:112)

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطان کو دشمن بنایا اور دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں طمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

نمبر 7,8 آیات میں وحی کی نسبت شیطان کی طرف ہے اور وحی کرنے والا شیطان ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات میں وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ وحی کا مفہوم مدلول کی مناسبت سے متعین کیا جائے گا۔ علامہ صاحب کی یہ غلطی ہے کہ وحی کے معنی کا تعین عبارت کی مناسبت سے نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ اس فطری ذہانت وافتاد یا طبعی صلاحیت کے مفہوم میں لے لیتے ہیں (نگار اگست 45 ص 62) جو اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز میں رکھی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ارض وسما اور شہد کی مکھی کے اندر مخفی قوت رکھی ہوئی ہے۔ جس کے تحت وہ کام کر رہے ہیں۔ علامہ صاحب نے بھی نبی کی وحی کو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا ہوا ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سوجھ بوجھ لیتے ہیں۔ یہ ان کی فاش غلطی ہے حالانکہ قرآن مجید میں نبی کی وحی نبوت کے متعلق یہ خود وضاحت کر دی ہے۔

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ 42:51) یا رسول اللہ بھیجے اور اپنے حکم سے اس کے ذریعے جو جی چاہے وحی کرے یعنی نبی کی طرف وحی رسول (جبرائیل) لے کر آتا ہے۔ اسی طرح غیر نبی کی طرف وحی کرنے کی وضاحت بھی قرآن مجید کی اس آیت میں ہے۔ یعنی من ورای حجاب یعنی غیر نبی پر وحی جبرائیل لے کر نہیں آتا۔ من ورای حجاب کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ جس طرح لفظ وحی مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے اسی طرح لفظ رسول بھی ہے بعض جگہ صرف پیغامبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اصطلاحی مفہوم میں یعنی اللہ کی طرف سے وحی نبوت دے کر بھیجا ہوا پیغمبر۔ لہٰذا الفاظ کے معانی متعین کرنے کے لیے موقع محل کا جاننا ضروری ہے۔

ہر زبان میں ایک ہی لفظ مختلف مواقع پر استعمال ہونے کی وجہ سے مختلف مفہوم دیتا ہے۔ مثلاً اُردو زبان میں چلنے کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اونٹ چل رہا ہے۔ مشین چل رہی ہے۔ میرا حساب کتاب اس سے چل رہا ہے۔ تینوں فقروں میں لفظ ''چل'' مختلف مفاہیم میں آیا ہے اونٹ کا چلنا، مشین کا چلنا اور حساب کتاب کا چلنا ایک جیسا نہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں یہی طریقہ ہے۔ موقع محل کے مطابق معنی متعین کیے جاتے ہیں۔ گویا زبان میں ایک ہی لفظ مختلف معانی کے استعمال میں کیا جاتا ہے موقع محل کی رعایت سے معنی کرنا ضروری ہے۔

مذکورہ بحث صرف ان حضرات کے لیے ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہیں۔ مسلمان ہیں، لیکن محض اپنی نیچری طبع کے لحاظ سے وحی کا مفہوم موقع محل پر متعین نہ کرنے کی وجہ سے علمی لغزش کھائی ہے۔

......☆☆☆......

غیر مسلموں کا رد

مذکورہ بالا بحث صرف ان حضرات کے لیے تھی جو مسلمان ہیں جنہوں نے محض اپنی نیچری طبع کے لحاظ سے وحی کا مفہوم موقع محل پر متعین نہ کرنے کی وجہ سے لغزش کھائی ہے۔ اب غیر مسلموں کا رد پیش کیا جاتا ہے جو اپنی جہالت، تعصب اور بے علمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں۔ گو اس رد میں مسلمان منکرین کے لیے بھی روشنی ہے چونکہ دونوں گروہوں کی طبع اور مزاج الگ الگ ہے اس لیے جواب بھی الگ الگ رنگ میں دیا جا رہا ہے۔

غیر مسلم منکرین کلام الٰہی کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اعجاز ''بے مثل'' ہونے میں دیا ہے۔ ان کے رد میں اس سے بہتر کیا جواب ہو سکتا ہے علماء کرام نے قرآن مجید کو مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا ہے۔ ان کے تمام مباحث کا اس مختصر تردیدی جواب میں سمونا مشکل ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کے اعجاز کے صرف چند مختلف پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کا ہر اعجازی پہلو پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔

اعجاز قرآن

قرآن مجید کا بے مثل ہونا:

قرآن مجید وہ کتاب ہے جس نے ہر پہلو سے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ٥ (بنی اسرائیل 17 : 88) کہہ دے کہ اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

سورۃ بقرہ میں منکرین کو صرف ایک سورۃ کے مانند کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (سورۃ بقرہ 24, 23:2) اگر تمہیں اس امر میں شک ہو کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند کوئی سورۃ بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو، پس اگر تم نے مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔

یہ دونوں آیات قرآن مجید کا بے مثل ہونا ظاہر کرتی ہیں۔

دلائل اعجاز

قرآن مجید کن کن پہلوؤں کے لحاظ سے معجزہ ہے ان تمام کا احاطہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے، صرف چند ایک اعجازی پہلوؤں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

علمی لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید دقائق علمیہ کا خزانہ ہے، جن کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہیے، قرآنی علوم کو چار موٹے موٹے عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

اول : روحانی علوم: جن میں خدا کی توحید اور اس کی صفات کا علم، تعلق باللہ کا علم، ملائکہ کا علم، مبدا و معاد کا علم، اخلاق فاضلہ کا علم اور عبادات کا علم شامل ہے۔

دوم : معاشرتی علوم: جن میں عمرانیات، علم سیاست، علم اقتصاد، علم قانون، علم تمدن، علم ہندسہ، علم نفس اور علم مناظرہ شامل ہیں۔

سوم : سائنسی علوم: جن میں فضائیات، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم الجبال، علم الحیوان، علم ہیت، علم طبابت شامل ہیں۔

چہارم : علوم لسانیہ، جن میں صرف ونحو اور معانی و بیان کے علوم شامل ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام 6 : 38) ہم نے کتاب میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

قرآن مجید میں یہ سب علوم خدمت دین کے لیے بطور خارق عادت بیان ہوئے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے دقیق مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر ہستی باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لیے یہ علوم دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

برکات روحانیہ کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کے نزول سے قبل اہل عرب ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے جن سے قوم کا نجات پانا محال نظر آتا تھا۔ اس گمراہی اور ظلمت کے زمانہ میں قرآن مجید نے عربوں کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلا کر بااخلاق اور باخدا انسان بنا دیا۔

موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے: ''اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قران کی تعلیم کو نہیں دیکھا، جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہوگئی۔''[1]

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے فاضل اپنی کتاب ''لیکچرز آن ہیروز میں لکھتے ہیں: ''اسلام قوم عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے پہل اس کے ذریعے سے زندہ ہوا۔''

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ مخالفین کو بھی ہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب میں بے شمار فصیح اللسان خطیب اور شاعر تھے، جن کی زبان آوری مسلمہ تھی۔ سب فصحاء و بلغاء قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے اپنے آپ کو ضعیف اور پست سمجھنے لگ پڑے۔ ان کے بلغاء و فصحاء کو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنا پڑا۔ لبید معلقہ کا شاعر تھا، جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنے ترک کر دیئے اور کہا کرتا تھا: ''جب خدا نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران سکھائی ہیں تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں۔''

پاپولر انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

---

[1] بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ مولانا عبدالقیوم ندوی ص 17۔

"قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب نہایت فصیح ہے۔اس کی انشائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے۔"

"قرآن مجید اثر ڈالنے، یقین دلانے کی طاقت، فصاحت و بلاغت اور تراکیب و بندش الفاظ میں بے نظیر ہے اور دنیائے سائنس کے تمام شعبوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث۔[1]

"یہ امر کہ عرب کے بہترین مصنف بھی قرآن کی خوبیوں کے برابر کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہ ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں"۔[2]

جارج سیل لکھتا ہے:

"قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے۔کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑھا ہوا معجزہ ہے۔"

ڈاکٹر مورلیس فرانسیسی لکھتا ہے:

"قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔"

قوت تاثیر کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کے الفاظ میں خارق عادت تاثیر ہے۔ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر 54: 5,4) اور یقیناً ان کو (قرآن کے ذریعے) وہ باتیں پہنچ چکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔

اس قوت تاثیر سے ڈر کر مخالفین لوگوں کو قرآن مجید کے سننے سے روکتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جب کوئی مسلمان قرآن پڑھ کر سنانے لگے تو شور کرو۔ارشاد الٰہی ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰمٓ السجدہ 26 : 41) یعنی کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے پڑھنے کے وقت شور و غل کیا کرو شاید تم غالب آ جاؤ۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ گھر سے تو رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔اپنی بہن کے گھر سے قرآن مجید کی آیات سن لیتے ہیں تو ان کے دل میں قرآن کی صداقت اور حقانیت کی میخ گڑ جاتی ہے اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت کا جوا اپنی گردن پر رکھ کر باہر نکلتے ہیں، سیدھا رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اشاعت قرآن کا عہد کرتے ہیں۔

سبعہ معلقہ کا شاعر لبید سورۃ بقرہ کی چند آیات پڑھ کر بے اختیار بول اٹھا کہ خدا اور اس شخص کے سوا جس پر وحی نازل ہوئی ہے کوئی شخص ایسا کلام نہیں کر سکتا اور وہ فوراً دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔جارج سیل مشہور مستشرق نے بھی لبید کے ایمان لانے کے واقعہ کی تصدیق اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں کی ہے۔

خالد بن عتبہؓ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت طفیلؓ بن عمرو اور بے شمار صحابہ تھے جنہوں نے قرآن کی چند آیات سنیں اور وہ مسلمان ہو گئے۔

جان ریسک جرمن فلاسفر کہتا ہے:

---

[1] ہرش فیلڈ نیو ریسرچز، ص 8 ، 9۔

[2] Palmer , Introduction P. 58

"جب یہ قرآن پیغمبر ﷺ کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر جاتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔"[1]

جارج سیل لکھتا ہے:

قرآن مجید کا طرز بیان عموماً دلکش اور اس میں روانی ہے اور بہت سے مقامات پر یہاں خصوصاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی عظمت وشان اور جلال کا ذکر ہے۔ اس کا طرز بیان اور بھی دلکش اور شاندار اور بلند پایہ ہے۔ وہ (محمد ﷺ) اس قدر کامیاب ہوا اور اس نے اپنے سامعین کے قلوب کو اس قدر مسخر کیا کہ کئی مخالف یہ خیال کرنے پر مجبور تھے کہ یہ گویا کسی جادو یا سحر کا اثر ہے۔"[2]

عدم اختلاف کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید تیئس برس دکھ اور سکھ کے مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا ہے اور یہ ایک ایسے شخص پر نازل ہوا جو محض امی تھا۔ پھر رسول کریم ﷺ کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ منصوبہ باز شخص ان حالات میں ایک حالت پر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اس کے نظریات اور عقائد بدلتے رہتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ پر ایک وہ وقت آیا جب آپ ﷺ اپنی قوم کی اصلاح اور بہتری کے لیے غار حرا میں عبادت اور اللہ کے حضور میں آہ و بکا کیا کرتے تھے۔ پھر چادر نبوت اوڑھ کر میدان عمل میں آ گئے تو چاروں طرف سے مخالفت کے بادلوں میں گھر گئے۔ کیا اپنے اور کیا بیگانے سبھی جان لیوا بن گئے۔ آخر کار مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا پڑی اور مدینہ چلے گئے۔ ان کے سر پر سیادت کا تاج رکھ دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔ ریاست اور صحابہ کی جانوں کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ تمام قبائل مخالف ہو گئے۔ مدینہ میں یہود ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ منافقوں کی ایک جماعت بن گئی۔ آپ ﷺ ان پُر خطر حالات میں اسلام کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار اتارنے کے لیے کوشاں رہے۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ مخالفت کے بادل چھٹ گئے۔ دشمن مغلوب ہوئے۔

کیا کوئی انسان یہ بات ذہن میں لا سکتا ہے کہ اس قسم کے مختلف حالات میں انسان ایک ہی حالت پر قائم رہے اور جو وہ کلام پیش کرے اس میں اختلاف نہ ہو۔ یہ انسانی طاقت سے تو باہر ہے۔ ہاں، اختلاف سے پاک کلام وہی ہو سکتا ہے جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل ہو۔ قرآن مجید میں بھی منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا o (نساء 4 : 82) پھر کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔

غیب کی خبروں کا اعلان کرنے کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی ہستی کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو علیم وخبیر ہے۔ بعض وہ خبریں ہیں جو ماضی سے تعلق رکھتی ہیں اور رسول کریم ﷺ کو ان خبروں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بعض وہ خبریں ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں۔

بائبل کی تحریف:

قرآن مجید نے بائبل میں تحریف وتغیر کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس علمی حقیقت سے نا آشنا تھی۔ آج دنیا کے تمام محققین نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ 2 : 75) پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں سے ایک

[1] بحوالہ تاریخ القرآن، مصنفہ عبدالقیوم ندوی، ص ۶۷۔

[2] Sale : Preliminary .

گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا ہے پھر سمجھ لینے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے۔

پادری ویری اخبار نور افشاں لدھیانہ جلد 2 نمبر 28 صفحہ 123 کالم 3 مورخہ 6 جولائی 1874ء میں لکھتا ہے:

''جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں، بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے وہ ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ان کو بعض بدعتی عیسائیوں نے مروج کرنا چاہا تھا مگر وہ اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

پادری موشیم اپنی تاریخ کلیسا مطبوعہ 1860ء جلد دوم ص 36 پر لکھتا ہے:

''متعدد وجوہ ایسے تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ پہلی صدی عیسوی میں مروجہ انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جائے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تحریریں پھیل گئی تھیں جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفین درج کر دیئے گئے تھے۔''

رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزا پور 1856ء صفحہ 10 لکھا ہے:

''بہت سے مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔ ایسی جعلی کارروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی سو برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔''

ہارن صاحب اپنی تفسیر بائبل مطبوعہ لندن 1823ء جلد دوم صفحہ 331 پر لکھتا ہے۔ ''بلاشبہ بعض تحریفیں جان بوجھ کر ان لوگوں نے کی ہیں جو دین دار، پرہیزگار اور راہب تھے۔ غضب یہ ہے کہ بعد میں انہی تحریفات کے سچا ہونے پر اصرار کیا جاتا تھا تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اپنے پر کوئی اعتراض نہ آنے دیں''۔

یاجوج ماجوج:

قرآن مجید میں سورہ کہف میں یاجوج ماجوج کا ذکر کیا ہے کہ ایک مخصوص زمانہ میں تمام بلندیوں کو عبور کر کے اقوام عالم کو اپنے غلبہ میں لے لے گا۔ قرآن مجید کے الفاظ خود اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ روس اور برطانوی اقوام ہیں۔ انہی اقوام کو رسول کریم ﷺ نے دجال کے لفظ سے پکارا ہے۔ خدا کی اطلاع کے بغیر کون یہ پیشگوئی کر سکتا تھا کہ یہ اقوام تمام دنیا پر کسی نہ کسی رنگ میں غلبہ حاصل کر لیں گی۔ تفصیل کے لیے مولانا ابوالکلام کی تفسیر سورہ کہف ملاحظہ کریں۔

فرعون کی لاش کے متعلق خبر:

قرآن مجید نے فرعون موسیٰ علیہ السلام کی لاش کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ موجود ہے۔ یہ اس زمانہ کی خبر ہے جب کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ فرعون کی لاش محفوظ و مصئون ہوگی۔ ارشاد الٰہی ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس 10 : 92) ہم تیری لاش کو باہر نکال دیں گے تاکہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان رہے اور بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر جو فرعون تھا اس کا نام رعمسیس ثانی تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف بری ٹینیکا میں مضمون ممی کے تحت لکھا ہوا ہے کہ رعمیس ثانی کی لاش مصالح کے ذریعہ محفوظ ہے۔

قوت دلائل کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کا نام بینہ ہے، جس کے معنی ہیں واضح اور کھلی دلیل۔ ارشاد الٰہی ہے: فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ (الانعام 6 : 157)

''یقیناً تمہارے پاس تمہارے خدا کی دلیل آ چکی ہے۔''

قرآن کا قاری آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ قرآن مجید ہر دعویٰ کو دلائل و براہین قاطعہ کے ساتھ منواتا ہے۔اور تمام دعاوی دلائل سے واضح کیے ہیں۔کوئی بھی مخالف قرآن ایک بھی ایسا قرآنی دعویٰ نہیں دکھا سکتا جسے قرآن حکیم نے دلائل سے واضح اور محکم نہ کیا ہو۔چنانچہ ذیل کی سطور میں قرآن حکیم کے طرز استدلال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں شبہات کے جوابات (نگار اگست 1940ء)

علامہ نیاز فتح پوری نے جہاں وحی کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس کا رد کیا جا چکا ہے وہاں علامہ صاحب نے قرآن مجید کے متعلق چند شبہات کا بھی ذکر کیا ہے اور علماء کو جواب دینے کی دعوت دی ہے۔لہٰذا ان شبہات کا علامہ صاحب نے اپنے رسالہ نگار میں ذکر کیا ہے۔ان کو ان کے ہی الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

قرآن مجید مخلوق ہے اور فنا ہونے والی چیز ہے لہٰذا وہ خدا کا کلام نہیں:

نگار:

''قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے قرآن مجید مخلوق ہے اور فنا ہونے والی چیز ہے لہٰذا وہ خدا کا کلام نہیں یا خدا کے ساتھ از خود وہ بھی وجود میں آیا ہے۔دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں۔کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا۔حالانکہ قدیم صرف ذات خدا کی ہے۔اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو شے مخلوق ماننا پڑے گا۔لیکن ''شے'' کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ ''کل شئی ھالك الا وجھه'' اس لیے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اس لیے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔''

جواب: قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے بارے میں علماء کرام میں بنو عباس کے دور سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔دراصل یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں باہمی تعلق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔بعض علماء صفات اللہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین گردانتے ہیں یعنی خود ذات الٰہی میں ان صفات کا منشا پایا جاتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ذات سے علیحدہ ہو کر اس میں اس طرح پائے جاتے ہیں جیسا کہ ہم کائنات میں دیکھتے ہیں اور یہی اشتباہ علامہ فتح پوری کے دماغ میں پیدا ہوا ہے کہ اگر قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دیا جائے تو اس سے قرآن مجید ''شی مخلوق'' قرار پائے گی اور ہر مخلوق ہلاک ہونے والی ہے۔لہٰذا قرآن مجید بھی فنا ہونے والی چیز ہے۔دوم قرآن کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے ساتھ ماننے کو وہ تیار نہیں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قرآن مجید کو بھی قدیم ماننا پڑے گا،اور یہ محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس کی ذات میں بالقوہ ہمہ وقت موجود ہیں اور بالفعل اس وقت ہوتی ہیں جب ہو ارادہ کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ یعنی وہ کرنے والا ہے جب وہ چاہتا ہے۔دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی اس کا امر یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

محض اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی اس چیز کو نیست سے وجود میں لے آتا ہے۔اسلام کا خدا قادر مطلق ہے وہ اپنے ارادہ سے نیست سے ہست اور ہست سے نیست کر سکتا ہے۔

گویا دنیا میں تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظلال ہیں اور قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا ظل اور ظہور ہے۔

کلام کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں۔ایک حیثیت متکلم میں کلام کرنے کی استعداد،دوسری حیثیت تکلم سے پہلے اس کے ذہن میں

مطالب اور تیسری حیثیت ان مطالب کو جامۂ الفاظ کا پہنانا۔ یہی تینوں حیثیتیں اللہ تعالیٰ کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کلام کی صفت پائی جاتی ہے اور دنیا کی ہدایت کے لیے مطالب اور تعلیمات کا بھی احاطے کیے ہوئے ہے اور جب ان مطالب اور تعلیمات کو بنی نوع انسان کی راہنمائی کے لیے نازل کرنا مقصود ہو تو کسی نبی پر جبرائیل کے ذریعے الفاظ کے لباس میں نازل کر دیے جاتے ہیں۔ اب کلام الٰہی کی دو صورتیں نکل آئیں، نفسی کلام اور لفظی کلام۔ پہلی دونوں حیثیتیں نفسی کلام کی ہیں یہ حادث اور مخلوق نہیں بلکہ قدیم ہے۔ تیسرا درجہ یا حیثیت جس کا اصطلاحی نام ''کلام لفظی'' ہے، اپنے وجود خارجی کے اعتبار سے حادث اور مخلوق ہے۔ کلام لفظی، کلام نفسی کے ظل اور آثار میں سے ہے۔ کلام نفسی قدیم اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے جب کہ کلام لفظی مخلوق اور حادث ہے۔ یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کو علامہ فتح پوری صاحب سمجھ نہیں پا سکے۔ اور کلام نفسی سے انکاری ہیں۔ کلام لفظی حروف اور اصوات سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کا حادث ہونا خود اہل سنت کو مسلم ہے۔ اس بارہ میں علماء اہل سنت اور علامہ نیاز فتح پوری اور اس کے ہم خیال علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ علم کی کلام کی مشہور کتاب ''مواقف'' میں موقف اختیار کیا گیا ہے:

''اذا عرفت هذا فاعلم ان مايقوله المعتزلة و هوخلق الاصوات والحروف و كونها حادثة قائمة فنحن نقول به وَلا نزاع بيننا وبينهم في ذالك ومانقو له من كلام النفس فهم ينكرون ثبوته ولوسلّموه لمْ ينفوا قدمه فصار محل النزاع نفي المعنى واثباته۔

یعنی معتزلہ اصوات اور حروف اور اس کے مرکب کو حادث کہتے ہیں اور ہم (علماء اہل سنت) بھی یہی کہتے ہیں۔ اس بارے میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں ہے۔ ہم کلام النفس کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت سے انکار کرتے ہیں۔ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیتے تو اس کے قدیم ہونے کی نفی نہ کرتے پس معنی اور اس کا اثبات محل نزاع ہو گیا ہے یعنی کلام نفسی اور اس کا اثبات وجہ نزاع ہے۔ محقق دوانی شرح عقائد جلالی میں فرماتے ہیں:

لانزاع بين الشيخ (الاشعرى) والمعتزلة في حدوث الكلام اللفظي انّما نزاعهم في اثبات الكلام النفسي وعدمه۔ یعنی شیخ اشعری اور معتزلہ کے درمیان کلام لفظی کے حادث ہونے میں کوئی اختلاف نہیں صرف نزاع کلام نفسی اور اس کے نہ ہونے کے اثبات میں ہے۔ یعنی معتزلہ کلام نفسی کے اثبات کے منکر ہیں اور علماء اہل سنت کلام نفسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جب کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی منشاء کے تحت وجود میں آ جائے تو وہ شئے مخلوق اور حادث ہے۔ علامہ صاحب نے جو قرآنی آیت نقل کی ہے کہ سوائے اللہ کی کے ہر شئے فانی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہر مخلوق پر فنا آئے گی صرف اللہ کی ذات ہی فنا سے منزہ ہے کیونکہ وہ خالق ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری کا یہ کہنا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات قدیم ہے، ایک مبین مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ کلام نفسی بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے لہٰذا یہ صفت بھی قدیم ہے۔

خلاصہ کلام:

1۔ کلام الٰہی کا اطلاق کلام نفسی اور کلام لفظی دونوں پر ہوتا ہے۔

2۔ کلام نفسی اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے اور قدیم ہے۔ جب کہ کلام لفظی حادث اور مخلوق ہے۔

3۔ کلام لفظی حادث اور مخلوق ہونے کے باوجود اس لحاظ سے کلام الٰہی ہے کہ وہ کلام نفسی کا ظل ہے۔ ظل اپنے اصل سے جدا نہیں

ہوتا۔ اور کلام لفظی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر نازل کیا ہے اور نبی صرف اس کلام کو لوگوں تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔

دوسرا شبہ جو علامہ فتح نیاز پوری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ علامہ صاحب قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں مانتے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح متعدد مستشرق اور ستیارتھ پرکاش کے مصنف کا بھی یہی اعتراض چودھواں باب اعتراض 135) اس پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے صرف سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے چند قرآنی آیات درج کی جاتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید لفظاً و معناً اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ) اس نے تیرے قلب (رسول کریم ﷺ کے قلب اطہر) پر خدا کے حکم سے اسے (قرآن مجید کو) اتارا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ ۔ (الشعراء 192:26 تا 194) اور اس (قرآن) کو روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) لے کر تیرے قلب پر اترا۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۔ (نحل 14:16) روح القدس (جبرائیل) نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اس کو اتارا ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے قرآن مجید کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل کیا۔ یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں۔

وَلَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ (قیامۃ 16:75، 17) اپنی زبان کو اس غرض سے (قرآن کے) الفاظ کو (سن کر) نہ ہلا کہ اس کو جلدی لے لے۔ ہمارے ذمہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کی آیات لے کر اترتا تھا تو رسول کریم ﷺ اس کو یاد کرنے کی غرض سے جلد زبان ہلاتے۔ اگر قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہوتا تو جلد زبان ہلانے کا کیا مطلب۔ اس کے ساتھ ہی یہ پیشگوئی فرمادی، اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی۔

پھر فرمایا: فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (القیمۃ 18:75، 19) پس جب ہم اس کو پڑھیں تو تُو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔ پھر ہمارے ذمہ اس کا کھول کر بتانا ہے۔

آیت 18 ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا تھا اور آپ کو حکم دیا تو اس کے پڑھنے کی صرف اتباع کر۔ دوسری یہ بات بیان کی، اس کو کھول کر بیان کرنا بھی میری (اللہ تعالیٰ) کی ذمہ داری ہے۔ یعنی اس کی تفہیم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ قرآن مجید میں نماز، روزہ، حج یا دیگر امور زندگی کے متعلق ذکر ہے۔ جن کا بیان (تفسیر) بھی وحی خفی کے ذریعے آپ کو بتا دیا۔ گویا قرآن مجید کے الفاظ وحی متلو ہیں اور بیان (تفسیر) وحی خفی ہے۔ گویا قرآن کے الفاظ ہوں یا اس کا بیان دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف 2:12، 3) ہم نے یہ قرآن عربی میں اتارا تا کہ تم سمجھو ہم اس قرآن کو تیری طرف وحی کرنے سے تجھے نہایت اچھے بیان سناتے ہیں گو آپ اس سے پہلے ناواقف تھے۔

ان آیات میں دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک تو یہ قرآن مجید عربی زبان میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ دوم اس میں ایک قصہ (حضرت یوسف علیہ السلام کا) بیان کیا گیا ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناواقف تھے۔ اس کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ (یوسف 102:12) یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امّی تھے۔ آپؐ کے پاس تاریخی واقعہ کے جاننے کے لیے کوئی ذریعہ اور وسیلہ نہیں تھا۔ رسول کریم ﷺ کے لیے وہ غیب کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ غیب کی خبر علام الغیوب کی طرف سے ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو رسول کریم صلعم پر نازل کیا گیا۔

دیگر انبیاء علیہم السلام کے تاریخی قصص ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ وہ سب آپؐ کے لیے غیب کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر اس غیب کے پردے کو کھول دیا۔ اور وحی کے ذریعے اطلاع دے دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ قرآن مجید میں اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (قصص 3:28) ہم موسیٰ اور فرعون کی خبر سچائی کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ماضی کی خبروں سے ہی مطلع نہیں کیا گیا بلکہ مستقبل کی خبروں سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ جن سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ یہی غیب کی خبریں واضح کرتی ہیں کہ قرآن مجید علام الغیوب خبیر وعلیم ہستی کی طرف سے رسول کریم ﷺ پر نازل کیا گیا۔

علاوہ ازیں قرآن مجید کی نسبت بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ آیاتِ ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الواقعہ 80:56) جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء 192:26) اور یہ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (یٰسین 5:36) غالب رحم والے نے اتارا۔

تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (فصلت 1:41) رحمان رحیم (خدا) کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر 9:15)۔ بے شک ہم نے ہی ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

اس آیت میں بھی قرآن مجید کے نزول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا اس کی لفظی اور معنوی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

قرآن مجید ان آیات سے بھرا پڑا ہے جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ایک بھی ایسی آیت نہیں ہے جس سے یہ اشتباہ پیدا ہو سکتا ہو کہ قرآن مجید رسول کریم صلعم کا کلام ہے۔

یہ ایک حیران کن بات ہے کہ علامہ فتح پوری جیسا عالم یہ دعویٰ کرے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ رسول کریم ﷺ کا کلام ہے۔

❀......❀......❀

اگر کلام مجید کا نسخہ ضائع ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے خدا کا کلام ضائع ہو گیا

نگار:

اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعے سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے۔ اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

جواب:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر 9:15) ہم نے ہی ذکر (قرآن مجید) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیمہ 17:75) یعنی اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا۔

قرآن مجید کی حفاظت دو طریقوں سے ہوتی ہے: ایک زبانی یاد کرنے سے، دوم کتابت سے۔ یہی دو طبعی اور قدرتی طریقے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی صحابہ کرام سارا قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔ اور آپ ؐ کی زندگی میں ہی قرآن مجید اسی دور کی دست یاب اشیاء پر لکھا جا چکا تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن مجید کو کتابی شکل دی گئی۔ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں تمام عربی لہجے منسوخ کر کے قریش کے عربی لہجے میں مدون کر دیا گیا۔ قریش کے عربی لہجے میں ہی قرآن مجید نازل ہوتا تھا اور اسی کو قائم رکھا گیا۔

علامہ نیاز فتح پوری کا اشتباہ اور اعتراض محض ایک مفروضہ پر ہے۔ جب قرآن مجید نے ضائع ہی نہیں ہونا تو اعتراض کیسا۔

اب علامہ صاحب کے مفروضہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جو قرآن مجید کاغذ پر الفاظ کی شکل میں کسی پریس میں چھپتا ہے وہ درحقیقت کلام الٰہی لفظی کی نقل ہے۔ جس کا ذکر علامہ صاحب کے پہلے اعتراض کے جواب میں کیا گیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کسی شاعر کے کلام کا ایک نسخہ ضائع ہو جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شاعر کا کلام ضائع ہو گیا۔

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ کسی شے کی صفت عرضی کے عدم سے اس شے کی ذات اور ماہیت کا عدم لازم نہیں آتا۔ مثلاً انسان کی ایک صفت نطق ہے۔ اگر کسی انسان سے یہ صفت ضائع ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ انسان ضائع یا فنا ہو گیا۔ انسان قائم بالذات ہے اور صرف اس کی صفت عرضی ضائع ہوئی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا الفاظ میں کسی کاغذ پر مرتسم ہونا یہ اس کی ایک صفت عرضی ہے۔ اگر قرآن مجید کاغذوں پر منقوش ضائع ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ قرآن مجید جو کلام الٰہی ہے ضائع ہو گیا ہے۔ اگر قرآن مجید

کے تمام نسخے ضائع ہو جائیں تو بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ قرآن مجید ضائع ہو گیا۔ کیونکہ قرآن مجید اپنے الفاظ کے ساتھ لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے۔

الغرض علامہ صاحب کا اعتراض محض مفروضے اور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں نہ کوئی صداقت ہے اور نہ حقیقت۔ ایسا اعتراض وہی کم فہم انسان کر سکتا ہے جس کو قرآن مجید کے الٰہی حفاظت پر یقین نہ ہو۔

❁……❁……❁

عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے

نگار:

اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن مجید کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے۔ اس لیے لامحالہ اسے صفت ربانی ماننا پڑے گا۔ لیکن چوں کہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

جواب:

میرے نزدیک علامہ صاحب کے شبہات (اعتراضات) کی نوعیت صرف اتنی ہے کہ وہ صفات کو زائد علی الذات تصور کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صفات الہیہ اللہ تعالیٰ کی عین ذات ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی صفت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ''کن'' کہتا ہے تو اس صفت کا مطلوب ظاہر ہو جاتا ہے۔ گویا کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی صفات کے اظلال اور آثار ہیں۔ صفت ''کلام'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو اس کی ذات کا عین ہے۔ جب اللہ تعالیٰ صفت کلام کا ظہور چاہتا ہے تو کلام الٰہی الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو کلام الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ دراصل صفت کلام کا ظل اور اثر ہے۔ اصل اللہ کی صفت کلام ہے جو اللہ کی ذات کا عین ہے۔ جو کلام الفاظ میں ڈھلا ہے وہ اس کلام صفت کا ظل ہے۔ وہ کلام جو الفاظ میں ڈھلا ہے وہ مخلوق اور حادث ہے۔ لہٰذا جب کلام الٰہی نے الفاظ کا جامہ پہنا تو وہ قرآن مجید کی شکل اختیار کر گیا تو وہ مخلوق اور حادث ہے۔ لہٰذا مخلوق شے اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین نہیں ہو سکتی۔ جب تک علامہ صاحب اور اس کے ہم خیال کلام نفسی اور کلام لفظی کے باریک اور دقیق فرق کو نہیں سمجھتے اس وقت تک ان کے ذہن میں صفات خداوندی خصوصاً صفت کلام الٰہی کے متعلق الجھاؤ رہے گا۔

کلام نفسی اور کلام لفظی کی بحث گزر چکی ہے۔ کلام نفسی قدیم اور قائم بالذات ہے جب کہ کلام لفظی حادث اور مخلوق ہے۔ کلام نفسی از قبیلہ الفاظ ہی نہیں لہٰذا اس کو عربی یا عجمی نہیں کہا جا سکتا۔

عقائد کی مشہور کتاب مسامرہ شرح مسائرہ میں لکھا ہے:

اِن کلام نفسی .... لایوصف بانہ عبری ولا سودی ولا عربی انما العبری والسودی و العربی هو اللفظ الدال علیہ ۔ یعنی عربیت اور عجمیت کلام نفسی کی صفت نہیں بلکہ یہ کلام لفظی کے اوصاف ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید کلام نفسی کا ظل اور اثر ہے۔ جب کلام نفسی الفاظ کا جامہ پہنتا ہے تو وہ مخلوق اور حادث ہو جاتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین نہیں رہا۔ لہٰذا قرآن مجید کو نہ خدا کہا جا سکتا ہے اور نہ خدا قرآن ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کلام لفظی ہے جو مخلوق اور حادث ہے۔ قرآن مجید کلام لفظی عربی زبان میں ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ کلام لفظی قدیم نہیں ہے بلکہ وہ مخلوق ہے لہٰذا عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میرے نزدیک علامہ نیاز فتح پوری کے اس اعتراض کا کوئی علمی، منطقی اور کلامی وزن نہیں ہے۔

❁.....❁.....❁

کیا اللہ کا نطق ہمارے نطق کی طرح ہے؟

نگار:

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ نطق خداوندی ہے جو جبرائیل کے ذریعے سے آنحضرت تک پہنچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کو اسی طرح نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا۔ بلکہ ہم سب لوگ اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

جواب:

اس اعتراض میں بھی علامہ صاحب کی صفات الٰہیہ (اسماء الٰہیہ) کی حقیقت اور حُسنۂ کے بارے میں ناسمجھی واضح ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ خود بھی مغالطے کا شکار ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطے میں ڈال رہے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ صفات (اسماالٰہیہ) پر بحث کی جائے کہ قرآن کی رو سے صفات الٰہیہ کی حقیقت کیا ہے اسی طرح یہ اعتراض خود باطل ہو جائے گا۔

اول تو نیاز صاحب نے قرآن مجید کو نطق خداوندی قرار دے کر مغالطہ دینا چاہا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ کی کہیں بھی صفت نطق بیان نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام الٰہی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے خوب کلام کیا۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ 51:42) ''اور کسی بشر کے لیے میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کے پیچھے یا رسول کو بھیجے اور اپنے حکم سے اس کے ذریعے جو جی چاہے وحی کرے۔'' ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ۔ ان (پیغمبرو) میں سے ہی وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔

علامہ صاحب قرآن مجید کو نطق قرار دے رہے ہیں۔ بزعم خویش ہی اللہ تعالیٰ کے نطق کو رسول کریم صلعم اور ہمارے نطق کے ساتھ مماثل قرار دے کر یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ یہ محال ہے۔

صفات الٰہیہ (اسماء الٰہیہ):

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف 180:7) اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ ان کو پکارو۔

صفاتِ الٰہیہ پر نظامِ جسمانی کا مدار:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن ننانوے صفات کا ذکر آیا ہے انہی صفات کا ظہور اس کائنات میں ہے۔ کہیں صفت ربوبیت کا ظہور ہے کہیں صفت غفاریت جلوہ گر ہے۔ کہیں صفت رؤفیت جلوہ افروز ہے کہیں صفت کلام اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اجاگر کر رہی ہے۔ تمام کائنات کی پیدائش صفت خالقیت اور بدیعت کا عکس ہے۔ انہی صفات کے ذریعے معرفت الٰہیہ حاصل ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں دو قسم کی صفات بیان ہوئی ہیں تشبیہی اور تنزیہی۔ تشبیہی وہ صفات ہیں جو استعارہ کے طریق پر انسان کی صفات کی ہم شکل نظر آتی ہیں مثلاً سمیع، بصیر، علیم، کلام کلیم وغیرہ۔ انسان سماعت کے لیے کان اور ہوا کا محتاج ہے۔ بصارت کے لیے آنکھ اور روشنی کا، علم کے لیے حواس اور عقل کا۔ کلام کے لیے آلات کلام (زبان وغیرہ) کا لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اور اپنی صفات کے ظہور کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اسماء (صفات) میں اشتراک سے محض انسان کو اللہ کی معرفت دینا مقصود ہے۔ یہ اشتراک بلا کیف ہے۔ یعنی یہ اشتراک محض نام میں ہے کیفیت میں نہیں۔ انسان اللہ کی صفات کی کُنْہٗ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ 11:41)۔ دوسری قسم تنزیہیہ ہے۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ یہاں مثل بمعنی صفت ہے۔ یعنی اس کی صفت جیسی کوئی صفت نہیں اور اس میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کی صفات میں ایسی باتیں نہ کی جائیں جن کے ساتھ انسان کی صفات کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ کی صفات اس طرح کی نہیں جس طرح انسان میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو انسانی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

تنزیہی صفات کا علم الکلام کی اصطلاح میں مفہوم یہ ہے کہ مخلوق کی صفات کا اثبات خدا کی ذات میں نہیں کیا جا سکتا اور ابن عربی اس سے ورائیت مراد لیتے ہیں۔ مذکورہ بحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات (اسماء) انسان کی صفات کے مماثل نہیں ہیں۔ اس لیے خدا کی صفات کو انسان کی صفات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا علامہ نیاز فتح پوری کا اعتراض اور اشتباہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: ''وصفاته كلها بخلاف المخلوقين يعلم لا كعلمنا ويقدر لا كقدرتنا ويرى لا كرويتنا ويتكلم لا لكلامنا و يسمع لا كسمعنا نحن نتكلم بالآت و الحروف والله سبحانه يتكلم بلا آلة و حروف''

اور اس (اللہ تعالیٰ) کی صفات مخلوق کی طرح نہیں ہیں وہ جانتا ہے لیکن ہمارے جاننے کی طرح نہیں، وہ قدرت رکھتا ہے لیکن ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ بولتا ہے لیکن ہمارے بولنے کی طرح نہیں، وہ سنتا ہے مگر ہمارے سننے کی طرح نہیں، ہم آلات اور حروف کے ساتھ کلام کرتے ہیں اور اللہ سبحانہ بغیر آلہ اور حروف کے بولتا ہے۔

چنانچہ اس عقلی، منطقی اور نقلی استدلال سے علامہ موصوف کا یہ بودا اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔

❀......❀......❀

قرآن مجید کی نزولی ترتیب اور قرآن مجید کا تغیر پذیر ہونا

نگار:

قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس لیے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہ قرآن سے بہ ترتیب الفاظ مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے۔ حالاں کہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیے۔

جواب:

امت مسلمہ کا یہ متفقہ نظریہ ہے کہ نزولی ترتیب اور ہے اور موجودہ قرآن مجید جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہے اس کی ترتیب اور ہے۔ (اس ترتیب کو اسلامی اصطلاح میں توقیفی کہا جاتا ہے)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت یا آیات نازل ہوتی تھیں تو تفہیم الٰہیہ کے ذریعے آپ ؐ کاتبین وحی کو اس آیت یا آیات کو اس حصہ قرآن میں درج کرا دیتے تھے جن سے ان کا تعلق ہوتا تھا۔ گویا موجودہ مروجہ قرآنی ترتیب بھی وحی خفی کے ذریعے کی گئی ہے اور یہ ترتیب الٰہی منشا کے مطابق ہوئی ہے۔ اور یہ وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ترتیب ہے۔ نا معلوم علامہ علامہ نیاز فتح پوری صاحب نے بزعم خویش یہ ''مسلمہ امر'' کہاں سے حاصل کیا ہے کہ قرآن مجید کی وہی ترتیب نہیں ہے جو لوح محفوظ کی ترتیب ہے۔ لہٰذا علامہ صاحب نے اپنے اعتراض کی بنیاد جس ''مسلمہ امر'' پر رکھی ہے وہی غلط ہے۔ لہٰذا اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

لوح محفوظ کی حقیقت:

کیا علامہ صاحب کے نزدیک لوح محفوظ کوئی تختی ہے جس پر قرآن مجید لکھا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں جو آتا ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ○ (البروج 22،21:86) بلکہ وہ ایک قرآن بڑی شان والا ہے محفوظ تختی میں ہے۔ قرآن مجید کے لوح محفوظ ہونے سے ایک مراد تو یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے نزول کے بعد تغیر و تبدل سے محفوظ رہے گا۔ جیسا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا منشا ہے۔ دوسری توجیہہ یہ ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہیں گے کیونکہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس لیے قرآن مجید ہمیشہ محفوظ و مصئون رہے گا۔ تیسری توجیہہ جو زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ لوح محفوظ کا تعلق علم الٰہی سے ہے۔ یعنی موجودہ مروجہ قرآن مجید وہی ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ وہ قرآن جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا وہی کلام نفسی ہے۔ اس قرآن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ لہٰذا وہ قرآن مجید نہ تغیر پذیر ہے اور نہ حادث اور نہ مخلوق بلکہ وہ قدیم ہے اور اللہ کی ذات کا عین ہے۔ جب کلام نفسی، کلام لفظی میں تبدیل ہوا اور کلام نفسی نے حروف اور الفاظ کا جامہ پہنا تو وہ کلام لفظی حادث اور مخلوق ہو گیا۔ اس موضوع پر پہلے بھی بحث گزر چکی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کلام نفسی اور لوح محفوظ میں ہونے کی وجہ سے قدیم ہے۔ اور کلام لفظی کی شکل اختیار کرنے کی وجہ سے حادث ہے۔ علامہ صاحب نے جس قاعدہ کے تحت قرآن مجید کو تغیر پذیر کہا ہے وہ ہے ہی غلط۔ لہٰذا علامہ صاحب کا اشتباہ اور اعتراض باطل ہے۔

❀......❀......❀

قرآن مجید کا شانِ نزول

نگار:

کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نَجمًا نَجمًا (تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل ہوا۔ یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں شان نزول کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بناء پر پہلے ہی سے تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں تو پھر ان واقعات وحالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

جواب:

اس اعتراض کا تعلق شان نزول سے ہے، اس لیے شان نزول کی وضاحت ضروری ہے اور اس وضاحت سے اعتراض کا ایک حصہ خود بخود باطل ہو جائے گا۔

شان نزول:

شان نزول کی دو اقسام ہیں؛ پہلی قسم کے مطابق آیت کسی واقعہ پر ظاہری طور پر دلالت کرتی ہے۔

دوسری قسم کے مطابق اس آیت کے عمومی اور مستقل معنی ہوتے ہیں جو دنیا کے لیے ہدایت کی روشنی اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعہ جس پر آیت ظاہری طور پر چسپاں ہوتی ہے نہ بھی رونما ہوا ہوتا تو تب بھی آیت کا نزول ہونا تھا۔ قرآن مجید کی آیات کا نزول واقعات کے تابع نہیں ہوا۔ بلکہ علیم وخبیر ہستی نے دنیا کے اس وقت کے حالات اور قیامت تک کے آنے والے حالات کو مدنظر رکھ کر قرآن مجید کو اتارا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنے اندر ہر دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان لیے ہوئے ہے۔

قرآن مجید کی آیات سے جو عام مفہوم سمجھا جاتا ہے وہی معتبر ہے۔ اس میں نزول کے کسی خاص سبب کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔

عام مفسرین نے شان نزول کی حقیقت کو نہ سمجھ کر تفسیر کا یہ انداز اختیار کیا ہے کہ ہر آیت سے متعلق کوئی جزوی واقعہ بیان کر دیا کہ فلاں آیت ابوجہل کے متعلق نازل ہوئی۔ فلاں آیت ابولہب کے متعلق، فلاں حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کے متعلق اتری۔ اس طرح قرآن مجید کے مطالب شان نزول تک ہی محدود کر دیے۔ اور عمومی مطالب پر نگاہ ڈالنا چھوڑ دیا۔ اسی تفسیری انداز کی وجہ سے علامہ فتح

پوری نے غلطی کھا کر اعتراض کر دیا۔لہٰذا قرآن مجید کی کسی آیت کے نزول کا تعلق کسی واقعہ سے نہیں۔اگر وہ واقعہ رونما نہ بھی ہوتا تب بھی آیت کا نزول ہونا تھا۔قرآن مجید لوح محفوظ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود تھا اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نجماً نجماً حالات کے مطابق نازل ہوتا رہا۔اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق نازل ہونا ہی تھا۔علامہ صاحب نے خواہ مخواہ قرآن مجید کے نزول کو کسی خاص واقعہ کے ساتھ منسلک کر کے اعتراض کر دیا ہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ نے کسی خاص واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے تمام آیات کو لوح محفوظ میں لکھ رکھا تھا۔

دراصل علامہ صاحب نے ''لوح محفوظ'' کے معانی سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔جیسا کہ پہلے اعتراض میں لوح محفوظ کی وضاحت کر دی ہے۔لوح محفوظ کوئی خاص تختی نہیں جس پر قرآن مجید لکھا ہوا تھا یا لکھا ہوا ہے۔لوح محفوظ کا اللہ تعالیٰ کے علم سے تعلق ہے۔گویا قرآن مجید اللہ کے علم میں موجود اور محفوظ ہے اور ضرورت کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ جب قرآن مجید الفاظ کی شکل اختیار کر گیا تو مخلوق اور حادث ہو گیا۔تمام امت مسلمہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا ظل اور اثر ہے۔

❁......❁......❁

لوح محفوظ کی وضاحت

نگار:

اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُلْ سے شروع ہوتی ہیں یعنی جن میں رسول ﷺ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درآں حالے کہ اس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح ان دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے۔ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں اور ان کی کیا ضرورت تھی؟

جواب:

یہ اعتراض بھی لوح محفوظ کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے جیسا کہ سابقہ اعتراض میں لوح محفوظ سے متعلق لکھا تھا کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے کہ کلام لفظی میں آنے سے پہلے قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے کا منصوبہ بھی ازل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی ہیں۔ زمانہ کی تعیین محدود جہات کی حرکت سے ہوئی ہے اس لیے زمان و مکان کی قید اور تفریق صرف ان چیزوں کے لیے ہو سکتی ہے جو ذو جہت ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات قید زمان و مکان سے پاک ہے۔ اس لیے اس کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل کوئی چیز نہیں۔ اس بناء پر لفظ قُل سے آپ کو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ وقت نزول آیت کی طرح ازل میں درست تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید رسول کریم صلعم کی بعثت کے وقت مرتب نہیں کیا۔ اور نہ کسی تختی پر لکھا تھا۔ قرآن مجید ازل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی قرآن مجید علم الٰہی میں مرتب تھا۔ علامہ نیاز فتح پوری کو یہ علم ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کا خدا علام الغیوب ہے۔ دنیا میں جو بھی چیز ہونے والی ہے وہ اس کے علم میں ہے۔ لہٰذا قرآن مجید جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔

❁.....❁.....❁

سورۃ کے آغاز میں بسم اللہ پر اعتراض

نگار:

اگر کلام مجید خدا کا کلام ہے تو پھر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۃ فاتحہ میں الحمد لله سے لے کر مالك يوم الدين تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں اور پھر دفعتہً ''اياك نعبد'' سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے ہیں۔ اگر سورہ فاتحہ پہلے سے ''لوح محفوظ'' میں منقوش ہوتی تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

جواب:

علامہ صاحب نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے یہ سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے نام سے شروع کر رہا ہے اور خود ہی اپنی ذات سے خطاب کر رہا ہے پھر اس طرز تخاطب کو بے معنی قرار دیا ہے۔

علامہ صاحب کو بحیثیت ایک مسلمان یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے دستور العمل ہے۔ ایک ضابطہ حیات ہے۔ اس کے مطابق لوگوں نے زندگی بسر کرنی ہے اور اس کے ساتھ اس کی تلاوت کو باعث ثواب قرار دیا ہے اور نمازوں میں کسی ایک سورۃ کی کم از کم تین آیات کی تلاوت بھی کرنی ہے۔ اس کی تلاوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ اس پاک کلام کو اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع نہیں کر رہا بلکہ بندہ کر رہا ہے جس نے اس کی تلاوت کرنی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قرآن مجید کی تلاوت کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کی تلقین نہیں کی بلکہ ہر اس کام کے کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کی ہدایت کی ہے جو قرآنی ضابطہ حیات کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ گویا ہر مسلمان اپنے کام کو بسم اللہ پڑھنے کے ساتھ شروع کرتا ہے۔

اس آیت (قطعہ عربی) میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں الرحمان اور الرحیم۔ الرحمان کے معنی یہ ہیں بغیر مانگے اور بغیر کسی کام کے عطا کرنے والا۔ یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ انسانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہوا، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر اور دیگر کائنات کی چیزیں۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بغیر مانگے اور بغیر کسی محنت اور کام کے عطا کی ہیں۔ اسی طرح روحانی ربوبیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ان کو انسانوں کی فلاح کے لیے احکام دیے تاکہ انسان ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ کائنات میں تخلیق کردہ اشیاء اور سلسلہ نبوت اور کتب سب اللہ کی صفت رحمانیت کے ماتحت آتی ہیں۔ دوسری صفت رحیمیت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کا بہتر بدلہ دینے والا۔ کتنی پیاری

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات ہیں۔لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس اللہ کا نام لے کر کسی کام کو شروع کریں جو رحمان اور رحیم ہے۔

معلوم نہیں علامہ صاحب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیسے اخذ کرلیا ہے کہ اللہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ذات سے خطاب کرتا ہے۔علامہ صاحب کا تمام کلیہ ہی غلط ہے اس لیے اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا ہے پہلے انداز تخاطب صیغہ غیب سے تھا۔دفعتہً انداز مخاطب حاضر صیغہ (ایاك نعبد) سے ہو گیا ہے لہٰذا دونوں ٹکڑے دو مختلف موقعوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلے ہیں۔

علامہ صاحب ایک بلند پایہ ادیب ہیں عربی زبان پر بھی عبور حاصل ہے،علم معانی اور بیان سے بھی واقف ہیں۔انہیں التفات جیسی عام صنعت سے بھی ضرور واقف کا رہونا چاہیے تھا۔صنعت التفات (کسی خاص مقصد کے لیے متکلم کا کلام میں غیبت سے خطاب کی طرف یا خطاب سے غیبت کی طرف انتقال کرنا) عربی کے علاوہ اردو اور فارسی میں پایا جاتا ہے۔نثری ادب اور نظم میں عموماً ادباء اور شعراء صنعت التفات سے کام لیتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے۔دعا میں اپنا مقصد بیان کرنے سے پہلے بندہ اپنے خدا کی صفات بیان کرتا ہے۔وہ صفات یہ ہیں: رب،رحمٰن،رحیم اور مالک یوم الدین۔تمام مفسرین اور علماء دین کے نزدیک یہ چار صفات ام الصفات کہلاتی ہیں یعنی قرآن مجید میں جو ننانوے صفات بیان کی گئی ہیں یہ صفات ان صفات کی ام (ماں) ہیں۔یہ ایک طبعی چیز ہے جب کوئی شخص کسی سے سوال کرتا ہے تو سوال سے پہلے سوالی جس سے سوال کر رہا ہے اس کے متعلق اپنے دل میں نیک خواہشات رکھتا ہے۔پھر اپنی حاجت بیان کرتا ہے۔ اس طبعی جذبہ کے تحت اس دعا میں بندہ اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کر رہا ہے کہ اے میرے خدا تو رب ہے تو رحمان ہے تو رحیم ہے تو مالک یوم الدین ہے۔اس کے بعد بندہ اپنے خدا کے سامنے اپنی بندگی،عبودیت اور عاجزی وانکساری کا اظہار کرتا ہے۔اس کے ساتھ اعانت کا طلب گار ہوتا ہے۔اس کے بعد اپنا یہ مقصد بیان کرتا ہے اِھْدِنا الصراط المستقیم یعنی ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت دے۔سیدھی راہ کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا۔اسی میں انسان کی فلاح ہے۔اس کے بعد بندہ اپنے خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ اس کو ان لوگوں کے راستہ سے بچانا جو تیرے احکام کے خلاف زندگی بسر کر رہے ہیں۔خدا کے احکام کے خلاف زندگی بسر کرنا خسران کا موجب ہے۔گویا ایک عاجز بندے نے خدا سے فلاح پانے اور خسران سے بچنے کی درخواست کی ہے۔

قارئین خود اندازہ لگالیں کہ علامہ صاحب نے جو اعتراض کیا ہے اس کا اس دعا سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

تیسری بات جو علامہ صاحب نے کی ہے وہ یہ ہے اگر سورہ فاتحہ پہلے سے ''لوح محفوظ'' میں ہوتی تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

جیسا کہ پہلے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ''لوح محفوظ'' کوئی تختی نہیں جس پر قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔''لوح محفوظ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔گویا جو قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا وہ ہی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔اور سورہ فاتحہ بھی جس شکل میں موجود ہے وہ اسی شکل میں اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔اور اس کے انداز تخاطب میں علامہ صاحب کو اپنی کم فہمی کی وجہ سے غلطی لگی ہے اور اس کے انداز تخاطب پر اعتراض کر دیا ہے۔اس سے عمدہ الفاظ میں کسی مذہب کے پاس دعا کوئی نہیں۔یہی وہ دعا ہے جس پر علماء ربانی نے کئی کئی ضخیم کتب لکھی ہیں۔لیکن اس مختصری سورۃ کے مضامین بیان کرنے سے قاصر رہے۔

❁......❁......❁

قرآن مجید کے لوح محفوظ میں منقوش ہونے کا مطلب

نگار:

قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہد نبویؐ سے ہے مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے درآں حالے کہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

جواب:

یہ اعتراض بھی لوح محفوظ کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ لوح محفوظ سے مراد علم الٰہی ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ میں موجود اور منقوش تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ قرآن مجید میں ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام کا ذکر ہے۔ اسی طرح تمام امور جو بھی قرآن مجید میں مندرج ہیں وہ سب کے سب اللہ کے علم میں تھے۔ ہر مذہب کے نزدیک اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے علام الغیوب ہونے کا ذکر بار بار کیا گیا ہے اور ہر مسلمان کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے اور معترض کا بھی یہی عقیدہ ہے تو پھر اعتراض کیا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ابولہب رسول کریم صلعم کا ایک چچا ہوگا۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور اس کی بیوی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش ہوگی۔ عہد رسالتؐ میں جب ابولہب اور اس کی بیوی نے اسلام کی مخالفت میں انتہا کر دی تو ان کا ذکر قرآن مجید میں آ گیا۔ ان کے ذکر میں ایک پیشگوئی مضمر ہے کہ وہ یہ کہ جب کبھی بھی ابولہب اور اس کی بیوی جیسے مخالف اسلام کی بیخ کنی کے لیے پیدا ہوں گے تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ان کا تمام مال و دولت اور اثر و رسوخ کام نہیں آئے گا۔ اسلام کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس کی ظاہری اور معنوی حفاظت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآن مجید میں تو ایسے واقعات کا ذکر ہے جن کا ظہور عہد رسالت میں بھی نہیں ہوا تھا مثلاً یاجوج ماجوج۔ موجودہ دور میں مفسرین اور مورخین نے یاجوج اور ماجوج سے مراد روس اور انگریز (برطانیہ اور امریکہ) لیا ہے۔ اور تاریخی حقائق سے ثابت کیا ہے۔ اسی طرح فرعون کی لاش کی حفاظت کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ آج تاریخ نے چودہ سو سال سے قبل کی پیشگوئی کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ یہ تمام باتیں علام الغیوب ہستی کے علم میں تھیں کہ جس کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل سب برابر ہیں۔ زمان اور مکان انسانوں کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زماں و مکاں سے پاک اور بالا ہے۔

❀......❀......❀

خدا کا نطق

اللہ کی صفات بندے کی صفات کی طرح نہیں

نگار:

خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے جس طرح اس کی صفت ''نطق'' کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ ''نطق'' ہو جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لیے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں اسی طرح کلام کے لیے زبان یا الفاظ سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ اس صورت میں الفاظ قرآنی کو خدا کا کلام کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ علامہ صاحب نے مسلمانوں کی طرف بزعم خویش ایسا عقیدہ منسوب کر دیا ہے جو مسلمانوں کا ہے ہی نہیں۔ علامہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح ہم قرآن مجید کے الفاظ کو زبان و دہن اور عضلات سے ادا کرتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک خدا بھی عضلات (زبان، ہونٹ اور حلق وغیرہ) کا محتاج ہے۔ نامعلوم علامہ صاحب کے اس مفروضہ کی کیا بنیاد ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان خدا کو سمیع و بصیر، کلیم اور دیگر صفات کا حامل سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ صمد ہے بے نیاز ہے۔ اس کو سننے، دیکھنے اور کلام کرنے کے لیے ان آلات اور عضلات کی ضرورت نہیں جن کی انسان کو ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کہ اس کی صفات کے مثل کوئی ہے ہی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں یعنی کلام نفسی اور کلام لفظی۔ کلام نفسی اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے۔ جب کلام نفسی، کلام لفظی کا روپ دھارتا ہے تو وہ الفاظ حروف کا جامہ پہنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کلام نفسی کا اظہار حضرت جبرائیل کے ذریعے کرتا ہے یا کسی اور طریقے سے۔ کلام نفسی لوگوں کو سمجھانے کے لیے کلام لفظی کے روپ میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بندوں کے کلام پر منطبق نہیں کرنا چاہیے اللہ کا کلام بندوں کے کلام کی مثل نہیں ہے۔ مسلمان قرآن مجید کو صرف اس لحاظ سے کلام الٰہی مانتے ہیں کہ اس کی تنزیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی ہے۔ پہلے اعتراضات کے جوابات میں قرآنی آیات کا ذکر کیا جا چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

❁......❁......❁

قصص القرآن پر شبہ اور اعتراض

نگار:

چوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔اس لیے قرآن مجید میں واقعۂ ابراہیم کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے جھوٹ نہیں بیان کیا یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں بیان کیا لیکن اس کا اثر نفس واقعہ کی صحت یا عدم صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔اور اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں تورات وانجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ تورات وانجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔(جون 1940 ص 69)

جواب:

اس اعتراض میں دو اعتراض یا شبہات بیان کیے گئے ہیں۔ایک یہ کہ قرآن مجید الہامی کتاب نہیں۔دوم تاریخی واقعات کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔وہ اسرائیلیات کا حصہ ہیں جو اس وقت تورات وانجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں۔

جواب اول:

پہلے شبہ کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ کی تصنیف نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

دوسرے شبہ (اعتراض) کا جواب یہ ہے کہ اگر علامہ موصوف قرآن مجید کے تاریخی واقعات کی صحت کے انکاری ہیں اور ان کو محض اسرائیلیات کا حصہ قرار دیتے ہیں تو علامہ صاحب پر لازم تھا کہ پہلے کسی اسرائیلی واقعہ کی تاریخی حیثیت پر بحث کر کے عدم صحت پر مہر لگاتے۔لیکن تاریخی واقعات کو محض اسرائیلیات کا حصہ قرار دے دینا ایک محقق کی شان کے منافی ہے۔میں معترض اور اس کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں تاریخی واقعات اسرائیلیات کا حصہ نہیں۔نہ محض تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان واقعات میں حکمتوں کا دریا بہہ رہا ہے۔جس طرف علامہ صاحب یا ان کے ہم خیالوں کی توجہ نہیں جاتی یا نہیں گئی۔اپنی کم علمی کے باوجود کچھ حکمتیں اور اغراض و مقاصد بیان کرتا ہوں۔

1۔اللہ تعالیٰ نے صفت ربوبیت کے تحت بنی نوع انسان کی روحانی تربیت کے لیے ہر قوم میں انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں۔قرآن مجید میں آتا ہے: اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی ہر امت میں کوئی نہ کوئی نبی نذیر بن کر آیا ہے۔اس اصول کے تحت قرآن مجید میں مخاطب اقوام کے بعض جانے پہچانے انبیاء علیہم السلام کا ذکر آیا ہے۔چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام نے ایک آخری نبیؐ کے آنے

کی پیشگوئی کی ہوئی تھی جس کا تذکرہ کسی نہ کسی رنگ میں اس نبی کی امت میں ضرور پایا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام پہلی پیشگوئیوں کے مصداق تھے اس وجہ سے ضروری تھا کہ ان انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کی تعلیم اور پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَاتَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (بقرہ) اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ اور تم اس کے پہلے کافر نہ بنو۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے معنی ابن جریر سے مروی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشگوئیاں ان کے پاس تھیں پس آپ ؐ کے ظہور اور بعثت سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوئی۔ اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ مخاطب قوم کے ان جانے پہچانے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا جاتا جن کی پیشگوئیوں کے آپ ؐ مصداق تھے۔

2۔ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں ان کی مشترک تعلیم بیان کی ہے یعنی خدا ایک ہے اس کی عبادت کرو۔ تقویٰ اختیار کرو۔ حقوق العباد ادا کرو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی بنیادی اور اصولی تعلیم دی ہے۔ خدا تعالیٰ کا دیگر اقوام کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس موعود نبیؐ پر ایمان لا کر کوئی نئی تعلیم اختیار نہیں کر رہے ہو بلکہ یہ وہی تعلیم ہے جو تمہاری کتب میں کسی نہ کسی رنگ میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ تم اس تعلیم سے روگرداں ہو گئے ہو۔ اس لیے تمہاری اصلاح اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پر چلانے کے لیے یہ نبی آیا ہے۔ اس نبیؐ کا ماننا پہلے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب نہیں بلکہ انہی کی تعلیم کو ماننا ہے۔

3۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کے مخالفین ناکام و نامراد رہے اور رسولوں کا مشن کامیاب رہا۔ اسی طرح آج تم اپنی تمام قوت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے پیغام کو ختم کرنے کے درپے ہو۔ تم ضرور ناکام و نامراد ہو گے۔ اس وجہ سے یہ بہتر ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے مخالفین اور معاندین کا حال سامنے رکھ کر حق کی مخالفت چھوڑ دو۔ قرآن مجید میں آتا ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہی غالب آئیں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یعنی جب حق آ جائے تو باطل بھاگ ہی جاتا ہے۔

4۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ جب تک امتیں تعلیم حق پر گامزن رہتی ہیں وہ ترقی کرتی ہیں جب وہ تعلیم حق سے روگردانی کر لیتی ہیں تو وہ قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر پختگی کے ساتھ عمل پیرا رہنا چاہیے تاکہ تنزل اور ادبار کی لعنت سے بچ جائیں۔

افسوس موجودہ مسلمان انہی راہوں پر گامزن ہو گئے جن پر چلنے سے روکا گیا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کا قدم ترقی کی بجائے تنزل کی طرف اٹھ رہا ہے اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے محقق ان قصص کو محض اسرائیلیات میں شمار کرتے ہیں۔

5۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کو ایذاؤں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسی طرح آپ ؐ کو اور آپ ؐ کے متبعین کو ان تمام تکالیف سے گزرنا پڑے گا۔ جس طرح وہ ان تکالیف اور مصائب کو اٹھانے کے بعد کامیابی سے ہم کنار ہوئے اسی طرح آپ ؐ اور آپ ؐ کے ماننے والے کامیاب و

کامران ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی تاریخ اس امر کی صداقت پر شاہد ہے کہ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنے اعداء پر غالب آئے۔

6۔ اللہ تعالیٰ پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کے واقعات بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر وہی اعتراضات کر رہے ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے مخالفین نے کیے تھے۔ تم پہلے انبیاء علیہم السلام کو فرستادہ الٰہی مانتے ہو۔ اب دیکھ لو کہ اعتراضات کرنے والے برحق تھے یا انبیاء علیہم السلام اگر وہ تمہارے فیصلہ کے مطابق برحق تھے تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی برحق اور صداقت پر قائم ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے ذکر (قصص القرآن) میں یہ بتانا مقصود تھا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام بھی بشر ہی تھے۔ وہ تمام ان ضروریات کے محتاج تھے جن کے دیگر انسان محتاج ہوتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو کسی طور پر بھی صفات الٰہیہ میں شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ اس سے شرک لازم آتا ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ جس طرح بعض پہلی امتیں اپنے نبی کی تعریف میں غلو کر کے شرک کی مرتکب ہوئی ہیں تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو غلو کا رنگ دے کر مشرکین کی صف میں نہ کھڑے ہو جانا کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ ناپسندیدہ گناہ ہے اس سے انسان کی مخفی استعدادیں ابھر نہیں سکتیں۔

8۔ قرآن مجید پہلے انبیاء علیہم السلام کے تاریخی واقعات (قصص) بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اس عرب ملک اور ان لوگوں میں پرورش پائی جہاں نہ کوئی تعلیم تھی اور نہ کوئی وہاں ایسے ذرائع اور وسائل تھے جن کی وجہ سے ماضی کی خبروں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہو۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور حالات بیان ہوئے ہیں جن پر اطلاع وحی الٰہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے مخالفین کو یہ بتایا ہے کہ یہ رسول کریم ﷺ اپنی طرف سے یہ خبریں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ ان کے حالات سے ناواقف تھے اس رسول کو وہی ہستی خبریں بتا رہی ہے جو علیم و خبیر ہے۔

9۔ قرآن مجید کے ان قصوں اور واقعات میں پیشگوئیاں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہی نازل کیا ہے جو غیب کی خبروں کو جاننے والا ہے۔

10۔ ان قصص اور واقعات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کسی راست باز مامور من اللہ کی شناخت میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت اور نبوت پیش کرتے ہوئے فرمایا قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ کہ میں کوئی نیا رسولؐ نہیں ہوں۔ تم کسی نہ کسی پہلے نبی کو مانتے ہو۔ جو معیار اس کی صداقت کے ہیں وہی میری صداقت کے ہیں۔ اس وجہ سے میری صداقت انہی معیاروں پر پرکھ لو۔ مجھے سچا نبی پاؤ گے۔

جواب دوم:

یہی اعتراض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مخالفین نے کیا تھا کہ قرآن مجید محض اساطیر الاولین ہے۔ جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دروغ گو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ مخالفین کے اعتراض کا ذکر صرف ایک جگہ نہیں آیا بلکہ کئی بار مختلف مواقع پر دہرایا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

(الانعام 25:6) یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (احقاف 17:26) پس وہ کہتا ہے یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (القلم 17:46) جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

علامہ نیاز محمد صاحب فتح پوری نے جن واقعات کو محض اسرائیلیات کہہ کر تاریخی حیثیت سے گرایا ہے آج سے چودہ سو سال پہلے ان واقعات کے متعلق مشرکین و معاندین رسول بھی یہی کہتے تھے کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں اور کچھ نہیں۔ علامہ صاحب اسی نگار میں مزید لکھتے ہیں ''کلام مجید میں تقریباً وہی بیان کیا گیا ہے جو یہودیوں کی کتاب مرداش ربّا میں پایا جاتا ہے۔'' (نگار جون 40، صفحہ 70)

علامہ صاحب نے مرداش کا لفظ استعمال کیا ہے جبکہ یہ لفظ ''مدراش'' ہے۔ تفسیر کی کتاب کو عبرانی میں مدراش کہا جاتا ہے۔

یہاں بھی علامہ صاحب نے قرآن مجید کے قصص کو مدراش کے قصے کہانیاں ہی قرار دیا ہے۔ علامہ نیاز محمد صاحب فتح پوری نے جن شبہات (اعتراضات) کا ذکر اپنے رسالہ نگار میں کیا ہے دراصل وہ مسلمانوں سے یہ بات منوانا چاہتے تھے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ اس ٹھوکر (غلطی) کی وجہ محض ان کا وحی کی حقیقت، کیفیت اور کنہ کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ نحل یعنی شہد کی مکھی کی وحی کی کیفیت اور رسول کریم صلعم کی وحی کی کیفیت کو ایک جیسا ہی سمجھتے ہیں۔

❀.....❀.....❀

باب چہارم

غیر مسلم معترضین کے اعتراضات کے جوابات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ قرآن مجید کے آغاز پر اعتراض

اعتراض:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یعنی شروع ساتھ نام اللہ کے جو رحیم یعنی معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ ''مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن کلام اللہ ہے لیکن اس قول (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی اور ہے کیونکہ اگر کلام اللہ ہوتو بجائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے شروع واسطے ہدایت آدمیوں کے لکھا ہوتا۔ (ستیارتھ پرکاش مصنف دیانند سرسوتی، چودھواں باب، اعتراض 1۔)

جواب:

دیانندجی سرسوتی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ ہی غلط کیا ہے۔ رحمٰن کے معنی کسی عربی لغت میں معاف کرنے والا نہیں ہے۔ عربی زبان میں رحمٰن کا معنی ہے وہ ہستی جو بغیر کسی کی محنت اور طلب کے عطا کرنے والا ہو۔ کائنات میں جو اشیاء تخلیق کی گئی ہیں وہ صفت رحمانیت کے تحت پیدا کی گئی ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ سورج، چاند، ستارے، ہوا، پانی، چرند و پرند اور دیگر اشیاء اس کے کسی عمل یا محنت کے نتیجہ میں پیدا کی گئی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے جسمانی اور مادی ضروریات انسان کے لیے کائنات میں ہر قسم کی اشیاء پیدا کردی ہیں تو روحانی ضرورت کے لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلہ انبیاء علیہم السلام کا شروع کیا ہے۔

قرآن مجید کی پہلی سورہ فاتحہ ہے۔ اس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ جس میں یہ حکمت بالغہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اس سورۃ (فاتحہ) کو پڑھنے سے پہلے مذکورہ الفاظ پڑھ لے۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص کوئی بھی کام شروع کرے تو پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لے۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔

اس طرح ہر کام کے آغاز پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت انسان کے دل پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے فرمودہ احکام کے تحت ہی کام سرانجام دے گا۔ اور ہر قسم کی اُن غلط اور لغو مساعی سے اجتناب کرے گا جو احکام خداوندی کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے قانون کے تابع مساعی سے معاشرہ میں کوئی فساد برپا نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرہ میں تہذیب و تمدن کی بنیاد اخوت اور محبت پر استوار ہوتی ہے۔

جو الفاظ ''واسطے ہدایت آدمیوں کے'' دیانندجی نے قرآن مجید کا آغاز کرنے کے لیے تجویز کیے ہیں وہ اس لیے غلط ہیں کہ سورہ

فاتحہ ایک دعا ہے۔ دعا میں خدا مخاطب اور بندہ التجا کرنے والا ہوتا ہے۔ دعا میں پہلے مالک کی تعریف ہوتی ہے اس کے بعد درخواست اور حاجت بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے پہلے اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام الرحمٰن الرحیم بیان ہوئے ہیں۔ ان دو الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اظہار ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جو بے انتہا رحم والا (رحمان) اور بار بار رحم (رحیم) کرنے والا ہے۔

سورہ فاتحہ ایک جامع دعا ہے۔ اس سے بہتر کوئی دعا نہیں ہوسکتی۔ اِس سورۃ میں پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کا ذکر کیا گیا ہے جو اُم الصفات کہلاتی ہیں یعنی قرآن مجید میں ننانوے (99) صفات کا ذکر ہے یہ چار صفات ان صفات کا سرچشمہ ہیں۔ انہی صفات پر نظام کائنات قائم ہے اور چل رہا ہے۔ رب العالمین (ربوبیت) ربوبیت خدا کی وہ صفت ہے جو ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔ (مفردات امام راغب)

رب العالمین کا لفظ جہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو ظاہر کررہا ہے وہاں اس سے اِس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کا خدا صرف کسی ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ تمام جہانوں اور اقوام عالم کا بھی رب ہے۔ یہ لفظ وحدت نسل انسانی کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ پہلے نبی صرف اپنی ایک قوم کی طرف آتے تھے۔ اب تمام اقوام عالم کی مادی اور روحانی ربوبیت صرف ایک ہی نبی کے ذریعے ہوگی۔ وہ ہیں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری آیت میں صفت رحمانیت کا ذکر ہے۔ یہ صفت ہر شے کے اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری اسباب اس کے تخلیق میں آنے سے پہلے مہیا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق سے قبل ہی اس کائنات میں وہ تمام چیزیں پیدا کردیں جو اس کی مادی زندگی کے لیے ضروری تھیں۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، پانی، شجر، چرند و پرند اور دیگر تمام اشیاء وغیرہ اسی طرح روحانی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا۔ انبیاء علیہم السلام کی آمد صفت رحمانیت کے تحت ہے۔ اسی لیے نبوت ایک وہبی منصب ہے۔ صفت رحمانیت کے ساتھ صفت رحیمیت بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ وہ صفت ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ سامانوں سے اس کی نازل کردہ تعلیمات کے مطابق فائدہ اٹھائے گا وہ اعلیٰ درجے کے ثمرات پائے گا۔ مالک یوم الدین (مالکیت) تیسری آیت میں چوتھی صفت بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ وہ صفت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر کوئی ان سامانوں سے فائدہ نہیں اٹھائے گا یا قانون قدرت کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ چوتھی آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ ذات جو مذکورہ چار صفات کی مالک ہے وہی اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ اور اسی سے مدد لی جائے۔

آخری تین آیات میں احکام الٰہیہ پر عمل کرنے اور افراط اور تفریط سے بچنے کی دعا ہے: (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ٥ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥)

دوسرے مذاہب میں صرف گناہوں سے معافی کی دعائیں سکھائی گئی ہیں۔ جب کہ اسلام نے مقام صدیقیت (ولایت کا اعلیٰ درجہ) پر پہنچنے کی دعا سکھائی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ایک انسان اس پر فائز ہوتا ہے تو وہ شیطانی خوف وخطر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہر قسم کے مادی اور روحانی غموم وہموم سے بچ جاتا ہے۔

دیانند سرسوتی کو یہ بھی علم ہونا چاہیے تھا کہ باسم اللہ میں بـ استعانت کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوا پڑھتا ہوں جو رحمان اور رحیم ہے۔ رحمان اور رحیم کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

بسم اللہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن سورہ فاتحہ کا خلاصہ ہے سورہ فاتحہ کل قرآن کا خلاصہ ہے۔ لہٰذا بسم اللہ کل قرآن مجید کا بھی خلاصہ ہوا۔ قرآن مجید کی ہر سورت کا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہونا ہی بہتر ہے اس سے بہتر اور کوئی الفاظ نہیں ہو سکتے۔

سوامی دیانند جی سرسوتی نے ایک اور نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''اس قول (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی اور ہے۔''

یہ نکتہ بھی سوامی جی کی عدم واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ الہامی کتب کا انداز بیان اور اسلوب اس قسم کا ہوتا ہے کہ کبھی تو خدا خود صیغہ متکلم میں اپنا اظہار مطالب کرتا ہے اور کبھی صیغہ غائب سے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا سکھاتا ہے اس کو بندوں کی زبان پر متکلم کے صیغہ میں جاری کراتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں آتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے مدد کرتے ہیں)۔ ادبی زبان میں اس کو صنعت التفات کہتے ہیں۔ صنعت التفات صرف الہامی کتب میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ تمام ادبی کتب میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ علم معانی میں فصاحت و بلاغت کا لازمہ ہے۔

ہم عموماً مقررین کو دیکھتے ہیں کہ پہلے وہ حاضرین سے صیغہ حاضر میں کلام کر رہے ہوتے ہیں کہ تم ایسی قوم ہو وغیرہ تم میں یہ برائیاں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد دفعتاً رُخ بدل کر صیغہ غائب میں خطاب شروع کر دیتے ہیں کہ جس قوم میں یہ برائیاں پائی جاتی ہیں وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر ادب میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید میں اسی صنعت التفات کا استعمال ہوا ہے۔ اگر سوامی جی علم البیان والمعانی سے واقف ہوتے تو یہ اعتراض نہ کرتے۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی صنعت التفات بھی ہے۔ دراصل جس چیز کو سوامی جی نے نقص خیال کیا ہے دراصل ایک ادبی خوبی ہے جس سے سوامی جی ناواقف ہیں۔

جن الفاظ کا ذکر سوامی جی نے کیا ہے ''شروع واسطے آدمیوں کے'' وہی الفاظ سورہ بقرہ میں بہتر انداز میں بیان کیے گئے ہیں ارشاد الٰہی ہے: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' یہ کتاب متقیوں کے لیے باعث ہدایت ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: هُدًى لِّلنَّاس یعنی یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کا موجب ہے۔ عربی زبان میں ہدایت کے معنی ہوتے ہیں منزل مقصود تک پہنچانا۔ گویا قرآن مجید وہ کتاب ہے جو انسانوں کو منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

وید کی ابتداء:

اگر سوامی جی کے قول کے مطابق خدا کے کلام کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ اس کی ابتداء ان الفاظ سے ہو ''واسطے ہدایت آدمیوں کے'' تو چاروں ویدوں میں سے ایک وید بھی ان الفاظ سے شروع نہیں ہوتا۔ گویا سوامی جی کے نزدیک وید الہامی کتب نہیں ہیں۔ ویدوں کا آغاز تو ایک طرف رہا۔ چاروں ویدوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ وید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئے ہیں۔

رگ وید ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: ''اگنی کی میں تعریف کرتا ہوں جو پروہت (کاہن) ہے یگیہ کا دیوتا ہے۔ رسومات سرانجام دینے والا اور دولت بخشنے والا ہے۔ (رگ وید منتر 1)

تجزیہ:

اب ذرا رگ وید کے آغاز کے الفاظ کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا کہ اگنی ایک دیوتا ہے جس سے رگ وید کا آغاز ہو رہا ہے ابتداء میں ہی شرک کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

اگر اگنی سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات بھی لے لی جائے تو وید کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے پر قادر ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی حمد کسی انسان سے ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ خدا کیا جس کی تعریف ایک انسان کر سکے۔ دوم حمد کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہا ہے کہ اس نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کی تعریف وہی ہے جو اس نے کر دی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حمد کر ہی نہیں سکتا وہ ان محاسن کا مالک ہے جن کا ایک فانی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قارئین اب ذرا قرآن مجید کے وہ الفاظ جن سے شروع ہوا ہے اور رگ وید کے الفاظ جن سے شروع ہوا ہے موازنہ کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ رحمان اور رحیم کے الفاظ کے تحت حکمت اور دانائی کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ دنیا کا تمام کاروبار انہی الفاظ پر چل رہا ہے جس پر گذشتہ صفحات میں بہ تکرار بحث گزر چکی ہے اور رگ وید کے الفاظ میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ کوئی جوڑ۔ بے ربط قسم کے الفاظ ہیں۔ دوم اگنی دیوتا کے سامنے سرخم کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔

❀.....❀.....❀

گناہ کا آغاز بسم اللہ سے ہوسکتا ہے؟

اعتراض:

''اگر کہا جائے کہ خدا آدمیوں کو ایسا کہنے کی تعلیم دیتا ہے تو بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے گناہ کا آغاز بھی خدا کے نام سے صادق آ۔ ئے گا۔'' (چودھواں باب پہلے اعتراض کا دوسرا جز)

جواب:

بسم اللہ سے گناہ کا آغاز نہیں ہوسکتا۔ سوامی جی دیانند نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات پر غور کیا ہے اور نہ مذاہب عالم کی حقیقی روح سے آشنا ہوئے ہیں۔ اگر وہ ہندو مذہب پر ہی غور و خوض کر لیتے تو اس قسم کا اعتراض نہ کرتے۔ کسی مذہب نے اللہ کے نام سے کسی برائی کے کرنے کا حکم نہیں دیا۔ تمام مذاہب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیغام لے کر آئے۔ منکرات صرف انسانی روح کی موت کا ہی سبب نہیں بلکہ دنیاوی زندگی کے لیے بھی باعث فساد اور بگاڑ ہیں۔ جو کام انسانی روح اور دنیاوی زندگی کے بگاڑ کا موجب ہو وہ اللہ کے نام سے کیسے شروع کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تو وہ ہستی ہے جو جمیع صفات حسنہ کی مالک اور تمام عیوب سے منزہ ہے۔ دوم اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس کی صفات میں رنگین ہونے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو اللہ کے رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہوسکتا ہے۔ اللہ کے رنگ سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ انسان کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ اختیار کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات جو تقاضہ کرتی ہیں اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ ہے وہ تعلیم اس اللہ کی جو اس نے قرآن مجید میں نازل کی ہے کیا کوئی ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ گناہ کا آغاز بھی خدا کے نام سے ہوسکتا ہے۔

الزامی جواب:

دیانند جی نے اپنی تصنیف ستیارتھ پرکاش کو الفاظ 'سچد انند پرماتما کو نمسکار ہو' سے شروع کیا ہے۔ کیا ان الفاظ سے کسی برائی کا بھی آغاز ہوسکتا ہے۔

جب تمام مذاہب کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ بدی اور برائی احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کا نام ہے تو پھر بُرا کام اللہ کے نام سے کیسے شروع کیا جاسکتا ہے۔

❁......❁......❁

جانوروں کو ذبح کر کے کھانا ظلم ہے

اعتراض:

اگر وہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے تو اس نے دنیا میں آدمیوں کے آرام کے لیے جانوروں کو مارنے اور بہت دکھ دلا کر ان کے گوشت کھانے کی اجازت انسان کو کیوں دی؟ کیا وہ بے گناہ جانور خدا کی مخلوق نہیں۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں) اسی طرح قربانی کو لغو اور اس کا گلا کاٹنے کو ظلم قرار دیا گیا۔ (چودھواں باب اعتراض کا تیسرا جز)

جواب:

اللہ تعالیٰ نے انسانی پیدائش سے قبل اس کی جسمانی حیات کے لیے صفت رحمانیت (رحم کرنے والا) کے تحت ہر قسم کی اشیاء کی تخلیق کردی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا جانشین بنا کر پیدا کیا۔ اگر نظام عالم پر نظر دوڑائیں تو معترض کے اعتراض کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت بلی چوہے کو اپنی غذا بناتی ہے۔ بھیڑیا، سانپ، شیر، چیتا وغیرہ اپنے سے کمزور جانوروں کو بڑی بے رحمی سے شکار کرتے ہیں۔ اور ان کا گوشت کھاتے اور خون پیتے ہیں۔ سانپ اپنی بقائے زندگی کے لیے اپنے شکار کے گھات میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ پرندوں میں سے باز اپنے سے ضعیف جانوروں کا شکار کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح مچھلی پانی میں اپنے سے چھوٹی مچھلی کا شکار کر رہی ہوتی ہے۔ گویا مختلف جانوروں کی بقائے زندگی دوسرے جانوروں پر منحصر ہے۔ اسی قانون قدرت کو دیکھ کر جینی ہندوؤں سے الگ ہو کر خدا کے منکر ہو گئے۔

جب علم طب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا ایک ڈاکٹر کے پاس ایک زخم خوردہ آدمی آتا ہے۔ اس کے زخم میں بے شمار جراثیم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مریض کی صحت یابی کے لیے ان جراثیم کو دواکش دوائیوں سے مارتا ہے اور مریض صحت یاب ہو کر ڈاکٹر کو دعائیں دیتا ہے۔

ملیریا کا مریض کونین کی چند ٹکیاں استعمال کرتا ہے تو ملیریا کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور مریض بخار سے نجات پا جاتا ہے۔ اسی طرح زراعت پر نظر دوڑائیں تو وہاں بھی دواکش دوائیوں سے جراثیم کیڑے مکوڑے مارے جا رہے ہیں۔

غرض کہ نظام عالم کو چلانے کے لیے مختلف زندگیوں کا خاتمہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ زندگیاں ختم نہ کی جائیں تو زندگی دوبھر ہو جائے۔

اسی نظام کائنات کے تحت انسانی زندگی کے لیے جانوروں، پرندوں کا گوشت بھی ضروری ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی کو اعتدال میں رکھنے کے لیے سبزیوں کا استعمال بھی ضروری ہے۔ اگر انسان صرف گوشت ہی کھاتا تو اس میں درندگی کی صفت کا غلبہ آجاتا اسی طرح اگر اس کا گزران صرف سبزیوں پھلوں پر ہوتا تو وہ بزدلی کا شکار ہو جاتا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ خوراک صرف بقائے زندگی کا ہی باعث نہیں بلکہ اس کا اثر انسانی کردار اور اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔ اس وجہ سے گوشت ان جانوروں کا حلال قرار دیا

ہے جو انسانی جسم کا جزو بن کر انسان کے کردار پر بھی اچھا اثر مرتب کرے۔ اگر خونخوار جانوروں کا گوشت استعمال میں لایا جائے تو انسان خود خونخوار بن جائے گا۔ اگر حرام مال کھایا جائے تو انسان کی روح پر اس کا بد اثر پڑے گا۔

اسلام میں گوشت خوری ظلم نہیں ہے بلکہ نظام قدرت نے خود انسان کو گوشت خور بنایا ہے۔ اس کے ساتھ اس کو سبزی خور بھی بنایا ہے۔ گوشت اور سبزی کا کھانا انسان کے مزاج کو اعتدال پر رکھتا ہے۔ اسی طرح ان کا کھانا نہ صرف جسم کی صحت کے لیے ضروری ہے بلکہ روح پر بھی اس سے خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

گوشت میں پروٹین پائے جاتے ہیں:

جن جانوروں کا گوشت انسان کھاتا ہے وہ غذائیت اور پروٹین سے بھرپور ہوتا ہے۔ گوشت میں فولاد، وٹامن بی ون اور نیاسن (Niacin) شامل ہیں۔ یہ اجزاء انسانی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وہ غذائیت انسان کے جسم کو نہ ملے تو انسان بیمار اور کمزور ہو جائے گا۔ دور حاضر میں طبی سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ انسان گوشت کھائے۔ یہی بات اسلام نے کہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (النحل 5:16) ''اس (اللہ) نے تمہارے لیے مویشی پیدا کیے۔ جن (کے اون) میں تمہارے لیے سردی سے بچاؤ اور بہت سے فوائد ہیں تم ان میں سے بعض کا گوشت کھاتے ہو۔'' دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (المومنون 21:23) ''اور بے شک مویشیوں میں تمہارے لیے ضرور عبرت ہے ہم تمہیں اس میں سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں دودھ ہے اور تمہارے لیے ان میں بے شمار فوائد ہیں اور تم ان میں سے بعض کا گوشت کھاتے ہو۔''

گوشت اور دودھ میں بھرپور غذائیت ہے جو اپنے اندر انسان کے کے لیے بے شمار فوائد وثمرات رکھتا ہے۔

انسان کا نظام انہضام:

جو جانور صرف گوشت خور جانور ہیں ان کا نظام انہضام اللہ تعالیٰ نے اس طور پر بنایا ہے وہ صرف گوشت ہی ہضم کر سکتے ہیں وہ سبزی کے لیے موزوں نہیں اسی طرح جو جانور سبزی خور ہیں ان کا نظام انہضام صرف سبزی ہضم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ وہ گوشت کو ہضم نہیں کر سکتے۔ لیکن جب انسان کے نظام ہضم کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا نظام انہضام سبزی اور گوشت دونوں کے ہضم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے قدرتی طور پر گوشت اور سبزی دونوں ضروری ہیں۔

جانوروں کے ذبح کرنے میں فلسفہ:

جانوروں کے ذبح میں ایک حکمت ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کی رو سے تمام کائنات انسان کی خادم ہے۔ جب انسان کسی جانور کو اپنی چھری کے نیچے ذبح کرنے کے لیے لاتا ہے تو وہ جانور بغیر کسی مزاحمت اور مدافعت کے اپنی گردن چھری کے نیچے رکھ دیتا ہے مالک اس کو ذبح کر دیتا ہے۔ اس میں یہ حکمت اور فلسفہ ہے کہ جب جانور نے اپنے مالک کے سامنے بغیر مزاحمت اور مدافعت کے گردن رکھ دی ہے تو انسان بھی اپنے مالک خدا کے سامنے اپنے نفس کی سرکش اونٹنی کو اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے ذبح کر دے۔ نفس کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان احکام الٰہیہ کے تابع اور فرمان بردار بن جائے۔ جب انسان خدا کے احکام کے تابع ہو کر زندگی بسر کرے گا تو اس کا سرکش نفس مطیع و منقاد بن جائے گا۔ یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے اور جانور کا ذبح کرنا یہی فلسفہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

گویا جانوروں کو ذبح کرنا ظلم نہیں بلکہ اس میں ایک عظیم حکمت پوشیدہ ہے کہ انسان کو جانور کی طرح اپنے مالک کا مطیع و منقاد رہنا چاہیے اوراس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔

پودے بھی جان دار ہیں:

سائنس نے یہ ثابت کردیا کہ پودے بھی جان رکھتے ہیں۔اب اس تحقیق کو تمام سائنس دانوں نے تسلیم کیا ہے۔جو بھی چیز جاندار ہوتی ہے اس کو ذبح کیا جائے تو وہ تکلیف محسوس کرتی ہے۔لہٰذا جب پودوں کو کاٹ کر جانوروں کے چارے کے طور پر ان کے سامنے ڈالا جاتا ہے تو کاٹتے وقت پودے بھی لازمی طور پر تکلیف اور درد محسوس کرتے ہیں۔صرف بات اتنی ہے کہ انسان ان کے درد کی آواز سن نہیں پاتا۔اب تو ایک امریکی سائنس دان نے ایک ایسا آلہ ایجاد کرلیا ہے جو درختوں اور پودوں کو چیخ و پکار کو اس طرح تبدیل کردیتا ہے کہ اسے انسان سن سکے۔اسی طرح انسان اس آلہ کی معرفت اس قابل ہوگیا ہے کہ پودا کب اپنی سیرابی کے لیے چیخ رہا ہوتا ہے۔

یہ بات صرف سائنس ہی نہیں کہہ رہی بلکہ معترض دیانند سرسوتی بھی خود اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے صفحہ 342 پر اس کا اقرار کرچکے ہیں (جو نہایت درجہ کے تموگنی ہیں وہ غیر متحرک درخت وغیرہ کیڑے مکوڑوں کا مچھلی، سانپ، کچھوے، مویشی اور مرگ (جنگلی چوپایہ) کا جنم پاتے ہیں۔لہٰذا سوامی جی کے اس نظریہ کی رو سے درخت کا ٹنا اور مویشی اور چوپائے کو ذبح کرنا برابر ہو جاتا ہے۔گویا معترض کا اپنا نظریہ ہی ان کے اعتراض کو رد کررہا ہے۔اگر حیوانات کا گوشت کھانے میں بے رحمی ہے تو نباتات کھانے میں بھی ہے اور درخت کاٹنا بھی بے رحمی میں شامل ہے۔

انسان کے گوشت خور ہونے کے عقلی اور طبعی دلائل:

1۔قدرت نے انسان کے بچے کے لیے سب سے پہلی جو غذا تجویز کی ہے وہ دودھ ہے۔دودھ چربی اور گوشت کا جوہر ہے۔بچے کے معدہ کے لیے یہی غذا موزوں ہے۔اسی طرح دنیا کے تمام لوگ دودھ پیتے ہیں اور دودھ کو صحت کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔وہ دودھ بھی جانور کی چربی اور گوشت کا عطر ہے جسے وہ پی رہے ہیں۔معترضین جانوروں کے گوشت اور چربی کا جوہر تو پی رہے ہیں لیکن گوشت اور چربی کھانے پر معترض ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ سبزی خور ہے کیونکہ جو بھی اپنے آپ کو سبزی خور کہتا ہے وہ دودھ تو پیتا ہی ہے جو گوشت اور چربی کا لازمی جزو ہے۔

2۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو دانت دیے ہیں۔ان جانوروں کو بھی دانت دیے ہیں جو سبزی خور ہیں اور انسان کو بھی جو گوشت خور ہیں۔سبزی خور جانوروں کے دانت چوڑے ہیں اور گوشت خور جانوروں کے دانت نوکیلے۔جب کہ انسان کے دانت نوکیلے اور چوڑے دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔اس وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسان سبزی خور اور گوشت خور ہے۔اسی طرح معدہ انتڑیوں، جگر اور لبلبے کے عرقوں کو جو غذا ہضم کرتے ہیں ان میں گوشت کو ہضم کرنے کی خاصیت رکھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان فطرتاً سبزی اور گوشت خور ہے۔

3۔انسان کا جسم گوشت کا بنا ہوا ہے اس لیے فطرتاً وہ غذا جلد جزو بدن بن سکتی ہے جو گوشت کی قسم سے ہوگی۔اس لیے انسان جو مختلف غذائیں استعمال کرتا ہے ان میں سے گوشت انسان کے لیے زود ہضم اور قوت بخش ہے۔نباتاتی غذا میں فضلہ زیادہ ہوتا ہے۔اگر اس شخص کو جو سبزی خور ہے مشقت اور محنت کا کام کرنا پڑے تو وہ جلد تھکن محسوس کرے گا اور جسم میں طاقت کی کمی محسوس کرے گا۔

اس کے بالمقابل وہ شخص جو گوشت خور ہے وہ تھکن محسوس نہیں کرے گا، نہ اپنے اندر جسمانی کمزوری پائے گا۔ وہ مضبوط جسم ہونے کی وجہ سے محنت طلب کام بخوبی سرانجام دے لے گا۔

4۔ قدرت نے انسان کو ایسے علاقوں اور خطوں میں پیدا کیا ہے جہاں گوشت کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ صحراؤں اور جنگلوں میں مال مویشی پالتے ہیں ان کی اون سے کپڑے بنالیتے ہیں اور ان کے گوشت سے خوراک حاصل کرتے ہیں یا شکار کھیل کر گزران کرلیتے ہیں۔ جو لوگ ساحل سمندر پر رہتے ہیں ان کا گزارا مچھلی کے گوشت پر ہوتا ہے۔ یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ قدرت نے انسان کی غذا گوشت بنائی ہے۔ اسی طرح یہ بات یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ انسان بالطبع گوشت کی طرف مائل ہوتا ہے۔

5۔ دیانند سوامی جی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کسی جانور کو ذبح کرنے کو بے رحمی قرار دیا ہے۔ معترض کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی چیز کو اس کے مقصد پیدائش کے مطابق استعمال کیا جائے تو اس کو بے رحمی اور ظلم نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً ایک گھوڑا سواری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر سوار ہو کر چند میل کا سفر طے کرتا ہے تو یہ بے رحمی اور ظلم نہیں اس لیے کہ گھوڑے کی پیدائش کی غرض و غایت ہی یہی ہے کہ وہ سواری کے کام آئے۔ کسان بیل کو جوت کر کھیتوں میں ہل چلاتا ہے۔ اسی طرح مختلف جانوروں سے مشقت کے مختلف کام لیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی ظلم کی بات نہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں ان جانوروں سے یہی کام لیے جارہے ہیں جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ جانور اسی غرض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے اور لوگ ان کا گوشت کھاتے ہیں وہ ان جانوروں پر ظلم نہیں کر رہے بلکہ ان کے مقصد پیدائش کے مطابق انھیں استعمال میں لایا جارہا ہے۔ اگر انسان ان جانوروں کے مقصد پیدائش کے مطابق استعمال کرنے سے اجتناب کرے تو انسان کی زندگی دوبھر بن جائے اور تمدنی زندگی کا ارتقاء رک جائے۔ لہٰذا مسلمان ان جانوروں کو ذبح کر کے ان کے مقصد پیدائش کو پورا کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید جانوروں کے اسی مقصد پیدائش کی طرف اس آیت میں توجہ دلاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ○ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ○ (یٰسین 36: 71،73) ”کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے۔ جو ہمارے ہاتھوں نے بنائے۔ پھر یہ ان کے مالک بنے ہوئے ہیں اور انہیں ان کے بس میں ہم نے کردیا ہے۔ پس یہ ان میں سے بعض پر سواری کرتے ہیں اور بعض کو کھاتے ہیں اور ان کے لیے ان میں بہت فائدے ہیں پینے کے لیے (دودھ) ہے۔ کیا وہ شکر نہیں کرتے۔“

اس آیت کریمہ میں جانوروں کا مقصد پیدائش بیان کیا گیا ہے کہ بعض جانوروں کو سواری کے لیے پیدا کیا ہے بعض کا گوشت کھانے کے لیے، بعض کا دودھ پینے کے لیے۔ انسان ان کی پیدائش کے مقصد کو سامنے رکھ کر ان سے فائدہ حاصل کر رہا ہے۔

5۔ اگر ان جانوروں کو ذبح نہ کیا جائے اور گوشت خوری کر حرام قرار دے دیا جائے تو دنیا ان جانوروں سے ہی بھر جائے اور انسانوں کے رہنے کی جگہ ہی نہ ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نظام عالم کو چلانے کے لیے ایسے قانون نافذ کیے ہیں جن سے نظام کائنات درہم برہم نہیں ہوسکتا۔ گوشت خوری بھی نظام عالم برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ گوشت خوری کی ممانعت اللہ کے قانون میں صریح مداخلت ہے۔

دیانند جی کو جانوروں کو ذبح کرنے پر بہت ترس آیا ہے اور اس کو بے رحمی قرار دیا۔ جب کہ ویدوں میں دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کا سبق دیا ہے: حالانکہ انسان اشرف المخلوقات اور خالق اکبر کی صفت خالقیت کا مظہر اتم ہے۔

یجر وید میں آتا ہے: ''جو ہمارے ساتھ دشمنی کرتے ہیں یا ہم ان سے دشمنی کرتے ہیں ان کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ماریں جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔''

اخلاق پر اثر:

جانور کا گوشت جہاں انسانی جسم کی قوت کا ذریعہ ہے وہاں ذبیحہ انسان کے اخلاق پر بہت عمدہ اثر ڈالتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اگر وہ اس کی بقائے حیات کے لیے ضروری ہے تو وہاں اس خوراک (اکل، شرب) کا انسان کے اخلاق پر بھی اثر پڑتا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ نباتات خور قومیں بزدل اور نرم مزاج ہوتی ہیں۔ وہ اپنے سامنے خون کو بہتا نہیں دیکھ سکتیں۔ اس کے بالمقابل جو قومیں گوشت خور بھی ہیں اور نباتات خور بھی تو وہ بہادری اور شجاعت کے خلق سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اور وہی حکمرانی کی مستحق ہوتی ہیں اور وہی دنیا میں عدل وانصاف قائم کرتی ہیں۔

ایک تو ذبیحہ کا گوشت انسان کے اندر مادۂ شجاعت پیدا کرتا ہے۔ دوم جو شخص ذبیحہ کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا ہے اور اس جانور کے خون کے گرانے کی ہمت ہوتی ہے تو لازمی طور پر یہ سارا عمل انسان کے اندر بہادری اور شجاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو قوم مرغی کے ذبح ہونے کو دیکھ نہیں سکتی تو گویا وہ شجاعت کے جذبہ سے عاری ہے۔ لہٰذا ذبیحہ کا اکل لحم اور ذبح کا عمل دونوں قوم میں بہادری کا وصف پیدا کرتے ہیں اور بہادر قومیں ہی دنیا میں زندہ رہتی ہیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ بزدل قومیں دنیائے ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔

تکبیر کا اخلاقی فائدہ:

جب ایک انسان کسی جانور کو ذبح کر رہا ہوتا ہے تو لازمی طور پر اس جانور پر اس کا تصرف اور بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ بڑائی اور تصرف اللہ تعالیٰ نے ہی دیا ہے۔ جب انسان جانور کو ذبح کرے گا اس کے حلق پر چھری پھیرنے سے قبل اللہ اکبر کہے گا تو اس کے دل ودماغ میں یہ بات راسخ ہو جائے گی کہ حقیقی کبریائی کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس جانور پر جو اس کا تصرف ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اس سے انسان کے دل میں تکبر اور سخت دلی پیدا نہیں ہوتی۔ گویا اللہ اکبر تکبر اور سخت دلی کے اخلاقی مرض کا علاج ہے۔

الزامی جواب: (ہندوؤں کی کتاب سے رد)

معترض دیانند جی اور ان کے دیگر ہم خیال جو گوشت خوری کو ظلم قرار دے کر مذہب کے خلاف قرار دیتے ہیں انہی کی کتب میں گوشت خوری کی اجازت ہے۔ چنانچہ منوسمرتی کے باب 5 کی 30 ویں سطر میں لکھا ہے: ''جو شخص (ان جانوروں کا) گوشت کھائے جن کا گوشت کھانا چاہیے تو وہ کوئی بُرا کام نہیں کرتا خواہ وہ ایسا روزانہ کرے۔ کیونکہ خدا نے کچھ چیزیں کھائے جانے کے لیے پیدا کی ہیں اور کچھ کو ان چیزوں کو کھانے کے لیے پیدا کیا ہے۔

منوسمرتی کے باب 5 کی اکتیسویں (31 ویں) سطر میں لکھا ہے:

''قربانی کا گوشت کھانا صحیح ہے کیونکہ یہی دیوتاؤں کا روایتی طریقہ ہے۔'' منوسمرتی کے باب 5 سطور 39، 40 میں لکھا ہے:

''خدا نے خود ہی قربان کیے جانے والے جانور قربانی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اس لیے قربانی کے لیے ان کو ہلاک کرنا دراصل ہلاک کرنا نہیں۔''

مہابھارت انوشاشن پروا کے باب نمبر 88 میں یدھشٹر اور بھیشم کی گفتگو درج ہے کہ اس میں مُردوں کی رسوم میں باپ دادا کو

کس طرح خوراک پیش کرنی چاہیے کا ذکر ہے۔ اس میں مختلف جانوروں کے ذبح کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

جانور ذبح کرنے (قربانی) کی تاریخ:

انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا کی جلد 21 صفحہ اور انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد 4 ص 4187 تا 4240 میں ہے ایران، انڈیا، یونان، روم، عرب، افریقہ، قدیم امریکہ اور روما میں قربانی کا عام رواج تھا اور قربانیاں رضا الٰہی، کفارہ معاصی، ازالہ غضب اصنام کے لیے غریب شاعر کی قوت بڑھانے، بیمار کی شفا کے واسطے، قربانیاں ہوا کرتی تھیں۔ عبرانیوں میں شکریہ، کفارہ اور حمد الٰہی کے لیے لڑکے کے تولد، ختنہ، شادی پر اور مہمان کے آنے پر، فتح مندی، زمین کے جوتنے، کنویں کی بنا، بنیاد عمارت، باہمی معاہدہ، مردہ کی سالانہ رسم، شکار کے بعد اور جب کوئی جانور پہلا بچہ دے تو قربانی ہوا کرتی تھی۔

بابلی لوگوں میں قیدیوں میں سے ایک انسان کی قربانی اور افریقہ میں حسین آدمی کی قربانی ہوتی تھی۔ بابلیوں میں ہرن کی قربانی اور عبرانیوں میں بادشاہ اور رعایا کی طرف سے شاہی قربانی چھ لیلے اور ایک دنبہ ضروری تھا۔ سوختنی قربانی بھی اگنی دیوتا کے لیے ہوتی تھی۔ اس کو عولی کہتے تھے۔ حضرت سلیمان نے جب ہیکل تیار کیا تو قربانیوں کی نوبت لاکھوں تک پہنچی۔ روما میں سور کی، یونان میں شراب کی قربانی بھی معمول تھا۔ میکسکو میں تین منزلہ مندر میں سبز پتھر پر قربانی ہوتی تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا جلد 16 ...... 210 ملاحظہ کیجئے۔ دعا اور قربانی لازم وملزم جلد 24 ص 300)۔

داہومی میں بادشاہ کی وفات پر دو ہزار آدمی کی قربانی ہوتی ہے۔ (صدا نمبر 51)

انگلستان میں دور وایڈ سن قوم میں قربانی تھی۔ انڈیا کی تمام اقوام میں، جلد 29 ...... 280 سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانیاں ہوتی تھیں۔

مسیحی دین میں مسیح علیہ السلام نے قربانی کی بہت تاکید ہے اور تمام انبیاء بنی اسرائیل قربانی کے موید ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اپنے بیٹے اسماعیل کو رضا الٰہی کے لیے ایک خواب کی بنا پر ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ جب تاریخی لحاظ سے بھی یہ بات واضح ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کا (قربانی) قدیم ازمنہ میں دنیا کے ہر خطہ میں رواج تھا تو پھر اسلام کی تعلیم پر اعتراض کرنا محض نادانی، ناواقفیت اور تعصب کی علامت ہے۔ چنانچہ دیانند سرسوتی کے اِس اعتراض میں کوئی وزن اور معقولیت نہیں۔

❁......❁......❁

اسلام میں ذبح کرنے کا طریقہ ظالمانہ ہے

اعتراض:

''مسلمانوں کے طریقہ ذبح سے جانور زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے اور یہ ظالمانہ طریقہ ہے۔'' دیانند جی نے بھی جانوروں کو ذبح کرنا رحم کے خلاف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''قصاب جانوروں کا گلا کاٹنے میں بسم اللہ پڑھتے ہیں اس سے مسلمانوں کا خدا رحیم ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی رحمت جانوروں پر نہیں۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں) پہلے اعتراض کا چوتھا جز۔

جواب:

دیانندجی اوران کے ہم خیال معترضین نے یہ اعتراض بھی محض ذبح کے طبعی فلسفہ سے ناواقفیت کی وجہ سے کیا ہے۔ اس سوال کا عمومی جواب تو پہلے ہی دیا جاچکا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنا تو ان کے مقصد پیدائش کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کسی جانور کو ذبح کرنا کوئی ظلم نہیں۔ باقی رہا مسلمانوں کا دھیرے دھیرے کسی جانور کو ذبح کرنے کا طریقہ۔ جب طب کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے تو اس کی حکمت سامنے آجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کتنے حکیم تھے اور طب کے اصولوں سے واقف تھے۔

طب کی رو سے ذبح کی وضاحت:

خون انسان کے اعضاء اور چھوٹے چھوٹے اجزاء کو غذائیت، طاقت اور آکسیجن پہنچاتا ہے اور خون میں کچھ ایسے زہریلے مادے بھی ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے اندر حل کر کے پیشاب اور تنفس کے ذریعے خارج کرتا رہتا ہے۔ اگر خون میں ان کی مقدار بڑھ جائے تو انسان قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مثلاً وجع المفاصل، نقرس وغیرہ۔ اگر پیشاب کے ذریعے زہر خارج نہ ہوتو اعصاب میں تشنج پیدا ہوجاتا ہے تو انسان غشی کے دوروں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

جو رگیں دل سے اطراف جسم کو مصفا خون پہنچاتی ہیں اور انسان کی حیات کا سبب ہیں وہ شریانیں کہلاتی ہیں اور جو رگیں تمام اطراف جسم سے زہریلا اور گندہ خون لے کر واپس دل کو آتی ہیں وہ ورید کہلاتی ہیں۔ دل کی حرکت سے ہی دوران خون جاری ہے۔ دل کے سکڑنے سے صاف خون شریانوں میں جسم کی طرف چلتا ہے اور دل کے پھیلاؤ سے جو خلا اس میں پیدا ہوتا ہے اس کی کھینچ پڑنے سے گندہ خون واپس دل کی طرف لوٹتا ہے۔ پٹھوں کی حرکت بھی اس خون کو جلد واپس بھیجنے میں مدد کرتی ہے۔

تندرست اور صحت مند گوشت کے حصوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ گندہ اور زہریلا خون جسم سے نکال دیا جائے۔ اس لیے اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ گردن کے سامنے کی رگوں کو کاٹ دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کا تعلق قلب سے برقرار رہتا ہے اور قلب کی حرکت جاری رہتی ہے اور آہستہ آہستہ خون کے نکل جانے سے حرکت قلب بند ہوجاتی ہے۔ قلب کی اس حرکت سے تمام خون کٹی ہوئی رگوں سے باہر نکل جاتا ہے۔ ایک طرف دل پھیلتا ہے دوسری طرف جانور کے تڑپنے سے پٹھوں میں حرکت ہوتی ہے جس سے جسم کی وریدوں کا زہریلا خون فوراً دل میں آتا ہے۔ وہاں سے شریانوں کے ذریعے کٹے ہوئے گلے سے خون خارج ہوجاتا

ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ سے ذبح انسان کو تندرست اور صحت مند زہروں سے پاک گوشت مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے گلا گھٹ کر مرا ہوا، سینگ کی ضرب سے مرا ہوا، گر کر یا چوٹ لگ کر مرا ہوا حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان طریقوں سے زہریلا خون گوشت کے اندر ہی رہتا ہے جو انسان کی صحت کے لیے مضر ہے۔

دوسرا طریقہ جھٹکا:

مسلمانوں کے طریقہ کے مقابلے پر ایک اور طریقہ جھٹکا ہے۔ کہا جاتا ہے جھٹکا سے جانور کو کم تکلیف ہوتی ہے ایک ہی وار سے اس جانور کا سر جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔

جب اس طریقہ کو طبی اصولوں پر پرکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جب جھٹکے میں تلوار کا وار گردن کے اوپر کے حصے پر پڑتا ہے تو گردن کے مہرے کی ہڈیوں کو توڑتے ہوئے حرام مغز کو کاٹ دیتا ہے۔ اس طرح دماغ اور اس کے اعصاب کا تعلق دل اور اس کی رگوں سے یک دم منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دل کی حرکت اچانک بند ہو جاتی ہے اور تمام خون اندر کا اندر ہی رہ جاتا ہے۔ صرف وہ خون جو شریانوں کے ذریعے دل سے دماغ کی طرف چل چکا ہوتا ہے وہ گلے کی شریانیں کٹنے سے نکل جاتا ہے۔ مگر باقی تمام جسم کا زہریلا اور گندہ خون جو وریدوں کے ذریعے دل کی طرف آ رہا ہوتا ہے دل کی حرکت بند ہو جانے سے وہیں کا وہیں رک جاتا ہے۔ اس طرح وریدوں کا خون مع اپنے زہریلے مواد کے جانور کے اندر ہی رہ جاتا ہے۔ جو انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔

اس بحث سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا بتایا ہوا طریقہ ہی بہتر ہے۔

نوٹ:

اونٹ کی گردن نہیں کاٹی جاتی بلکہ اس کے حلق میں زور سے نیزہ مارا جاتا ہے جس کو عربی زبان میں نحر کہتے ہیں۔ اس سے بھی آہستہ آہستہ خون جسم سے نکل جاتا ہے اور گوشت فاسد مادوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

معترض اسلام کے دھیرے دھیرے گلا کاٹنے کو زیادہ تکلیف کا باعث گردانتا ہے۔ حالانکہ جانور کو گردن کی سخت ہڈی کٹنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ جب کہ نرم رگوں کے کاٹنے سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔ صرف ایک دفعہ رگوں پر چھری پھرنے سے ہی درد اور تکلیف کی حس ختم ہو جاتی ہے۔ جو جانور تڑپتا نظر آتا ہے اس کی وجہ پٹھوں کا بے اختیاری کے ساتھ سکڑنے اور پھیلنے کی وجہ سے ہے۔

الزامی جواب:

ہندوؤں کی مذہبی کتاب شاستر میں لکھا ہے کہ ہنسا (ذبح حیوانات)۔ ہنسا (دل آزاری) نہیں کہلاتی۔ (منو 39:5)

لہٰذا جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کا کھانا ہی ان پر رحمت ہے کیونکہ وہ اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اگر ان کو ذبح کر کے نہ کھایا جائے تو یہ قانون قدرت میں صریح مداخلت ہوگی۔ قانون قدرت میں مداخلت انسان کے لیے مضر ہے۔ دیانند جی نے تو اسلام کے طریقہ ذبح کو بے رحمی اور سنگدلی قرار دیا ہے۔ جب ان کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں نہایت ہی سنگدلی کی تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ یجر وید بھاشیہ 65:16 اور 19:15 میں لکھا ہے: ”جو ہمارے ساتھ دشمنی کرتے ہیں یا ہم ان سے دشمنی کرتے ہیں ان کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ماریں جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔“

❀......❀......❀

جہاد پر اعتراض

ایک اہم اعتراض:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر جن غیر مذاہب (عیسائی، یہودی اور ہندو) مصنفین نے لکھا ہے تو انہوں نے جہاد پر ضرور اعتراض کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ قرآن مجید مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ جہاں کفار کو پائیں انہیں قتل کر دیں۔

سوامی دیانند جی سرسوتی نے بھی ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں یہ اعتراض دوہرایا ہے۔ اگر قرآن کا خدا کل جہاں کا پروردگار، رحمٰن اور رحیم ہوتا تو اور مذہب والوں اور جانداروں کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے مروانے کا حکم نہ دیتا۔ (اعتراض 2)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے: ''اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔''

اسی مشہور مستشرق کلین نے بھی اپنی کتاب ریلیجن آف اسلام میں سب سے بڑا اعتراض یہی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مستشرقین اس اعتراض پر متفق نظر آتے ہیں۔

جواب:

سب سے پہلے جہاد پر مفصل بحث کی جاتی ہے۔ درحقیقت معترضین نے قرآن مجید میں بیان کردہ لفظ جہاد کے معانی کی گہرائی و گیرائی اور اس کے فلسفہ کو سمجھ نہیں پائے۔ محض ناسمجھی یا تعصب کی بناء پر لفظ جہاد کو قتال اور بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے معنی میں لے لیا ہے جب کہ لفظ جہاد علاوہ دیگر معانی کے دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لیے مستعمل ہوا ہے۔

اسلام میں جہاد کی حقیقت واہمیت

جہاد کے لغوی معنی:

لفظ جہاد جُہد یا جَہد سے مشتق ہے جَهَدَ یا جَاهَدَ کے معنی ہیں ایک شخص نے کوشش کی، محنت کی یا لیاقت خرچ کی۔ جَاهَدَ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں اس نے خوب سعی کی۔ اپنی لیاقت اور طاقت سے پورا کام کیا۔ جہاد اصل مصدر ہے یعنی مشقت، محنت تکلیف، تھکان۔

جوہری اپنی صحاح میں لکھتا ہے: جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مُجَاهَدَةً وَ جِهَادَةً وَ جِهَادًا اور نیز اجْتَهَدَ اور جَاهَدَ کے معنی ہیں اس نے خوب زور لگایا اور جفا کشی کی۔

مصباح المنیر میں ہے: جَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ جِهَادًا اور اِجْتَهَدَ فِي الْاَمْرِ کے معنی ہیں اس نے اللہ کی راہ میں اپنی طاقت اور کوشش سے پورا پورا کام کیا۔

امام راغب جہاد اور مجاہد کے معنی دشمن اور دفاع کے لیے طاقت خرچ کرنا لکھتا ہے پھر بیان کرتا ہے جہاد تین قسم پر مشتمل ہے۔(1) کھلے دشمن کے خلاف۔ (2) شیطان کے خلاف۔ (3) نفس کے خلاف۔

قرآن مجید میں جہاد اور اس کے مشتقات کے معنی:

جہد یا جہاد اور اس کے مشتقات قرآن کی مکی اور مدنی سورتوں میں آئے ہیں۔

لفظ جہاد مکی سورتوں میں:

وَ الَّذِيْنَ جَا هَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِ يَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (سورہ عنکبوت 29) اور جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں جَا هَدُوْا جو جہاد یا مجاہدہ سے مشتق ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَ جَا هَدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (سورۃ الحج 22 آیت 78) اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے۔ اس آیت میں بھی خدا کا قرب حاصل کرنے کے معنی میں لفظ جاھدو استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَا هِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (سورۃ الفرقان 52:25) پس کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ جہاد کر جو بڑا جہاد ہے اس آیت میں بِهٖ کی ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹتی ہے۔

لفظ جہاد مدنی سورتوں میں:

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ جَا هِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنَا فِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَا وٰهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (سورۃ توبہ 9 آیت 73) اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کر اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ اسلام میں اس امر پر شاہد ہے کہ منافقین کے ساتھ رسول اکرم ﷺ نے کبھی لڑائی نہیں کی۔ اس آیت میں کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرنا انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں یہ لفظ مکی سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَ الَّذِيْنَ هَا جَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بقرہ آیت 28) اس آیت میں لفظ جَاهَدُوْا جو جہد یا جہاد سے مشتق ہے جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں لفظ جہاد کا استعمال:

حدیث میں بھی یہ لفظ صرف جنگ کے معنوں میں ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً رسول کریم ﷺ نے حج کو افضل جہاد قرار دیا ہے فرمایا اَفْضَلُ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ یعنی بہترین جہاد حج مبرور ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد والسیر کے عنوان کے تحت تبلیغ اسلام کے متعلق احادیث لائے ہیں مثلاً: دُعَاءُ النَّبِيِّ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِلَى الْإِ سْلَامِ وَالنَّبُوَّةِ وَ اَنْ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اَرْ بَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بخاری 106)
حضرت نبی کریم ﷺ کا مشرکین کو اسلام کی دعوت دینا اور یہ کہ وہ اللہ کے سوائے کسی اور کو معبود نہ بنائیں۔
باب نمبر 143 کا عنوان ہے: فَضْلُ مَنْ اَسْلَمَ عَلٰى يَدَيْهِ رَجُلٌ اس شخص کی فضیلت جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو۔

باب نمبر 178 کا عنوان ہے: كَيْفَ يُعْرَضُ الْإِ سْلَامُ عَلَى الصَّبِيِّ یعنی بچے کے سامنے کس طرح اسلام پیش کیا جائے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاری کے زمانہ تک لفظ جہاد وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

جہاد کا لفظ جنگ کا مترادف نہیں:

مستشرقین جہاد کے معنی صرف ''کفار کے ساتھ جنگ کرنے'' کے لیتے ہیں جیسا کہ جہاد کی لغوی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے جہاد کا لفظ نہ قرآن میں نہ حدیث میں اور نہ لغت میں صرف جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ جنگ کے لیے عربی زبان میں حرب وقتال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عرب استعارہ اور تشبیہ کے طور پر یہ الفاظ (روع وفزع وخوف) شر (اصل میں معنی بدی کے ہیں) اہیاج برانگیختگی مغضبہ (غصہ ناراضی) لڑائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اسی طرح جنگ کو چکی سے بھی تشبیہ دی ہے اِذَا دَارَتْ رَحَى الْحَرْبِ الزَّبُوْنِ جب جنگ کی چکی چلتی ہے۔

پہلا داعیہ: اسلام نے کب جنگ کرنے کی اجازت دی (حفاظت خود اختیاری):

اسلام صرف مدافعت دین اور حفاظت خود اختیاری کے لیے لڑائی کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُنِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج 22:40) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعے مدافعت نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔
یہ آیات اس امر پر بین ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں اور ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقا اور زندگی خطرے میں تھی۔ کفار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مکہ میں کفار کا ظلم وستم انفرادی طور پر تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے تھے لیکن جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آ گئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعے اسلام کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا کے لیے لڑائی لڑی جائے۔
آیت 40 اسلامی جنگوں کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی جنگیں صرف مسلمانوں کی اپنی مذہبی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں۔ جنگوں کی غرض تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت ہے اس لیے کہ عبادت گاہوں کی حفاظت مذہبی تحفظ پر دلالت کرتی ہے۔
اس آیت میں قیام امن کا نہایت ہی سنہری اصول بیان کیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے ماننے والوں اور ان کی

عبادت گاہوں کو دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

مستشرقین کی سمجھ اور ادراک پر افسوس ہے کہ وہ جنگیں جو قیام امن اور مذہبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے لڑی گئی تھیں ان کو وہ بے رحمی اور ظلم کی جنگوں کا نام دیتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے: وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (بقرہ آیت 217) اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو۔

یہ آیت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کافر مسلمانوں سے اس لیے جنگ لڑتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے ہٹا دیں۔ یہ آیت مستشرقین کے اس اعتراض کی بیخ کنی کرتی ہے کہ مسلمانوں نے کفار کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جنگیں نہیں کیں۔

پھر قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (بقرہ) اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اس آیت میں واضح طور پر اسلامی جنگ کا اصول بیان کیا ہے کہ جنگ صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ختم کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی اسلام نے مسلمانوں کو یہ اخلاقی تعلیم بھی دی ہے کہ جنگ میں زیادتی نہ کی جائے۔

جنگ کا دوسرا داعیہ (نقض عہد):

اسلام نے ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے جو نقض عہد کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نقض عہد خرمن امن کو بھسم کر دیتا ہے اور اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک معاہدات کی پابندی نہ کی جائے۔ اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِهَا (النحل 91:16) جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد انھیں نہ توڑو۔ اس آیت کے بعد معاہدہ توڑنے والوں کی مثال ایک بے وقوف عورت سے دی ہے جو سوت کاتتی ہے پھر کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ (النحل 92:16) اے معاہدہ توڑنے والو تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو اپنے سوت کو کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے تم اپنی قسموں کو آپس میں مکر و فریب کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے نفع میں بڑھ جائے۔

اسلام نے صرف اس قوم سے لڑنے کی اجازت دی ہے جو معاہدات کے کرنے کے بعد بار بار توڑتی ہے اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے خطرہ کا موجب بنتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا یَتَّقُوْنَ۔ (الانفال 56:8) وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں وہ عہد کے توڑنے کے جرم سے نہیں بچتے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (الانفال 57:8) سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان کو عبرت ناک سزا دے کر منتشر کر دے تاکہ ان کی آنے والی نسلیں نصیحت حاصل کریں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ

(الانفال 58:8) اگر تجھے کسی قوم کی بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے، اللہ عہد میں خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بدعہد قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ معاہدہ قوم کی بدعہدی کا علم ہو جانے کے بعد ان کو برابر کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔

رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کفار کی اذیتوں کی وجہ سے مکہ سے مدینہ ہجرت کر آئے تو آپ نے مدینہ میں یہود سے بھی معاہدے کیے اور گردو نواح کے قبائل سے بھی معاہدے کیے تا کہ ہر گروہ امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہود نے اپنے معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مدینہ پر حملہ آوروں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے لیے وہ مار آستین ثابت ہوئے۔ رسول کریم ﷺ نے ان کی بدعہدی کی وجہ سے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔ مسلمانوں کا بدعہد یہود سے مقابلہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے بلکہ یہ مقابلہ ان کی بدعہدی کی وجہ سے تھا۔

رسول کریم ﷺ نے مکہ پر حملہ اس وجہ سے کیا تھا کہ انہوں نے صلح حدیبیہ کی شرط کی خلاف ورزی کی تھی۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور بنو بکر قریش کے۔ بنو بکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے ان کی مدد کی، بنوخزاعہ اپنی مظلومیت کی داستان لے کر بارگاہ رسالت میں پہنچے۔ رسول کریم ﷺ نے ایک قاصد قریش کے پاس تین شرائط کے ساتھ بھجوایا تو خون بہا دے دیں یا بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ یا یہ اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا ہے۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی۔

اب رسول کریم ﷺ پر بنوخزاعہ کے ساتھ معاہدہ ہونے کی وجہ سے یہ فرض تھا کہ وہ ان کی مدد کرتے۔ سو رسول کریم ﷺ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ آور ہوئے۔

کیا دنیا کا کوئی قانون اس حملہ کو جارحانہ حملہ کہہ سکتا ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ حملہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ قریش کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے۔

اسی طرح مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کی مٹھ بھیڑ کی وجہ بھی نقض عہد تھا۔ مشرکین عرب جب موقع پاتے تو معاہدات کو پس پشت ڈال کر اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتے۔ رسول کریم ﷺ قیصر روم کے حملہ کو روکنے کے لیے عرب کی شمالی سرحد تبوک پر گئے تھے تو مشرکین نے اس نازک موقعہ پر تمام معاہدات کو پس پشت پھینک دیا اور اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہرقل کی فوجیں بعض وجوہات کی بنا پر میدان جنگ میں نہ آئیں اور مسلمان بغیر لڑائی لڑے واپس آ گئے۔ مشرکین اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

اس قسم کی غداریوں کی روک تھام کرنا ہر حکومت کا فرض ہے۔ اس روک تھام کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا ہے: فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (توبہ 5:9) پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔

رسول کریم ﷺ نے حج کے دن ان مشرکین سے اعلان جنگ کیا اور حرمت والے چار ماہ کا نوٹس دیا تا کہ وہ لڑائی کی تیاری کر لیں۔ کیونکہ مشرکین معاہدات کو بار بار توڑنے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ان کو کھلا

چھوڑنے کی وجہ سے امن میں خلل آتا تھا۔ اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ مطیع ہو کر اسلامی حکومت کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ملک کا امن برقرار رہ سکے۔ اب کون سا بین الاقوامی قانون ہے جو اس قسم کی جنگ کو ناجائز قرار دے سکتا ہے اس قسم کی جنگیں قیام امن کے لیے ضروری ہیں۔ اگر یہ جنگیں نہ لڑی جائیں تو دنیا سے امن ہی اٹھ جائے جن قبائل نے معاہدات کی خلاف ورزی نہیں کی ان کو اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ 4:9) مگر جب مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی عہد شکنی نہیں کی نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کی وجہ صرف عہد شکنی ہے نہ کہ کفر اور شرک۔ اگر جنگ کی وجہ صرف کفر اور شرک ہوتا تو کسی مشرک کو بھی اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار نہ دیا جاتا۔ پھر اس کے آگے صرف نقض عہد کو وجہ جنگ بیان کرتے ہوئے فرمایا: اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (توبہ 13:9) تم ان لوگوں سے کیوں جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور رسول کے نکالنے کا قصد کیا اور انہوں نے پہلے تمہارے ساتھ ابتداء کی۔

تیسرا داعیہ:

احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری:

اسلام نے نہ صرف ظلم کرنے سے روکا ہے بلکہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ جب دنیا سے ظلم کا قلع قمع نہ کیا جائے تو دنیا میں نہ تو انسانیت کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کا شجر ہرا رہ سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ عَنْ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَاْخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ اَوْشَكَ اَنْ يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِّنْهُ (اخرجه الترمذی) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ ظلم کا سد باب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن مجید نے مظلومین کی حمایت میں جنگ کرنا لازمی قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (سورۃ النساء 4 آیت 75) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اسی بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔

اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور مقدس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسان کو درندگی اور بہیمیت کے چنگل سے نجات دلائیں۔

چوتھا داعیہ (فتنہ سازی اور استعماریت کے خلاف):

اسلام حریت انسانی کا جان فزا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے طاقت ور حکومت کمزور حکومت پر زبردستی قبضہ حاصل کرنے کی مجاز نہیں۔ دنیا کے نقض امن کا سبب یہی طاقتور حکومتیں ہوتی ہیں جو ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے کمزور ملکوں پر چڑھائی کر دیتی ہیں اور زمین کو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگ دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کی فتنہ سازی اور استعماریت کے خلاف جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ: ۱۹۳) تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں پر دست درازی سے رک جاؤ۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج 40:22) اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیوں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جائیں۔

اس آیت میں اسلامی جنگوں کا مقصد زمین سے فساد کی بیخ کنی اور امن کا قیام بیان کیا ہے۔

اگر دنیا کی تمام حکومتیں اسلام کے اس سنہری اصول پر عمل کر کے باغی اور استعمار پسند حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں تو امن و سلامتی تمام دنیا کو اپنے دامن میں لے لے گی۔

قواعد جنگ:

اسلام نے اصولی طور پر جنگ کے قواعد قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں۔ پہلا قاعدہ قتل ہے دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ جب فوج یا اس کا ایک حصہ محاصرہ میں آ جائے اور ہتھیار ڈال دے تو ان کو قید کر لینا چاہیے۔ تیسرا قاعدہ یہ بیان کیا ہے کہ جنگ کے زمانہ میں دشمن ملک کے آدمیوں کو اپنے ملک میں آنے سے روکنا چاہیے کیونکہ بے شمار فوجی راز ہوتے ہیں جن کے انکشاف سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ان تین قواعد کو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ پس تم مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں بھی تم ان کو پاؤ۔ یہاں ان مشرکین کا ذکر ہے جو برسر پیکار ہوں اور میدان جنگ میں اترے ہوئے ہوں۔ معاہد مشرکین اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والے مشرکین اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔ یعنی دشمن کے لیے گھات میں بیٹھے رہو ان الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کے موقع پر ان تمام راستوں کو بند کر دینا چاہیے اور پہرے بٹھا دینے چاہئیں جہاں سے دشمن ملک کے اندر آ سکتا ہو۔ اس طرح دشمن کی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے تمام اہم جگہوں پر فوج متعین کر دینی چاہیے۔ اگر وہاں سے دشمن فوج کے آگے بڑھے تو اس پر حملہ کر دیا جائے۔

صلح:

اسلام صلح کی جنگ پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو فوراً صلح کا ہاتھ بڑھا دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانفال 8: 61) اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو درحقیقت وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسلامی جنگوں کی اخلاقی قدریں:

اگر دنیا کی مہذب سے مہذب قوم کی جنگوں کے حالات پڑھیں تو وہاں بھی بربریت و بہیمیت ظلم وستم، غصب ونہب کے خونچکاں واقعات نظر سے گزریں گے۔ جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک دین رحمت ہے۔ جس کی رحمت کے سائے زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہر قوم کی زندگی میں لڑائی ناگزیر ہے۔ اسلام نے لڑائی کے لیے بھی ضابطہ اخلاق مقرر کر دیا ہے۔

جیسا کہ بحث گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی جنگیں مدافعت، حفاظت خود اختیاری مذہبی آزادی حمایت مظلومین اور استعماریت اور فتنہ کی بیخ کنی کے لیے لڑی گئی تھیں یہ جنگیں بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت تھیں اور وہ اخلاقی قوانین کے تابع لڑی گئی تھیں اگر کوئی مجاہد اخلاقی قیود کو توڑتا تو وہ قابل مواخذہ ہوتا تھا۔

اسلام میں جنگ کے متعلق احکام

جنگ کے اسلامی احکام بیان کرنے سے قبل اہل عرب کے تصور جنگ اور وحشت کاریوں کا ذکر کرنا ضروری ہے تا کہ قاری اسلامی جنگوں کی برکت اور رحمت آسانی سے سمجھ سکے۔ عربوں کا تصور جنگ ان مجموعہ الفاظ سے بخوبی واضح ہوتا جاتا ہے جو ان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے جس کا ذکر مستشرقین کے اعتراض کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جنگ غصب ونہب تباہی و بربادی غارت گری کا دوسرا نام ہے کبھی انہوں نے لڑائی نیک مقصد کے لیے نہیں لڑی۔ ان کا مقصد لوٹ مار جذبہ تفاخر کا اظہار، جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنا ہوتا تھا۔ جب عربوں کا تصور جنگ اور مقصد اتنا گھٹیا قسم کا تھا تو ان کی جنگوں میں انسانیت کی مٹی کیوں نہ پلید ہوتی ہوگی۔ ذیل میں عربوں کی جنگ کے وحشیانہ طریقے اور انسانیت سوز افعال کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ اسلام کا نظریہ جہاد نکھر کر قاری کے سامنے آجائے اور معلوم ہو جائے کہ اسلامی مسلح جہاد بنی نوع انسان کے لیے کون سا رحمت کا پیغام لایا ہے اور اسلام نے طریقہ جنگ میں کیا کیا اصلاحات کی ہیں۔

جنگ کے انسانیت سوز طریقے:

1۔ عرب دشمن کے لیے قسی القلب تھے۔ وہ دشمن کو زندہ آگ میں پھینک دینے میں تامل نہ کرتے تھے۔ عرب کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب منذر بن امراء القیس نے جنگ میں بنی شیبان پر فتح حاصل کر لی تو ان کی مستورات کو زندہ آگ میں پھینک دیا۔

عمرو بن ہند کے بھائی نے بنو تمیم پر حملہ کر دیا سو وہ لوگ بھاگ گئے۔ صرف ایک عورت باقی بچی اس کو گرفتار کر کے آگ کے آلاؤ میں پھینک دیا، دور سے عمار نامی شخص نے آگ کا دھواں دیکھا۔ اس طرف کا رخ کیا شائد کھانے کو مل جائے، عمرو نے آنے کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیا۔ میں کئی دن سے بھوکا تھا۔ دھوئیں کو دیکھ کر آیا ہوں شائد کھانا مل جائے۔ اس سنگ دل عمرو نے حکم دیا کہ اس کو بھی آگ میں پھینک دیا جائے، چنانچہ اس کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

2۔ حملہ آور قبیلہ جب مغلوب قبیلہ کے مرد اور عورتیں اور بچے پنجہ اسیری میں لے لیتا تو ان سے ہر قسم کا ناروا سلوک کرتا۔ قتل کرائے جاتے، آگ کے آلاؤ میں پھینک دیے جاتے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے گرا کر آتش غضب کو بجھایا جاتا۔ منذر بن

امرؤالقیس نے بنی شیبان کے جتنے قیدی پکڑے ان سب کو پہاڑ کی چوٹی پر قتل کر دیا۔
احادیث میں عکل اور عرینہ کا واقعہ مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول کریم ﷺ کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں، انھیں تپتی ہوئی ریت پر پھینک دیا یہاں تک وہ تکلیف اور پیاس سے مر گئے۔
امراء القیس کے باپ حجر بن حارث نے بنی اسد پر حملہ کیا اور ان کے جتنے آدمی پنجہ اسیری میں آئے ان سب کو ڈنڈوں کی ضربات سے مار دیا۔

3۔ عرب اپنے جوش غضب کو معصوم بچوں کے خون سے ٹھنڈا کرنے سے نہیں چوکتے تھے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنوذبیان کے پاس اپنے بچے بطور ضمانت رکھے تھے۔ حذیفہ رئیس ذبیان ان بچوں کو ایک وادی میں لے جاتا، ان کو تیروں کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کے قبیلہ کے لوگ اس انسانیت سوز نظارے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

4۔ عرب لوگ اتنے بے رحم اور سنگ دل تھے کہ جب اپنے حریف کو مار دینے سے بھی ان کی آتش غضب ٹھنڈی نہ ہوتی تو وہ لاشوں کا مثلہ کرتے، پھڑکتے ہوئے اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے، چنانچہ جنگ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی لاش کا مثلہ کیا پھر ان کا کلیجہ چبا کر اپنی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔

5۔ عربوں کا کینہ اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اپنے دشمن کے متعلق منت مانتے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ جنگ احد میں عاصمؓ بن ثابت نے مسافع بن طلحہ اور حلاس بن طلحہ کو قتل کیا۔ ان کی والدہ سلافہ نے قسم کھائی کہ وہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پیے گی۔

6۔ عربوں کا دائرہ ظلم صرف مقاتلین تک ہی محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ظلم وستم کے آہنی پنجہ سے غیر مقاتلین بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ معصوم بچوں کے خون سے زمین رنگ دی جاتی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر دیا جاتا۔ بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کر دیا جاتا۔

7۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دشمن پر غفلت کی حالت میں حملہ کرتے تھے تاکہ وہ آسانی سے قابو پا سکیں اور ان کے خون سے آتش انتقام کو ٹھنڈا کر سکیں۔ عربوں کی اصطلاح میں غفلت میں حملہ کرنے کو فتک اور حملہ کرنے والے کو فاتک کہتے ہیں۔ تابط شر، سلیک اور حارثہ بن ظالم مشہور فاتک گزرے ہیں۔

8۔ اپنے ذاتی اغراض کے سامنے معاہدات کو کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔ جب بھی انتقام لینے کا موقع پاتے تو تمام معاہدات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے اور حملہ کر دیتے۔ بدعہدی کی مثالیں رسول کریم ﷺ کے عہد میں کثرت سے ملتی ہیں۔ آپؐ نے یہود سے معاہدات کیے، انہوں نے ہر بار معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے مل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش سے معاہدہ کیا انہوں نے اس کا کوئی پاس اور لحاظ نہ کیا۔ مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف بنوبکر کی مدد کی۔

اسلام کی جنگی اصلاحات:

رسول کریم ﷺ نے جو دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے جنگ کی ان تمام قبیح اور انسانیت سوز رسومات کو پاؤں تلے روند دیا اور ایک جنگی ضابطہ اخلاق دیا۔

پہلی اصلاح:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے عرب کی جنگ کا مقصد ہی غصب ونہب، قتل وغارت تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے مقصد جنگ کی تطہیر کی۔ اسلام نے مسلمانوں کے سامنے جنگ کا مقصد یہ پیش کیا کہ خدا پرستی کو فروغ ہو اور مظلوم کی دست گیری ہو۔ انسانیت کا احترام قائم ہو۔ فتنہ کی بیخ کنی ہو۔ جارحیت ختم ہو۔ اب جب ایک مجاہد ان مقاصد کو سامنے رکھ کر میدان جنگ میں جائے گا تو لازمی طور پر وہ ان تمام افعال سے اجتناب کرے گا جو انسانیت سوز اور موجب فساد ہیں۔

دوسری اصلاح:

رسول کریم ﷺ نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔ ابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ انْطَلِقُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَ لَا طِفْلًا صَغِيْرًا وَ لَا اِمْرَأَةً وَ لَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوْا غَنَائِمَكُمْ وَاَصْلِحُوْا وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ کہ رسول کریم ﷺ نے فوج کو روانہ کرتے وقت فرمایا اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد سے اور اللہ کے رسولؐ کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔ کسی بوڑھے ضعیف چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ مال غنیمت میں سے چوری نہ کرنا۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے ایک جگہ جمع کرنا۔ صلح کی روش اختیار کرنا احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسلم بخاری اور ترمذی میں عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے ایک دفعہ جنگ میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی دیکھی تو آپؐ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابوایوب فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں مقابلہ میں اجیروں اور غلاموں اور لونڈیوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (مسند احمد)

اسی طرح ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: لَا تَغْدِرُوْا وَ لَاتَغُلُّوْا وَ لَا تُمَثِّلُوْا وَ لَا تَقْتُلُوا الْوِلْدَانَ وَلَا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ (مسند احمد) یعنی بدعہدی نہ کرو۔ مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو، بچوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرو۔

اسلام نے جنگ میں مقاتلین کے متعلق ذیل کی نصیحتیں فرمائیں:

1۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے (فتوح البلدان للبلاذری صفحہ 47)

2۔ رسول کریم ﷺ نے آگ کا عذاب دینے سے منع فرمایا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: لَا يَنْبَغِیْ اَنْ يُعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا صَاحِبُ النَّارِ یعنی آگ کا عذاب دینا صرف خدا کا حق ہے۔

3۔ آپ نے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید سے منع فرمایا۔ عبداللہؓ بن یزید انصاری کی روایت ہے: نَهَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنِ النُّهْبٰى وَالْمُثْلَةِ یعنی رسول کریم ﷺ نے لوٹ مار اور مثلہ (اعضاء کی قطع و برید) سے منع فرمایا۔

اسلام نے صرف ہم مثل سزا دینے کی اجازت دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔ (النحل 126:16)

اگر تم بدلہ لو تو صرف اتنا ہی لو جس قدر تم پر زیادتی ہو چکی ہے لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ بات صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

4۔ قتل میں احتیاط برتنے سے متعلق ارشاد فرمایا: اعف الناس قتلة اهل الايمان (ابو داؤد) یعنی اہل ایمان قتل کرنے میں تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

5۔ باندھ کر قتل کرنا منع ہے۔ ابوایوب انصاری نے فرمایا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَنْهٰى عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ (ابو داؤد) یعنی میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے سنا کہ آپ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا۔

6۔ رسول کریم ﷺ نے کفار کے مقتولین کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کروایا۔ علامہ ابویعلی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں لکھا ہے کہ لشکر کے رئیس پر یہ فرض ہے کہ وہ کفار کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کرے۔

تیسری اصلاح:

رسول کریم ﷺ غفلت یا نیند کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَرَجَ اِلٰى خَيْبَرِ فَجَآءَ هَا لَيْلاً وَ كَانَ اِذَا جَآءَ قَوْمًا بِلَيْلٍ وَ لَا يُغِيْرُ عَلَيْهِمْ حَتّٰى يُصْبِحَ (صحيحين) رسول کریم ﷺ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی۔ آپ رات کے وقت وہاں پہنچے اور آپ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی محارب قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو آپ حملہ نہ کرتے۔ جب تک صبح نہ ہو جاتی۔

لیکن اگر دشمن قوم کے ساتھ جنگ جاری ہے تو ایسی صورت میں رات کے وقت حملہ کرنا جائز ہے۔

چوتھی اصلاح:

رسول کریم ﷺ نے لوٹ مار کی ممانعت فرمائی ہے۔ عبداللہ بن زید انصاری سے روایت ہے: نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّهبٰى وَالْمُثْلَةَ (بخاری) کہ رسول کریم ﷺ نے لوٹ مار اور مثلہ سے منع فرمایا۔

عاصم بن کلیب اپنے باپ سے اور وہ ایک انصاری سے روایت کرتے ہیں:

خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِىْ سَفَرٍ فَاَصَابَ حَاجَةٌ شَدِيْدَةٌ وَجَهْد فَاَصَابُوْا غَنَمًا فَانْتَهَبُوْهَا فَاِنَّ قُدُوْرَنَا لَتَغْلِىْ اِذْ جَآءَ نَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَمْشِىْ فَاَكْفَاءَ الْقُدُوْرَ بِقَوْسِهٖ ثُمَّ جَعَلَ يُرَمِّلُ اللَّحْمَ بِالتُّرَابِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ النهبة لَيْسَتْ باحل مِنَ الْمَيْتَةِ (ابوداؤد)

ہم ایک سفر میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ نکلے اس سفر میں خوراک کی قلت کی وجہ سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ لوگوں کو بکریاں مل گئیں اور انھوں نے لوٹ لیں اور ذبح کر لیں اور ہماری ہانڈیاں پک رہی تھیں رسول کریم ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ نے اپنی کمان سے ہانڈیاں الٹ دیں اور گوشت کو مٹی سے آلودہ کر دیا اور فرمایا لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

پانچویں اصلاح:

اسلام نے تباہ کاری اور فساد برپا کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (قصص 83:28) ہم آخرت کا گھر جنت میں ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں نیک انجام متقیوں کے لیے ہے۔ حضرت ثوبان سے روایت ہے: اِنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ قَتَلَ صَغِيْرًا وَّ كَبِيْرًا اَوْ اَحْرَقَ نَخْلاً اَوْقَطَعَ

شَجَرَةً مُثْمِرَةً اَوْ ذَبَحَ شَاةً لَا هَا بِهَا لَمْ يَرْجِعْ كَفَافًا (مسند احمد) یعنی انہوں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے سنا جو شخص کسی چھوٹے بچے کو یا معمر آدمی کو قتل کرے گا یا کھجوروں کے درخت جلائے گا، یا پھل دار درختوں کو کاٹے گا یا بکری کو محض اس کی کھال حاصل کرنے کے لیے ذبح کرے گا تو وہ جہاد کے ثواب سے تہی دست لوٹے گا۔

جنگ کی نوعیت اور مصلحت اور ضرورت کی بناء پر درخت وغیرہ کاٹنے کی اجازت ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے بنو نضیر کی کھجوریں کٹوا دیں۔ اور انہیں جلا دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی: مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ کھجور کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا ہے اور جو کچھ چھوڑا ہے سب اللہ ہی کے حکم سے ہے۔

چھٹی اصلاح:

اسلام نے مال غنیمت میں سے خیانت کی شدید ممانعت کی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ يَغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران 37:161) جو کوئی مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہوگا وہ جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا۔

اس آیت کی تشریح میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: لَا تَغُلُّوْا فَاِنَّ الْغُلُوْلَ نَارٌ وَ عَارٌ عَلٰى اَصْحَابِهٖ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (احمد) یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو کیونکہ خیانت دنیا کے اندر اور آخرت میں بھی مرتکبین کے لیے عذاب اور شرمندگی کا باعث ہے۔

موطا امام مالک اور ابوداؤد میں حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا جس نے مال غنیمت میں چوری کی تھی۔

ساتویں اصلاح:

رسول کریم ﷺ نے سفراء اور قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا، چنانچہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: اَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا اِنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ ضَرَبْتُ اَعْنَاقَكُمَا (ابو داؤد۔ احمد) اللہ کی قسم اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔

آٹھویں اصلاح:

رسول کریم ﷺ نے سپاہیوں کو ہر قسم کی بدنظمی اور سرکشی کی ممانعت فرمائی، عربوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی قبیلہ پر حملہ کے لیے نکلتے تو جس منزل پر پڑاؤ ڈالتے یا جس راستہ پر سے گزرتے وہاں کے لوگ مصیبت میں پڑ جاتے۔ ایک دفعہ آپؐ کے پاس اس قسم کی سرکشی کی شکایت آئی تو آپؐ نے فرمایا: مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا اَوْ قَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهٗ یعنی جو کوئی راستے کے لوگوں کو تنگ کرے یا راستے میں لوٹ مار کرے اس کا کوئی جہاد نہیں۔

نویں اصلاح:

رسول کریم ﷺ نے معاہدات کو صرف دنیاوی منفعت کے لیے توڑ دینے سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ بدعہدی قیام امن کے راستے میں ایک مضبوط دیوار ہے۔ جب تک یہ دیوار کھڑی ہے اس وقت تک امن نہیں ہوسکتا۔ رسول کریم ﷺ نے سب سے پہلے قیام امن

کے لیے اس دیوار کو پیوند خاک کیا اور عہد کی پابندی پر زور دیا۔ آپ نے فرمایا: مَنْ قَتَلَ مَعَا هَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مِيسرةِ اَرْبَعِيْنَ عَامًا۔ یعنی جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا وہ جنت کی بو تک نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

عمرو بن عتبہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يحلن عُقْدَةً حَتَّى يَنْقَضِي اَمْرُهَا اَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ (ابو داؤد۔ ترمذی) کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے سنا جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس وقت تک معاہدے کا بند نہ کھولے جب تک اس کی مدت نہ پوری ہو جائے یا وہ برابری کا لحاظ کر کے اس قوم کی طرف پھینک دے۔ ینبذ الیهم علی سواء۔ یعنی برابری کو ملحوظ رکھ کر معاہدہ کو اس قوم کی طرف پھینک دے کا مطلب یہ ہے کہ معاہد قوم کو صاف طور پر اطلاع دے دی جائے کہ ان کے معاندانہ رویہ اور امن سوز حرکات کی وجہ سے معاہدہ کو فسخ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ٥ (الانفال) اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کی طرف پھینک دے۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ فَقِيْلَ هٰذَا غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ (رواہ مسلم) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین اور آخرین کو جمع کرے گا تو ہر عہد شکنی کے لیے ایک نشان بلند ہوگا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی کا نشان ہے۔

رسول کریم ﷺ نے امیر لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: لَا تَغْلُوا وَ لَا تَغْدُرُوا وَ لَا تَمَثِّلُوا وَ لَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَلَا اِمْرَاةً (مؤطا امام مالک) مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرنا بدعہدی نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

رسول کریم ﷺ کا عمل یہ بتاتا ہے کہ آپؐ نے معاہدات کی پوری طرح حفاظت کی، صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے۔ ابو جندل معاہدہ ہو چکنے کے بعد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس کو پنجہ ظلم سے نجات دلائیں۔ آپ نے دنیا کو معاہدہ کی حفاظت کرنے کا سبق دینے کے لیے ابو جندلؓ کو فرمایا ''اے ابو جندلؓ صبر کر۔'' ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔

دسویں اصلاح اسیروں سے حسن سلوک:

اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے رحمت اور سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس نے زمانہ جاہلیت کی ان تمام مکروہ رسومات کو کچل کر رکھ دیا تھا جس سے حرمت انسانیت مجروح ہوتی تھی۔ زمانہء جاہلیت کی مکروہ رسومات میں سے ایک گھناؤنی رسم اسیران جنگ سے انسانیت سوز سلوک تھا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلام نے اسیران جنگ کو مستقل طور پر پنجہ اسیری میں جکڑے رکھنے سے منع فرمایا بلکہ یہ تعلیم دی کہ یا ان کو احسان کے طور پر یا ان سے فدیہ لے کر رہا کر دو اور جب تک وہ قبضہ میں ہوں ان سے نیک سلوک کیا جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد 4:47) پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو پہلے گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ۔ پھر قید کے بندھن مضبوط کرو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے یا تو احسان کے

طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

دوسری جگہ آتا ہے: يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا۔ (سورۃ دھر 76:8-10) مسلمان اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتامیٰ اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تو تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔

جنگ بدر میں جو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کے ساتھ نہایت ہی نیک سلوک روا رکھا گیا۔ اس حسن سلوک کی وجہ سے بہت سے قیدی اسلام کے حلقہ اسیری میں داخل ہو گئے۔ ایک قیدی بیان کرتا ہے کہ وہ جس گھر میں قید تھا گھر والے اس کو تو اچھا کھانا کھلاتے تھے لیکن خود کھجور وغیرہ کھا لیتے تھے۔ بعض بدری قیدیوں کو فدیہ دے کر آزاد کر دیا گیا، بعض ناداروں کو بلا فدیہ رہا کر دیا گیا اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کو دس دس بچوں کو تعلیم دینے کی شرط پر چھوڑ دیا گیا۔ جنگ مریسیع میں بنی مصطلق کے ایک سو خاندان پکڑے گئے۔ ان سب کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا گیا۔ غزوہ حنین میں قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار قیدی بطور احسان آزاد کر دیے گئے۔ جبال تنعیم میں مکہ کے اسی آدمیوں نے اسلامی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ جب آپؐ کی خدمت میں ان کو پیش کیا گیا تو آپ نے از راہ احسان سب کو رہا کر دیا۔

اگر مستشرقین اعتراض کرنے سے قبل نیک نیتی سے لغت کا مطالعہ کر لیتے اور قرآن مجید کے ان محکم اصولوں پر نظر ڈال لیتے جو اشاعت اسلام سے متعلق ہیں تو وہ یقیناً اعتراض نہ کرتے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ: 2:256) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں کیونکہ ہدایت کی راہ گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول کریم ﷺ کی مکی زندگی تو مصائب و آلام سے پُر تھی۔ مسلمان کھلے بندوں عبادت تک نہیں کر سکتے تھے۔ مدنی زندگی اقتدار کی زندگی تھی اس زندگی میں ایک مثال نہیں ملتی جس کا سہارا لے کر معترضین اپنی دلیل ٹھہرا سکیں۔ مدینہ پر کفار نے بار بار حملے کیے، ہر جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ دشمنوں کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، آپؐ نے فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر رہا کر دیا، ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپ نے کسی قیدی کو جبر و اکراہ کے ساتھ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہو۔

مشرکین کے ساتھ معاہدے کیے۔ باوجود قوت حاصل کر لینے کے اسلام نے ان مشرکین سے جنگ کرنے کی ممانعت کر دی جو اپنے معاہدوں پر کاربند تھے۔ اگر اسلام جبر کا حامی ہوتا تو قوت اور طاقت ملنے کے ساتھ ہی تمام مشرکین کو جنگ کر کے دائرہ اسلام میں داخل کر لیا جاتا۔ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ رسول کریم ﷺ کی وفات تک عرب میں ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی جو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ کفار کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسلام دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل 16:125) اے نبیؐ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے احسن طریقہ پر مجادلہ کرو۔ یہ آیت معترضین کے اعتراض پر کاری ضرب ہے اور واضح کرتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔

اسلام جہاں بغیر کسی وجہ کے دوسروں کے علاقوں کو زیر کرنا بنظرِ استحسان نہیں دیکھتا وہاں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ اگر غیر ممالک پر چڑھائی فساد اور بگاڑ کا موجب ہے تو سرحدوں کو کھلا چھوڑ دینا بھی موجب فساد ہے۔ اس وجہ سے تمام امن کے لیے اسلام نے سرحدوں کو مضبوط رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ اور رسول کریم ﷺ نے مدافعانہ لڑائیاں لڑیں۔

الزامی جواب:

جہاد کی بحث میں صرف عرب کے وحشیانہ حربی اور انسانیت سوز طریقے بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب اختصار کے ساتھ معترضین کے مذاہب کی جنگی وحشیانہ تعلیم بیان کی جاتی ہے۔

ہندوؤں کے جنگی احکامات:

''اے بہادر اِندران دنوں داس اور آریہ دشمنوں کو مار جیسے بن کو تیز کلہاڑے سے کاٹتے ہیں۔'' (بھیہ رگ وید 6۔33۔3)

''اے بہتوں سے تعریف کیے ہوئے جو آریہ یا داس ہمیں جنگ میں للکارتا ہے ہم سے وہ اچھی طرح دبائے جائیں تیری مدد سے ہم ان دشمنوں کو جنگ میں ماریں۔ (رگ وید 4:38:10)

''اے بہادروں کے مالک ان دشمنوں آریوں اور داسوں کو ماریں۔'' (رگ وید 6:6:6)

''اے اندر اور وُرن تم نے داس اور آریہ کو مارا اور رسُد اس کو بچایا۔'' (رگ وید 1:83:7)

''اے اندر تُو نے سرجوندی کے پار اُرنا چتر تھ دو آریوں کو فوراً مار ڈالا۔'' (رگ وید 8:3:4)

''ان کو زندہ آگ میں جلا دو۔'' (یجر وید ادھیاء 13 منتر 12)

''دشمنوں کے کھیتوں کو اُجاڑ کر گاؤں جلا دو۔'' (یجر وید 13:3)

ان کو درندوں سے ٹکڑے کرا دو۔'' (یجر وید 15،15،7)

''زہریلی ہواؤں سے ہلاک کر دو۔'' (یجر وید 15،16)

''درندوں سے چروا دو۔'' (یجر وید 19:15)

''ان کو ایسے تڑپا تڑپا کر مارو جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔'' (یجر وید 65:16)

''ان کی بستیوں کو آگ لگا دو۔'' (یجر وید 23:11)

''ان کی گردنیں کاٹ دو۔'' (یجر وید 62:5)

''ان کو تا عمر زنجیروں میں باندھ رکھو۔'' (یجر وید 25:1)

''جائز و ناجائز طریقوں سے ہلاک کر دو۔'' (یجر وید 28:1)

''ان کا قتل عام کر دو۔'' (یجر وید 4:17)

''ان کو درختوں کی طرح کاٹ ڈالو۔'' (یجر وید 51:16)

''بینڈ باجہ اور جوش آور گیتوں سے فوج کو جوش دلاؤ۔'' (یجر وید 35:16)

''توپ، بندوق، تیر و کمان سے فوج کو لیس کرو۔'' (یجر وید 36:16)

''مست سانڈ کی طرح دشمنوں کا مارتے جاؤ۔'' (یجر وید 22:17)

''ان کو آگ کے دلوں میں لپیٹ دو۔'' (یجروید 77:11)

''دشمنوں سے ہمیشہ لڑتے اور ان کو دکھ دیتے رہو۔'' (یجروید 44:17)

''ان کی بیخ کنی کر کے ان کا ملک چھین لو۔'' (یجروید 38:17)

''ان کو پاؤں کے نیچے کچلنا اور ان پر رحم نہ کرنا۔'' (یجروید 39:17)

نوٹ: (یجروید کی تعلیم کا خلاصہ سوامی دیانند کے الفاظ میں درج کیا گیا)

اتھروید کی تعلیم کے چند نمونے:

''اے ویدک دھرمی راجاؤ اور دوسرے ویدک دھرمیو! تم شیر جیسے بن کر رعیتوں کو کھا جاؤ، چیتے جیسے بن کر اپنے دشمنوں کو باندھ کر پکڑ لو۔ اس کے بعد اپنی مخالفت کرنے والوں کے کھانے تک اٹھا لو۔'' (اتھروید کانڈ 4 سوکت 22 منتر)

''اے دبھ تو ہمارے دشمنوں کے دلوں کو توڑ دے جیسے تو اگتے وقت زمین کی کھال کو چیرتی ہوئی اوپر کو نکل آتی ہے۔ ویسے ہی ان ہمارے دشمنوں کے سروں کو چیر کر اوپر کو نکل کر ان کو گرا کر تباہ کر دے۔'' (اتھروید کانڈ 19 سوکت 28 منتر 10:4)

''اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو چبھ اور میرے دوسرے ہر قسم کے مخالفین کو بھی چبھ جا۔ اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو تباہ کر۔ اور ہمارے مخالفین کو بھی تباہ و برباد کر وغیرہ وغیرہ۔ (اتھروید کانڈ سوکت 39 منتر 1 تا 9)

یہ ہے ویدوں کی تعلیم، ہندو سب سے زیادہ مسلمانوں کی دفاعی جنگوں پر معترض ہیں۔ وہ ویدوں کی تعلیم پر غور کر لیں کہ ان کے وید کس طرح اپنے مخالفین کو تباہ و برباد کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے بالمقابل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملے پر جو آپؐ نے فتح مکہ کے وقت اپنے دشمنوں سے کہا تھا غور کریں۔ وہ دشمن جنہوں نے صحابہ کو قتل کیا جنہوں نے ان کی جائیدادیں چھینیں۔ جنہوں نے ان کے گھروں سے بے دخل کیا۔ حتیٰ کہ خود آپؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور قتل کرنے کے لیے گھر کا محاصرہ کر لیا، بے سروسامانی میں آپؐ کو اپنے رفیق حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ مدینہ میں بھی امن کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں دیا۔ جنگوں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ آخر کار آپؐ کے سامنے گردن جھکائے کھڑے ہیں تو مجسم رحمۃ للعالمین ﷺ فرماتے ہیں:

''لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ'' (آج تم پر کوئی گرفت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو)۔

غزوہ حنین کا مطالعہ کیجئے۔ بنو ثقیف کے وفد کی درخواست پر چھ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے۔

یہودی مذہب کے جنگی احکام:

''جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔ (استثناء 16:13:20)

''سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہو جان سے مارو لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔ (گنتی باب 31:16-17)

''تب انہوں نے 12000 مرد بہادر روانہ کیے اور انہیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو۔'' (قاضیوں کی کتاب 11:12)

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق آتا ہے:

''اور داؤد نے اس سرزمین کو حرم کیا اور عورت مرد کسی کو جیتا نہ چھوڑا اور ان کی بھیڑ بکریاں بیل اور گدھے اور ونٹ لے کر لوٹا۔''
(سموئیل اوّل 9:27)

خداوند نے ساؤل کو حکم دیا:

''سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور سب جو کچھ ان کا ہے یک لخت حرم کر (قتل کر) اور ان پر رحم مت کر۔ بلکہ مرد اور عورت اور ننھے بچے اور شیر خوار، بیل بھیڑ اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر۔'' (سموئیل اول 3:15)

یشوع کے متعلق لکھا ہے:

''اور انہوں نے سب کو جو اس شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان یا بوڑھا کیا بیل کیا بھیڑ اور گدھا سب کو تہ تیغ کیا۔'' (یشوع 21:6)

خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کو حکم ملتا ہے:

''جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے تو تُو انہیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو۔ نہ ان سے بیاہ کرنا، اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا۔ نہ اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی لینا۔ (استثنا 1، 33:7)

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:

''اس نے ربہّ پر چڑھائی کی اور فتح کر لیا اور اس نے ان لوگوں کو جو اس میں تھے باہر نکال کر آروں اور لوہے کی گاہن اور آہنی کلہاڑوں سے روندا اور اینٹوں کے جلتے پزاووں میں سے گزارا اور اس نے بنی عمون کے تمام شہروں سے یہی کیا۔'' (سموئیل دوم 31:12)

''مناخم نے تمام حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے۔'' (سلاطین دوم 16:15)

یہ ہے یہود کی تعلیم کا نمونہ جس میں دشمنوں کے لیے بربادی ہی بربادی ہے۔ رحم اور محبت کی رمق کہیں نظر نہیں آتی اور اعتراض ان جنگوں پر اٹھاتے ہیں جو محض دفاعی تھیں۔ اور جن کا مقصد صرف امن کا قیام تھا اور ایک فرد بھی تلوار کی نوک سے دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ اور یہ اعتراض ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور جہاد کا مطلب ہے کہ کافروں کو بزور شمشیر اسلام داخل کیا جائے۔

مسیحی تعلیم:

عیسائی مشنری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بردباری اور تحمل کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ بے شک محبت، رحم، بردباری اور شفقت اعلیٰ اخلاق ہیں لیکن محل اور موقع پر۔ اگر یہی اخلاق عین جنگ کے دوران دکھلائیں گے تو یہی اخلاق تباہی و بربادی کا باعث بن جائیں گے اور بزدلی کی شکل اختیار کر جائیں گے اور دشمن بردباری اور محبت کا سبق دینے والی قوم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ ملک میں بجائے امن و سلامتی کے فساد برپا ہو جائے گا۔ یہ اخلاق اسی وقت حمیدہ ہیں جب ان کو موقع و محل پر حکمت کے ساتھ برتا جائے۔ آیئے ذرا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کا جائزہ گہرائی میں جا کر لیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا ادبی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے کلام میں عمدہ استعارے اور تشبیہات استعمال کی ہیں۔ ان استعاروں اور تشبیہات کو بھی گہرائی میں جا کر دیکھنا ہو گا۔

متی 8 باب 32 میں آتا ہے ''سوروں کے غول کو مسیح نے ہلاک کیا۔ اب دیکھنا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے سور کو اپنے کلام میں کس رنگ میں بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول متی 7 باب 6 میں درج ہے ''جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے مت پھینکو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام آدمیوں کو کتا اور سور کہہ رہے ہیں۔ اب اس استعارہ کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السلام کا سوروں کے غول کو ہلاک کرنے سے مراد انسانوں کا ہلاک کرنا ہے۔

متی 24 باب 30 میں حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''جب میں آؤں گا دنیا کی ساری قومیں چھاتی پیٹیں گی۔''

متی 16 باب 26 میں فرماتے ہیں: ''کیونکہ ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آوے گا تب ہر ایک کو اس کے کام کے موافق سزا دے گا۔ بعض ابھی موت کا مزہ چکھیں گے۔''

انجیل کی یہ آیات مسیح کی حربی اور جلالی شان کو واضح کر رہی ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو فرشتوں کے جلو میں آکر تباہ و برباد کر دے گا اور اس وقت دنیا کی ساری قومیں چھاتی پیٹ کر رہ جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم اس وقت تک محبت، پیار، رحم، تحمل و بردباری کی تھی جب تک وہ کمزور اور ضعیف تھے۔ جب طاقت پکڑلیں گے تو ان کی بربادی کے سامنے قومیں چھاتی پیٹیں گی۔

❁......❁......❁

قرآن مجید میں خدا کا غیر اللہ کی قسم کھانے پر اعتراض

اعتراض:

اگر قرآن خدا کا کلام ہوتا تو خدا اس قسم کی قسم نہ کھاتا۔ (اعتراض 130)

"قسم کھانا جھوٹوں کا کام ہوتا ہے خدا کا نہیں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جھوٹا ہی قسم کھایا کرتا ہے نہ کہ سچا" (چودھواں باب) اعتراض 100۔

اللہ تعالیٰ نے کئی سورتوں میں غیر اللہ کی قسمیں کھائی ہیں۔ حالانکہ وہ آپ ہی فرماتا ہے کہ بجز اس کے کسی دوسرے کی قسم نہ کھائی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پڑی ہے جو اپنی پیدا کردہ اشیاء کی قسم کھاتا۔

یہ اعتراض ہر معترض (ہندو، عیسائی وغیرہ) نے مختلف انداز اور مختلف الفاظ میں کیا ہے۔

جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کی قسمیں کھائی ہیں غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے افعال کی ہی قسمیں کھا رہا ہے اس کے افعال اس کی صفات کے مظہر ہیں اور اس کی صفات اس کی ذات کی عین ہیں۔

روحانی ربوبیت پر جسمانی ربوبیت کی شہادت:

اللہ تعالیٰ نے جو قسمیں کھائی ہیں ان میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ یہی قسمیں قرآن مجید کی صداقت، فصاحت و بلاغت اور اعجاز پر دال ہیں۔ جو لوگ ان قسموں کی حکمتوں اور قرآن مجید کے انداز بیان سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اپنی ناسمجھی یا تعصب کی بناء پر اعتراض کرنے پر اتر آتے ہیں۔

پہلی حکمت:

اللہ تعالیٰ اپنے افعال بدیہہ کو نظری دقیق اور امور کو سمجھانے کے لیے قسم کھاتا ہے۔ دنیا کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی دو کتب ہیں ایک فعلی کتاب (کائنات) دوسری قولی کتاب (قرآن شریف)۔ قسم میں اللہ تعالیٰ اپنی فعلی کتاب کو قولی کتاب پر شاہد ٹھہراتا ہے۔ اس کے قول اور فعل میں مطابقت طالب حق کے لیے معرفت اور یقین کامل کا موجب ہوتی ہے۔ کیونکہ اقوال کا افعال سے مطابقت میں آجانا اسی امر کی بین شہادت ہے کہ جس کے یہ افعال ہیں اسی کے یہ اقوال ہیں۔ وضاحت کے لیے چند قسموں کی تفسیر بیان کی جاتی ہے تاکہ قاری پر قسموں کی حکمت عیاں ہو جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ٥ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ ٥ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ٥ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ٥ (الطارق 86: 1-4) آسمان گواہ ہے اور رات کو آنے والا اور تجھے کیا خبر ہے کہ رات کو آنے والا کون ہے، چمکتا ہوا ستارہ ہے۔

ان آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ہر ایک نفس کی روحانی حفاظت کے لیے ملائکہ مقرر ہیں جو ہر دم اور ہر آن ساتھ رہتے

ہیں جو حفاظت کا طلبگار رہو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ بیان ایک دقیق معرفت کا نکتہ ہے۔ جب کہ فرشتوں کا وجود خود غیر مرئی ہے۔ پھر ان کی حفاظت پر کیوں کر یقین ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون قدرت کو جو اجرام سماوی میں پایا جاتا ہے اس کو قسم کے انداز میں بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کا قانون قدرت اجرام فلکی میں صاف نظر آتا ہے۔ یہ سب اجرام (کوکب، شمس اور قمر وغیرہ) انسان کی جسمانی ربوبیت میں لگے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے نقصانات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور انسان کی ہر ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ خصوصاً رات کے وقت جو ستارے پیدا ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کو جو ریگستانوں، بیابانوں، جنگلوں اور سمندروں میں سفر کر رہے ہوتے ہیں رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔ راتوں کو چلنے والے کاروانوں کے لوگ ان چمکدار ستاروں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ تاریک رات کے وقت ہر ایک نجم ثاقب (چمکدار ستارہ) راہنمائی کر کے جان کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر یہ محافظ نہ ہوں تو انسان ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہ رہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کوئی ہمارے لیے مطلوبہ حرارت پیدا کر رہا ہے کوئی اناج اور پھل اُگا رہا ہے۔ کوئی پکا رہا ہے کوئی پانی برسا رہا ہے۔ جو ہماری زندگی کے لیے ایک لازمہ ہے۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے ہزارہا اجرام سماوی وغیرہ ہمارے اجسام کی حیات کے لیے پیدا کیے ہیں۔ جو ہر لمحہ انسان کی ربوبیت میں لگے ہوئے ہیں خالق اکبر جو کہ انسانوں کا رب اور پالنہار اور ان کی جملہ ضرورت کے لیے کفیل و مکتفی ذات ہے۔ جس نے انسانوں کی ربوبیت جسمانی کا ایسا حیرت انگیز اور کرم گستر نظام تخلیق فرما رکھا ہے بھلا وہ ہماری روحانی حیات سے غافل رہ سکتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے آسمان اور اجرام فلکی کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی زندگی کے لے یہ اجرام پیدا کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے فرشتے پیدا کیے ہیں جو انسان کو نیکی کی رغبت دیتے رہتے ہیں۔

اجرام فلکی اور کائنات کا ہر کام در پردہ فرشتوں کے فرائض کی ادائیگی کا نتیجہ ہے۔ جس طرح کائنات کا ہر کام در پردہ ملائکہ کے فرائض کی ادائیگی کا ثمرہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ملائکہ میں سے ایک فرشتہ جبرائیل علیہ السلام ہیں جس کا یہ کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اپنے ایک منتخب شخص (نبی) پر نازل کرے۔ اور انسان ان احکام کے مطابق زندگی بسر کرے۔ دراصل ان احکام پر انسان کا عمل کرنا ہی اس کی روحانی زندگی کا باعث ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اجرام فلکی کی شہادت سے انسان کی روحانی ربوبیت کو واضح کیا ہے کہ جس طرح یہ اجرام فلکی انسان کی جسمانی ربوبیت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی ربوبیت کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ گویا روحانی ربوبیت کے مخفی اور دقیق عقدہ کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ظاہری فعل (اجرام فلکی) کی شہادت دی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی حیات کا بندوبست کر رکھا ہے تو لازمی طور پر روحانی حیات کے لیے بھی اس نے کوئی بندوبست کر رکھا ہوگا۔ وہ ملائکہ جو غیر مرئی ہستیاں ہیں انسان کی روحانی حفاظت کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔ ملائکہ کی حفاظت کے مسئلہ کو جو ایک نظری اور مخفی مسئلہ تھا نجوم کے بدیہی کام سے ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ نجوم (اجرام فلکی) کے اثرات سے ہر کوئی واقف اور آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غور کرنے والوں کے آگے اپنے ظاہری انتظام کو رکھ دیا ہے تا کہ عقل سلیم جسمانی انتظام کو دیکھ کر روحانی انتظام کو بھی سمجھ سکے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی پیشگوئی مکی دور میں اور مشرق اور مغرب کے رب کی قسم:

سورہ المعارج میں آتا ہے: فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ٥ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ٥ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ٥ كَلَّا اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ٥ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ

وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ○ (36 تا 40)" مگر انہیں کیا ہوا جو کافر ہیں تیری طرف دوڑے آرہے ہیں دائیں جانب سے اور بائیں سے گروہ در گروہ ہو کر۔ کیا ان میں سے ہر شخص آرزو رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل ہوں گے۔ ہرگز نہیں ہم انہیں اس غرض کے لیے پیدا کیا ہے جو وہ جانتے ہیں۔ سو نہیں میں مشرقوں اور مغرب کے رب کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم اس بات پر قدرت رکھتے ہیں۔"

سورۃ معارج مکی سورت ہے۔ یہ اس زمانہ میں نازل ہوئی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے بسی کی حالت میں تھے۔ چاروں طرف سے مخالفت کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ ہر قسم کے ہتھکنڈوں سے اسلام کی بیخ کنی کی خواہشات ڈیرے ڈالے ہوئی تھیں۔ آپؐ کے صحابہؓ کو ناقابل برداشت اذیتیں دی جارہی تھیں۔ حتیٰ کہ آپؐ نے ان مظالم کو دیکھ کر مظلوم صحابہؓ کو حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا اور صحابہ ہجرت کر کے حبشہ چلے بھی گئے۔ آپؐ کو شعب ابی طالب میں تین سال محصور رہنا پڑا۔ چند سعید روحوں کی مدد سے گھاٹی سے رہائی پائی تو طائف کا اس خیال سے سفر اختیار کیا شاید کوئی حق کی آواز پر کان دھرے۔ وہاں سے بھی پتھروں کی مار سے پنڈلیوں کے زخموں کا تحفہ لے کر واپس آگئے۔ یہ تھے مخالفت کے گھٹا ٹوپ طوفان جن کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ مشارق اور مغارب کا رب یہ خوش خبری دے رہا ہے کہ وہ وقت آرہا ہے۔ جب کہ یہی عدوان اسلام گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ قرآن مجید کے الفاظ مُهْطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ (تیری طرف دوڑے آرہے ہیں دائیں جانب سے اور بائیں سے گروہ در گروہ ہو کر) قابل غور ہیں اور واضح طور پر آئندہ شاندار کامیابی، فتح و نصرت کا نقشہ کھینچا جارہا ہے۔ اسی امر کو دوسری جگہ فرمایا ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ (جب اللہ کی مدد اور فتح آگئی اور تو نے دیکھ لیا لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہوئے۔) اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے کہ صرف زبانی کلامی دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے جنت نعیم کا کوئی وارث نہیں ہو سکتا جب تک اس مقصد کو پورا نہیں کیا جاتا جس مقصد کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا۔ وہ دنیا میں خلافت الٰہیہ کا وارث بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ خلافت الٰہیہ کی وراثت ایمان اور اعمال صالحہ کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایمان اور اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ ہونا پڑے گا۔ ایک تو مستقبل کی کامیابی کا نقشہ بیان کیا جارہا ہے، دوم نو مسلموں کو یہ تعلیم بھی دی جارہی ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے بعثت نبوی کا مقصد پورا نہیں ہوتا جب تک تزکیہ نفس نہیں ہوتا۔

مشارق و مغارب کی ربوبیت سے مراد:

اللہ تعالیٰ نے مشارق اور مغارب کے الفاظ میں قانون قدرت بیان کیا ہے کہ زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہ روشن ہو جاتا ہے اور جو حصہ آفتاب کی طرف سے پشت پھیر لیتا ہے۔ وہ اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔ زمین گھوم رہی ہے۔ ہر آن زمین کا کوئی حصہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور وہ سورج کی ضیاء پاش کرنوں سے روشن ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نیا مشرق بن جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو حصہ سورج سے پیٹھ پھیر لیتا ہے وہاں ایک نیا مغرب پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحیفہ قدرت کی یہ دلیل دے کر واضح کیا ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے جسمانی پرورش اور نشوونما کی تکمیل کے لیے آفتاب پیدا کیا ہے اور زمین کا وہ حصہ جو سورج کے سامنے ہوتا ہے وہ اس کی روشنی سے مستفیض ہو کر منور ہو جاتا ہے۔ ظلمت اور اندھیرے دور ہو جاتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے روحانی ربوبیت کی تکمیل کے لیے آسمانی روشنی یعنی قرآن مجید نازل کیا ہے۔ جو قوم اس کی طرف رجوع کرے گی وہ آسمانی روشنی سے مستفیض ہو کر ترقی

کے راستہ پر گامزن ہو پڑے گی۔ جو اس سے پشت پھیرے گی وہ اندھیروں میں غرق ہو جائے گی۔ وہ گمراہی اور ضلالت کی وادی میں سرگرداں پھرتی رہے گی۔

اس پیشگوئی کا نظارہ فتح مکہ کے بعد دیکھنے میں آیا۔ جب عدوان اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گردنیں جھکائے کھڑے ہیں۔ اور لاتثریب علیکم الیوم کی نوید سن کر اپنے کردہ گناہوں پر نادم ہوتے ہیں اور بغیر جبر و اکراہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ وہ نظارہ ہے جو لفظ مُهْطِعِيْنَ کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے جس کی مزید وضاحت سورۃ النصر میں کی گئی ہے۔

قارئین غور کریں کہ جس موضوع پر معترضین نے اعتراض کیا ہے وہی موضوع اپنے اندر معانی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ معترض کی بصیرت معارف کے ان چمکدار جواہر اور موتیوں پر نہیں پڑتی۔ اس میں قرآن مجید کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ معترضین کی اپنی عدم بصیرت اور اندھا پن اس کی وجہ ہے۔

2۔ قرآن مجید میں قسموں کا ہونا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اور رسول کریم ﷺ کی صداقت پر ایک روشن نشانی ہے۔ عرب میں ایک مثل ہے اِنَّ الْاَیْمَانِ تدع الارض بلاقع قسمیں ملک کو ویران کر دیتی ہیں اور منو کہتا ہے (8۔111) کیونکہ جھوٹی قسم کھانے سے اس لوگ میں اور پرلوگ میں نشٹ ہوتا ہے۔ پنجابی میں مثل ہے کہ جھوٹی قسم تاں پٹ ماردی ہے۔

قارئین ذرا غور کریں کہ قرآن مجید اور صاحب قرآن (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس قدر قسموں کے ساتھ کیسا کامیاب اور فاتح ہوا۔ اور دشمن ناکام و نامراد رہا۔ گویا وہ قسمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی بین دلیل ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جھوٹی قسمیں کھانے والا شخص اپنے مشن میں ناکام و نامراد رہتا۔ لیکن اس کے برعکس قسمیں اس کی ترقی اور کامیابی کا باعث بنیں۔

3۔ ہر زبان میں تاکید کے لیے مختلف قسم کے الفاظ اور کلمات ہوتے ہیں۔ مگر ایشیائی زبانوں میں قسم سے بڑھ کر اور کوئی تاکیدی الفاظ نہیں۔ ایسے ہی عربی کے ادب میں بھی قسم سے زیادہ تاکیدی لفظ نہیں۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اس لیے عربی اسلوب بیان پر ضروری مطالب میں قسموں کا استعمال ضروری تھا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بھی وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو انسان کے لیے۔ لیکن دونوں کے استعمال میں فرق ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لیے وہ لفظ استعمال ہو گا تو اس سے مراد صرف فعل کی آخری غرض ہو گی۔ لیکن جب انسان کے لیے استعمال ہو گا تو غرض میں آلہ اور اسباب بھی شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھنا فعل ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو گا تو اس دیکھنے میں آنکھ، روشنی جو دیکھنے کے دیگر ذرائع اور اسباب ہیں شامل نہ ہوں گے۔ جب یہ فعل انسان کی طرف منسوب ہو گا تو دیکھنے کے فعل میں آنکھ، روشنی، وغیرہ شامل ہوں گے۔ اسی طرح جب قسم کھانے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو گا تو اس سے مراد صرف تاکید اور شہادت بصورت دلیل مراد ہو گی۔

خلاصہ کلام:

قرآن مجید میں یہ ایک سنت الٰہی ہے کہ وہ بعض مخفی اور نظری امور کے اثبات کے لیے صحیفہ قدرت سے ایسے امور حوالہ دیتا ہے جو اپنے خواص کا کھلا اور بین ثبوت رکھتے ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے ہوائیں زمین اپنے اندر واضح خصائص لیے ہوئے ہیں ہر کس و ناکس ان خصائص سے واقف ہے۔ لہٰذا ان بین خصائص کو دلیل کے طور پر خفی اور نہاں در نہاں مطالب کی وضاحت کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

❀......❀......❀

حروف مقطعات پر اعتراض

اعتراض:

قرآن مجید میں بعض سورتیں حروف مقطعات (الٓمٓ، حٰمٓ وغیرہ) سے کیوں شروع کی گئی ہیں۔ ان کے کوئی معانی بھی ہیں۔ مستشرقین کہتے ہیں کہ یہ ان صحابہؓ کے نام ہیں جن صحابہؓ نے وہ سورتیں لکھیں۔

مقطعات کے متعلق مختلف نظریات:

قرآن مجید کی انتیس سورتوں کی ابتداء حروف مقطعات سے ہوئی ہے۔ ان کے معانی بیان کرنے کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حروف اپنے اندر خاص اسرار اور رموز رکھتے ہیں اس لیے ان کے نہ معانی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور نہ ان کو بیان کرنا چاہیے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ حروف مقطعات قرآن کے متشابہات سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے ان پر بحث کرنا ممنوع ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مقطعات کا علم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیا گیا ہے۔ آپؐ نے دوسروں پر حروف مقطعات کے اسرار اور رموز کا اظہار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے دوسروں کو ان حروف کے اسرار کھولنے نہیں چاہئیں۔

مختلف طبقوں کے مذکورہ نظریات کی وجہ سے یہ معترضین کی طرف سے یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ جب ان مقطعات کے معانی اور مفاہیم تک رسائی نہیں ہے تو پھر یہ حروف کیوں بے مقصد لائے گئے ہیں۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ حروف مقطعات پر غور و فکر کر کے ان کے معانی اور مفاہیم تک رسائی کی جا سکتی ہے اور پھر ان کو بیان بھی کرنا چاہیے۔

متذکرہ صدر نظریات پر نقد و جرح:

یہ خیال کہ مقطعات قرآن ایسے اسرار اور رموز ہیں کہ جو فہم میں نہیں آسکتے یا کسی انسان کو ان کے معانی بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ نظریہ قرآن مجید کی روح کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نور، ہدایت، شفا، حق، اور علم قرار دیا ہے۔ اگر حروف مقطعات کے معانی کسی کی سمجھ سے بالا ہیں تو پھر قرآن نہ نور ٹھہرا نہ ہدایت، نہ شفا، نہ حق، نہ علم اور نہ ذکر۔ دوسری بات جو قابل اعتراض ٹھہرتی ہے اگر حروف مقطعات کے معانی پردۂ کتمان ہی میں رہنے ہیں تو پھر ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ، یہ تو خدا کی حکمت کے منافی ہے کہ ایسے حروف وحی کرے جس کے معانی کوئی جان نہیں سکتا۔

دوسرا نظریہ کہ یہ حروف متشابہات میں شامل ہیں اس وجہ سے ان کے معانی بیان کرنا ممنوع ہے۔ یہ نظریہ محکمات اور متشابہات کا فلسفہ نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ دراصل محکمات اور متشابہات آیات بدیہی اور نظری امور کی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ محکم آیات بدیہیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ متشابہ آیات نظری امور سے متعلق۔ بدیہی امور وہ ہوتے ہیں جن کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔

بہت ہی کم عقل و بنیش سے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً اخلاقی اصول، معاشرتی اصول وغیرہ بدیہات میں شامل ہیں۔ نظری امور وہ ہیں جن کے سمجھنے میں فہم و ادراک سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ امور فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔

محکمات اور متشابہات کی تقسیم طبعی ہے، اگر تمام آیات محکم ہوتیں تو انسان کی قوت ذکر و فکر کی تسکین نہ ہوتی۔ کیونکہ محکم آیات میں فکر و تدبر کا سامان ہی نہیں ہے۔ اگر تمام آیات متشابہ ہوتیں تو وہ لوگ جو معمولی فہم و ادراک کے مالک ہیں ان کی دلچسپی اور لذت کے لیے کوئی سامان نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے آدمی کے لیے اپنی پُر حکمت کتاب میں سامان پیدا کر دیا ہے۔ پس حروف مقطعات متشابہات میں شامل ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے اسرار و رموز انسانی عقل کے احاطہ سے باہر ہیں۔ قرآن مجید نے متقیوں کے لیے، کوشش کرنے والوں کے لیے متشابہات کے معانی حل کرنے کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔ اللہ سے ڈرو وہ تمہیں کتاب سکھائے گا۔

تیسرا نظریہ کہ حروف مقطعات کا علم صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیا گیا تھا پھر آپؐ نے اس علم کو اپنی امت کو نہیں پہنچایا۔ یہ منصب نبوت اور تبلیغ ہدایت کے منافی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تیری طرف ہدایت اتاری گئی ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (129:21) رسولؐ کا تو یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھائے گا۔

چوتھا نظریہ کہ قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والا حروف مقطعات کے مانی تک رسائی کر سکتا ہے صحیح ہے۔

حروف مقطعات کے معانی:

مختلف طبقۂ علماء نے حروف مقطعات کے مختلف معانی کیے ہیں۔

1۔ حضرت محی الدین ابن العربی جو صوفیاء کرام کے سرخیل ہیں وہ لکھتے ہیں کہ حروف مقطعات ان فرشتوں کے نام ہیں جو شعبہ ہائے ایمان پر موکل ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق جن سورتوں کے شروع میں یہ حروف درج ہیں ان میں انہیں ایمانی شعبوں کو بیان کرنا مطلوب ہے جن فرشتوں کے نام حروف مقطعات کی صورت میں دیئے گئے ہیں کہ جب پڑھنے والا ان سورتوں کی تلاوت کرنا شروع کرے تو وہ فرشتے اپنا اپنا نام سنتے ہی تیار ہو جائیں اور ان ایمانی شعبوں کے دروازے کھول دیں تا کہ عالم قدس سے تلاوت کرنے والے کے دل پر ایمان کا فیضان ہو۔

2۔ حروف مقطعات قرآن مجید کے نام ہیں۔

3۔ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں رکھے گئے ہیں۔ قدیم عرب میں حروف تہجی پر بعض اشیاء کے نام رکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ بادل کو غین، مچھلی کو نون، پہاڑ کو قاف کہتے تھے۔ سورتوں کا ایسے حروف سے نام رکھنے میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن کریم بھی انہی حروف سے بنا ہوا ہے جن سے تمہارا کلام پھر تم اس کی مثل کیوں نہیں لاتے۔

4۔ یہ حروف قسمیں ہیں جو سورۃ کے مضمون پر اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں۔

5۔ حروف مقطعات کی عددی قیمت اسلام کے بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ میں مندرج ہیں مثلاً کھٰیٰعص کے حروف جن کی عددی قیمت 195 ہوئی ہے۔ سورہ مریم میں مسیحیت کی ترقی کا ذکر ہے۔ اور خصوصاً دوسری ترقی کا جو اسلام کے

تنزل کے بعد ہونا تھی۔ اسلامی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس سال سے عیسائیت نے دوبارہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ترقی کے راستہ پر چلنا شروع کیا۔ اس سال کوشش کی کہ معتصم باللہ جو مسیحی، رومی سلطنت کے خلاف نبرد آزما تھا کو معزول کر کے عباس بن مامون کو خلیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اس طرح اسلام کو ضعف پہنچایا جائے۔ اسی زمانہ کے قریب عیسائیوں نے دوبارہ سپین پر حملہ کر کے اس کے کچھ حصے واپس لے لیے۔ اسی زمانہ میں خلافت اندلس نے خلاف عباسیہ کے خلاف روما کے عیسائی بادشاہ سے خفیہ معاہدہ کیا۔ اور عباسی حکومت نے شاہ فرانس سے سپین کی اسلامی سلطنت کے خلاف دوستانہ مراسم قائم کیے۔ اس طرح اسلامی سیاست میں عیسائیوں کو داخل کر کے عیسائیت کی ترقی اور اسلام کے تنزل کی تمہید باندھی۔ اگر حروف مقطعات والی دوسری سورتوں پر غور کیا جائے تو حروف مقطعات کی عددی قوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخی واقعات پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

6۔ حروف مقطعات محض خبردار کرنے کے لیے اور اس بات کے لیے کہ ایک کلام یا مضمون ختم ہوا ہے اور دوسرا شروع ہونے والا ہے استعمال ہوئے ہیں۔ قدیم عرب میں بھی خطیب اپنے خطبات میں اکثر ایسا کرتے تھے۔ یہ قطرب کا قول ہے۔

7۔ عربی زبان ایک الہامی زبان ہے، اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اہم مطالب کو بعض حروف سے، ایک حرف سے، زیر، زبر، پیش اور تنوین سے کام نکال سکتی ہے۔ جب کہ دوسری زبانیں چند الفاظ یا چند فقرات کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہی خصوصیت عربی کے لسان مبین ہونے کی دلیل ہے مثلاً ف، وفا کر۔ ع یاد کر، خ میانہ روی سے چل۔ حروف مقطعات بھی اسی طرح بامعنی حروف ہیں جن کے نیچے معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

8۔ حروف مقطعات میں ان صفات الٰہیہ کا ذکر ہے جن کی توضیح اس سورت میں کی گئی ہے۔ حروف مقطعات صفات کے حروف میں سے چند حروف لیے گئے ہیں۔ یہی معنی سب سے زیادہ درست اور قرین قیاس ہیں مثلاً یہ حروف الفاظ کے قائم مقام ہیں۔ اس طرح کے حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے۔ سورہ بقرہ الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے انا اللہ اعلم معنی مروی ہیں یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔ گویا اللہ کی صفت علیم کا اظہار کیا گیا ہے۔

حروف مقطعات کا استعمال قدیم عربی لٹریچر میں:

حروف مقطعات کا استعمال قدیم عربی لٹریچر کے مطابق ہوا ہے۔ عرب کے بڑے بڑے شعراء اور نثر نگار ان کا استعمال کرتے تھے ایک شاعر کہتا ہے:

بالْخَیْرِ خَیْرَاتٌ وَاِنَّ شراًفا ولا ارید الشرالا آن تا

نیکی کے بدلے نیکی کروں گا۔ لیکن اگر تیرا ارادہ بدی کرنے کا ہے تو میں اس کے بدلے تیار ہوں اور میں بدی کا ارادہ نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ تیرا ارادہ ہو۔

اس شعر میں فشرٌ کی جگہ حرف ''فا'' استعمال ہوا ہے اور تشاء کی جگہ تا استعمال کیا گیا ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے: قلنا قفی لنا فقالت قاف ہم نے اس سے کہا کہ تو ذرا ٹھہر جا تو اس نے جواب میں قاف کہا یعنی میں ٹھہر گئی ہوں۔ پس وَقَفْتُ کی جگہ قاف استعمال ہوا ہے۔

موجودہ دور اور حروف مقطعات:

اس دور میں تو حروف مقطعات کا استعمال عام ہے۔ عہدوں، علمی ڈگریوں، خطابات، محکمہ جات وغیرہ کے حروف، الفاظ کے

قائم مقام استعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً بی اے۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ ایم بے اے۔ ایم این اے۔ ایم پی اے وغیرہ۔

حروف مقطعات والی سورتوں کا باہمی تعلق:

جب حروف مقطعات بدلتے ہیں تو ساتھ ہی سورتوں کے مضامین بدل جاتے ہیں۔ جس سورت میں پہلے حروف مقطعات استعمال ہوا ہے اور اس کے بعد کی تمام سورتیں جن سے پہلے حروف مقطعات استعمال نہیں ہوئے یا ہوئے ہیں تو وہی جو پہلے استعمال ہو چکے ہیں وہ ساری سورتیں مضمون کے لحاظ سے ایک سلک میں منسلک ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ توبہ تک ایک ہی مضمون ہے۔ یہ سب سورتیں یا تو الٓمٓ سے شروع ہوتی ہیں یا خالی ہیں۔ صرف سورہ اعراف میں ''ص'' بڑھایا گیا ہے۔ یعنی اس میں حروف مقطعات ''المص'' ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حروف (ص) تصدیق کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورہ اعراف کے بعد انفال اور توبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاوی کی تصدیق کی گئی ہے۔ اس لیے وہاں (''ص'') بڑھا دیا ہے۔ سورۃ بقرہ سے سورۃ توبہ تک علمی نقطہ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔

سورۃ یونس سے کہف تک مقطعات:

سورۃ یونس الٓمٓ کی بجائے ''الر'' سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں سے مضمون کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ الٓمٓ حروف مقطعات کے گروپ کی سورتوں میں علمی لحاظ سے بحث تھی۔ ''الــر'' سے شروع ہونے والی سورتیں یا جو اس گروپ کے تحت آتی ہیں ان سب میں واقعات اور ان کے نتائج پر بحث کی گئی ہے۔ ''الــر'' والے حروف مقطعات کے گروپ میں رعد ''الــر'' سے شروع ہوتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی ان سورتوں کے مضامین پر جن میں علاوہ دوسرے حروف مقطعات کے ''میم'' بھی آتا ہے غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے وہاں ''میم'' ازالہ شک کرتا ہے۔ سورہ رعد ''المر'' سے شروع ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد ''لاریب'' آتا ہے۔ سورۃ رعد ''المر'' سے شروع کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں جو واقعات اور نتائج بیان کیے ہیں ان میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔

اسی طرح بعد میں آنے والی سورتوں کا اسی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جہاں حروف مقطعات تبدیل ہوئے ہیں وہیں مضمون میں تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔

حروف مقطعات کا ادبی پہلو:

حروف مقطعات کا ایک ادبی پہلو بھی ہے۔ علم بلاغت کی اصطلاح میں حُسنِ ابتداء ایک صنعت کلام ہے یعنی قادر الکلام خطیب یا شاعر اپنے کلام کے آغاز میں ہی سامعین کو تحسین کلام کا زبردست احساس دلاتا ہے تاکہ ہمہ تن گوش ہو کر سنیں۔ حسن ابتداء کے مختلف افراد ہیں، ان میں سے اعلیٰ صنعت براعت استہلال ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خطبہ، قصیدہ اور کتاب وغیرہ کے آغاز میں ہی ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو مضمون کی طرف اشارہ کریں۔

حروف مقطعات میں یہ صنعت پورے کمال سے پائی جاتی ہے۔ حروف مقطعات ہی سورۃ کے اہم مضامین کی طرف قاری کا ذہن منتقل کر دیتے ہیں۔

حروف مقطعات کے معانی سمجھنے میں مستشرقین کی غلطی:

مستشرقین نے یہ معنی کیے ہیں کہ یہ ان کاتبوں کے نام ہیں جنہوں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے یہ سورتیں لکھی ہیں۔ سیل بحوالہ گولیس۔ چنانچہ انہوں نے الف سے ابوبکرؓ، ع سے علیؓ یا عمرؓ اس کے بعد ''س'' سے سعد، ''ط'' سے طلحہ اور ''ھا'' سے ابوھریرہ مراد لیے ہیں۔

یہ مستشرقین کی جہالت اور لاعلمی کا ثبوت ہے۔ ''ھا'' سے ابوھریرہ مراد لیتے ہیں۔ حضرت ابوھریرہؓ مدینہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جب کہ سورہ مریم اور طٰہٰ جن میں ''ہ'' آتی ہے دونوں مکی ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ کے اسلام لانے سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

مستشرقین کے نظریہ اور معانی کے بطلان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر بعض سورتیں جن کے آغاز میں حروف مقطعات آتے ہیں صحابہؓ نے لکھی تھیں تو پھر قرآن مجید کی مثل بنانے کے چیلنج کو منظور کر کے کفار کیوں نہ بنا لائے؟ آخر صحابہؓ بھی تو انہی عربوں میں سے تھے۔ جب کہ عربوں میں بڑے بڑے فصحاء و بلغاء موجود تھے۔ اگر قرآن مجید بقول مستشرقین انسانوں کا بنایا ہوا کلام ہوتا تو اس قسم کا کلام کفار بھی ضرور بنا لیتے۔ کفار کا چیلنج کو قبول نہ کرنا بلکہ آج تک کسی کافر کو قرآن کی مثل بنانے کی ہمت نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی صحابہؓ کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

بطلان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ مرشد اور مرید کا رشتہ نہایت ہی نازک ہوتا ہے۔ جب بھی مرشد سے کوئی ایسا فعل جو تقویٰ، دیانت اور صداقت کے خلاف ہو، سرزد ہو جائے تو مرید کے خلوص میں نقص آ جاتا ہے بلکہ وہ دائرہ عقیدت سے باہر نکل جاتا ہے۔ اگر مستشرقین کے قول کے مطابق بعض سورتیں جن کے آغاز میں حروف مقطعات آئے ہیں صحابہ کی بنائی ہوئی ہوتیں تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان پر کہ قرآن مجید خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے آپؐ سے برگشتہ ہو جاتے۔ ان کے خلوص اور محبت میں نہ صرف کمی آ جاتی بلکہ آپؐ سے بغض اور عناد کے جذبات دل میں لیے ہوئے ہوتے۔ کیونکہ سورتیں تو صحابہؓ لکھ رہے ہیں لیکن آپؐ کہتے یہ ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ صحابہؓ کی قربانیوں کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ ان کے خلوص اور ایثار اور محبت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ صحابہؓ کا خلوص اور قربانی اس بات کی دلیل قاطع ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ میں سچے تھے کہ تمام سورتیں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔

❁.....❁.....❁

متشابہات پر اعتراض

اعتراض:

متشابہات کے معانی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا تو پھر ان آیات کو کیوں نازل کیا گیا؟

جواب:

قرآن مجید میں دو قسم کی آیات ہیں محکم آیات اور متشابہہ آیات۔قرآن مجید میں آتا ہے: هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ (آل عمران 6:3) ''وہی خدا ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری۔ اس میں محکم آیات ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔

محکمات، محکم کی جمع ہے۔محکم وہ ہے جس میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شک وشبہ وارد نہ ہو۔(امام راغب) حکمتُ، احکمتُ، حکَمْتُ کے اصل معنی مَنعتُ ہے یعنی میں نے روک دیا۔پس فساد اور خلل کے روکنے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

پس محکم کو اس وجہ سے محکم کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بیان میں مضبوط ہوتا ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا۔

روح المعانی میں محکم کے معنی واضحة المعنى ظاهرة الدلالة محكمة البصارة لکھے ہیں۔

متشابہات۔متشابہہ کی جمع ہے۔کسی چیز کا شبہ وہ ہے جو کیفیت کے لحاظ سے اس کی مثل ہو (امام راغب) قرآن مجید کی متشابہہ آیات وہ ہوں گی۔جن کی تفسیر اس کے غیر کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے مشکل ہو۔خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے۔(امام راغب)

محکمات اور متشابھات کی عام فہم تشریح یہ ہے جس پر تقریباً تمام علماء متفق نظر آتے ہیں۔

آیات محکمات سے مراد وہ آیات قرآنی ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے۔جن کا مفہوم متعین اور واضح ہے یعنی جن کے الفاظ معنی اور مفہوم پر واضح دلالت کرتے ہیں۔

متشابہات وہ آیات ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔یہ وہ آیات ہیں جو ان مسائل کو بیان کرتی ہیں جو انسانی حواس اور علم کی گرفت سے باہر ہیں۔انسان کے علم کی گرفت میں وہی چیزیں آسکتی ہیں جن کو اس نے دیکھا ہوا۔چھوا ہو۔محسوس کیا ہوا۔چکھا ہوا۔خدا نے ان مسائل کو انسان کے ذہن کے قریب تر لانے کے لیے وہی الفاظ اور اسلوب اختیار کیا ہے جو بدیہی امور کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔لیکن وہ الفاظ بھی ان روحانی یا غیر حسی مسائل کی پوری حقیقت اور ماہیت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔سو اس قسم کی آیات متشابہات میں داخل ہیں ان کی تشریح اور تفسیر کرتے وقت محکمات کو سامنے رکھنا چاہیے۔

متشابہات کے بارہ میں ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ ان کے معانی سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا تو پھر ان آیات کو نازل کرنے کا کیا مطلب۔اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: هدًى للناس یعنی قرآن مجید لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مجاہد کی وساطت سے یہ قول مروی ہے آپ نے فرمایا: انا من الراسخین الذین یعلمون تاویله میں ان راسخون (علماء ربانی) میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں۔ اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام متشابہات کی تاویل جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض محض متشابہات اور محکمات کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔ حقیقت میں محکمات بدیہی اصول ہیں اور متشابہات مخفی اور ادق امور ہیں۔ ان مخفی اور ادق امور کی وضاحت بدیہی اصول کے تحت کرنی چاہیے۔ دنیا کے تمام علوم میں یہی قاعدہ ہے کہ کچھ بدیہی امور ہوتے ہیں اور کچھ ادق اور مخفی امور۔ اور مخفی امور کی وضاحت بدیہی امور کے تحت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ قسموں کی فلاسفی میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ بدیہی اور واضح ہیں۔ ہر شخص ان کی خصوصیات کو جانتا ہے۔ اس کے بعد ان مخفی اور ادق امور کو بیان کیا گیا ہے جن کو ان بدیہی امور کی روشنی میں ہی جانا جا سکتا ہے۔ علماء ربانی نے محکمات کے تحت متشابہات کی وضاحت کر دی ہے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا گیا ہے کہ آپؓ متشابہات کی تاویل جانتے تھے۔ لہٰذا قرآن مجید کا کوئی بھی ایسا حصہ نہیں جن کا جاننا محال ہو اور جانا نہ جا سکتا ہو۔ یہ ادق اور مخفی مضامین ہی قرآن مجید کا حسن ہیں۔ اور فصاحت و بلاغت کا ایک حصہ۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًاo (الکہف 109:18) ''کہہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔ گو ہم اسی جیسا (اور اس کی) مدد کو لائیں۔

کلمات ربی سے مراد وہی متشابہ آیات مراد ہیں جن کی وضاحت اور تشریح کے لیے علماء ربانی نے اپنی عمروں کو صرف کر دیا ہے۔ انہی متشابہ آیات کی تہ سے اسرار اور معارف کے موتی چن کر لاتے ہیں۔ یہ جتنا ان آیات جاننے کے لیے غور و خوض کرتے ہیں اسی قدر نئے نئے معارف ان کے سامنے آتے ہیں۔ تفاسیر کا دفتر اس پر گواہ ہے۔ ہر مفسر نے اپنے غور و خوض کے نتیجہ میں قارئین کے سامنے نئے سے نئے اسرار مخفیہ پیش کیے ہیں۔ لہٰذا معترض کا اعتراض محض عدم علم کا نتیجہ ہے اور قرآن مجید سارے کے سارا ھدی للناس (لوگوں کے لیے ہدایت) ہے۔

❀......❀......❀

خدا کا دلوں پر مہر لگانا

اعتراض:

اگر خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے اور اس لیے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا بھی قصور نہیں ۔ یہ قصور بھی خدا ہی کا ہے ۔ ایسی صورت میں انہیں آرام و تکلیف گناہ وثواب نہیں ہوسکتا ۔ پھر ان کو جزا سزا کیوں ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے گناہ وثواب جان بوجھ کر نہیں کیا ۔ (یہ اعتراض ختم الله علی قلوبهم پر ہے) (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں اعتراض 5)

یہ اعتراض صرف ستیارتھ پرکاش کے مصنف دیانند جی نے ہی نہیں کیا بلکہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے عام اعتراض کیا جاتا ہے ۔

جواب:

ختم اور طبع کے لغت میں ایک معنی ہیں یعنی ایک چیز کو ڈھانک دینا اور ایسا مضبوط باندھنا کہ دوسری چیز اس میں داخل نہ ہو سکے ۔ (تاج العروس)

دلوں پر مہر سے مراد:

امام راغب نے مفردات میں دلوں پر ختم یا مہر کرنے کی وضاحت اور تفسیریوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل یا گناہ کے ارتکاب میں حد سے بڑھ جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ کسی طرح پر حق کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تو یہ اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھا سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے ۔ گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (الانعام :25) میں یا وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً (مائدہ13:5) میں استعارہ ہے ۔

خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے:

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ'' (بقرہ:6) جنہوں نے انکار کیا یہاں تک کہ ان کے لیے برابر ہے کہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ نہیں مانتے ۔

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کی ضمیر عام کفار کی طرف نہیں جاتی ۔ بلکہ صرف انہی کفار کی طرف راجع ہے جن کا ذکر آیت 6 میں ہو چکا ہے کہ ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے ۔ جو کفر کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں ۔ یہ مہر لگانا ابتداء کے طور پر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کے وقت ہی ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے بلکہ یہ مہر لگانا بطور نتیجہ کے ہے کہ انہوں نے ڈرنے والے کے پند و نصائح کی طرف توجہ نہ کی ۔ دل کو حق بات پر غور وخوض کرنے سے روک لیا ۔ پھر کانوں کو اس بدانجام کے سننے سے بند کر لیا ۔ جب حواس سے کام لینا بند کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دل پر اور ان کی قوت شنوائی پر مہر کر دی ۔ یعنی ان کی غور و فکر کرنے کی عادت ختم ہوگئی ۔ کانوں پر پردے پڑ گئے ۔ حق وصداقت

کے نشان دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔

اُردو میں یہ عام محاورہ ہے کہ جب کوئی ہماری بات نہیں سنتا اور غور نہیں کرتا تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا قصور۔ اللہ تعالیٰ نے دل دیا کہ غور وفکر سے کام لیں۔ کان دیئے تھے پند ونصائح سنیں۔ آنکھیں عنایت کی تھیں کہ راہ حق کو دیکھیں اور اس پر چلیں مگر ان تمام حواس سے کام نہیں لیا تو ان پر مہر لگ گئی اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔ یہ ان کے اپنے ہی کردہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر توبہ کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ قلب سے مراد قلب روحانی ہے۔ اگر وہ گناہوں میں حد سے بڑھتا چلا جائے تو سیاہی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ران علی قلوبھم کا مصداق بن جاتا ہے۔ گویا وہ روشنی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی تھی وہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ زنگ یا مہر صرف کافر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ اگر کوئی مسلمان بھی گناہوں کے ارتکاب میں کمال تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بدی کا فلسفہ بیان کیا گیا کہ جب کوئی انسان بدی کی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے تو اس بدی کے اثرات کی وجہ سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ مسخ ہو جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ کالانعام ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم بدیوں میں اپنے کمال کو پہنچ جائے تو وہ قوم تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔ اس میں فرد کو اور قوموں کو بدی سے بچے رہنے کی فلسفیانہ تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کی تفسیر لَا يَعْقِلُوْنَ وَلَا يَسْمَعُوْنَ کی ہے۔ یعنی وہ نہ عقل سے کام لیتے ہیں اور نہ وہ سنتے ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ محمد میں مذکورہ آیت کی تشریح کر دی ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ○ (محمد 16:47) ''اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب اس سے نکلتے ہیں انہیں جنہیں علم دیا گیا، کہتے ہیں اس نے ابھی کیا کہا تھا۔ یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔''

اس آیت میں حق کی بات نہ سننے کے نتیجہ کو طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (ان کے دلوں پر مہر لگا دی) قرار دیا۔ معلوم ہوا اللہ کا دلوں پر مہر لگانا بد اعمال کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مزید وضاحت کر دی ہے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (الاعراف 179:7) ''اور ان کے دل ہیں جن سے وہ عقل سے کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان ہیں جن سے وہ سننے کا کام نہیں لیتے۔''

اس آیت کریمہ میں سورہ بقرہ کی آیت: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کی وضاحت کر دی۔ کہ مہر کیا ہے کفار کا حواس ظاہری اور باطنی سے کام نہ لینا۔

ہر علاقہ اور ہر زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو جج نے اتنے سال کے لیے قید کر دیا یا پھانسی دے دی۔ قید یا پھانسی کی سزا اس جج کا عمل نہیں بلکہ مجرم کے عمل کا نتیجہ ہے۔ جج نے قید یا پھانسی کی سزا مجرم کے جرم کے نتیجہ میں سنائی ہے۔

❀……❀……❀

ناسخ ومنسوخ

نسخ کتاب وتبدیل احکام کی فلاسفی

سوال:

آریوں کا یہ اعتراض ہے کہ مسلمانوں کا خدا متغیر ہے، کبھی کوئی حکم دیتا ہے کبھی کوئی۔ لیکن یہ امر خلاف عقل ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے بے سوچے آج کچھ کہہ دیا کل کو جب کوئی خرابی دیکھی تو حکم بدل دیا۔ خدا کا حکم آدمیوں کے حکم کے برابر نہیں ہمیشہ اس کا ایک حکم رہتا ہے۔

جواب:

قرآن مجید میں دو آیات ہیں جن سے معترضین (غیر مسلم) نے یہ اعتراض بنایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام بدلتا رہتا ہے۔ پہلی آیت ہے مَا نَنسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا (بقرہ 106:2) یعنی جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں۔

اس آیت میں نسخ آیت سے مراد پہلی شریعتوں کی منسوخی ہے۔ ابو بکر جصاصؒ نے بھی یہی معنی لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انماذکر فیھا من النسخ فانما المراد بہ نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین (احکام القرآن) اس آیت میں نسخ کا ذکر ہے لیکن اس سے سابق الانبیاء علیہ السلام کی شریعتوں کا نسخ مراد ہے۔

دوسری آیت سورۃ نحل کی ہے: وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ‌ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ (النحل 101:16) ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بھیجتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اتارتا ہے (اس پر کفار) کہتے ہیں تو افتراء کرنے والا ہے۔''

اس آیت کا مضمون خود ظاہر کر رہا ہے کہ کفار رسول کریم صلعم کو اس وجہ سے مفتری کہتے تھے کہ آپؐ نے سابقہ شرائع کو منسوخ کر کے ان کے قائم مقام ایک جامع اور مکمل شریعت پیش کی۔

نسخ کے معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کرنا ہے۔ دوسرے معنی تشریح اور وضاحت کے ہیں۔

ان دو آیات سے معترضین نے دھوکا کھایا۔ بعض نے عدم واقفیت کی بناء پر اعتراض کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی اور روحانی زندگی کے لیے دو صحیفے (کتب) تخلیق کیے ہیں۔ جسمانی حیات کے لیے کائنات اور مافیہا تخلیق کی ہے۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ اس لیے اس کو خدا کی فعلی کتاب بھی کہا جا سکتا ہے۔ روحانی زندگی کے لیے قرآن مجید نازل کیا ہے۔ یہ خدا کی قولی کتاب ہے۔ خدا تعالیٰ کی فعلی اور قولی کتب اہم آہنگ اور لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا سمجھنا دوسرے پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کی قولی کتاب یعنی قرآن مجید کو خدا کی فعلی کتاب یعنی نظام کائنات سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ قدم قدم پر

ٹھوکریں کھائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قولی کتاب یعنی قرآن مجید میں کائنات کی ہر چیز کا ذکر کیا ہے۔ کہیں پہاڑوں کا ذکر ہے کہیں سمندروں کا، ہواؤں، سورج، چاند، ستاروں، پھلوں، پرندوں، جانوروں وغیرہ کا وغیرہ ذکر کیا ہے۔ ان کے ذکر میں بنی نوع انسان کے فوائد مضمر ہیں۔

فعلی کتاب (کائنات) میں قانون تغیر اور نسخ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی حیات کے لیے اشیائے رزق پیدا کی ہیں۔ ان کی پیدائش کے لیے قانون قدرت میں تبدیلیاں اور نسخ ہے۔ کبھی آسمان سے بارش کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ کبھی خشک سالی اور دھوپ کا موسم ہوتا ہے۔ اگر بارشیں ہی ہوتی رہیں تو تخم ریزی نہیں ہو سکتی۔ اگر دھوپ ہی دھوپ ہو تو اور بارش نہ ہو تو دنیا قحط کا شکار ہو جائے۔ اسی طرح کبھی رات ہوتی ہے جس میں چاند اور ستارے چمک رہے ہوتے ہیں۔ چاند ستاروں کی روشنی پھلوں اور فصلوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ رات کے بعد دن آ جاتا ہے اور آسمان میں سورج کی حکومت ہو جاتی ہے۔ آسمان میں سورج کا ہونا حیات انسانی کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ سورج کی تمازت سے ہی فصلیں نشو ونما پاتی نہیں۔ پھر کبھی موسم گرما آ جاتا ہے کبھی موسم سرما کبھی موسم خزاں اور کبھی موسم بہار۔ ان تمام موسموں کے اپنے اپنے فوائد ہیں جو انسانی حیات کے لیے سب ضروری ہیں۔ گو خدا کے جسمانی نظام (فعلی کتاب) میں ہزاروں قسم کی تبدیلیاں اور نسخ پایا جاتا ہے۔ اگر قولی کتاب (الہامی کتاب) اللہ تعالیٰ کے جسمانی قانون (فعلی کتاب) کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب (الہامی کتاب) میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ جو تعلیم حضرت آدم علیہ السلام کے دور کے لیے ضروری تھی وہ نازل کی۔ جو تعلیم حضرت نوح اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے ادوار کے لیے ضروری تھی وہ نازل کی۔ حالات کے مطابق تبدیلیاں اور نسخ بھی ہوتے رہے۔ جیسا کہ قانون قدرت میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں وہی تبدیلیاں انسانی زندگی کے لیے ضروری تھیں۔ اسی طرح صحائف آسمانی میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ جو انسان کی روحانی زندگی کے لیے ضروری تھیں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں ایک اکمل کتاب نازل کر دی۔ پہلی آسمانی کتب قرآن مجید کی تکمیل کا ذریعہ تھیں۔ ان کا نزول ہی اس لیے تھا کہ تبدیلیوں اور نسخ کے ساتھ بنی نوع انسان کو ایک کامل کتاب دی جائے۔ گویا تکمیل شریعت کے لیے سابقہ آسمانی کتب کا نزول ضروری تھا۔ اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر ہم کسی شریعت کو منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر شریعت لاتے ہیں۔ جب پہلی شرائع منسوخ کیں تو ان سے بہتر شریعت قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوئی۔

2۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ الٰہی قوانین میں تغیرات اور نسخ انسانی حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان متغیر ہے اس لیے اس کے مناسب حال ہی قانون قدرت میں تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ قانون قدرت میں تغیرات کی ایک اور مثال دیکھیے۔ جب ایک بوند سے رحم مادر میں ایک بچہ نشو ونما پاتا ہے تو اس کی ربوبیت کے لیے اس کو خون کی غذا ملتی ہے۔ جب اس دنیا میں سانس لیتا ہے تو وہ غذا بدل جاتی ہے اور اس کا نعم البدل ماں کی چھاتیوں میں دودھ آ جاتا ہے۔ اس عمر میں دودھ ہی بہترین غذا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور مقوی غذا دیں گے تو بچہ یا تو بیمار ہو جائے گا یا مر جائے گا۔ لہٰذا اس عمر میں ماں کا دودھ ہی بہترین غذا ہے۔ جب بچہ دودھ کی عمر کی حد کو پار کرتا ہے تو پھر ماں نرم غذا دیتی ہے جو اس کے لیے مقوی اور معدہ کے لیے زُود ہضم ہوتی ہے۔ جب نرم غذا کی عمر کی حد سے آگے جاتا ہے تو کچھ ثقیل غذا دی جاتی ہے تو اس طرح عمر کے ساتھ ساتھ غذا کا قانون تبدیل ہو جاتا ہے کیا غذا کی ان تبدیلیوں پر کوئی اعتراض کر سکتا۔

جب ایسی تبدیلیاں اور نسخ اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت میں پائی جاتی ہیں اور وہی تبدیلیاں انسانی زندگی کے لیے بہتر ہیں تو اگر شریعت میں ایسی تبدیلیاں اور نسخ آجائے جو انسانی زندگی کے لیے بہتر اور اولیٰ ہیں تو پھر اعتراض کیسا۔ اللہ تعالیٰ احکام نازل کرنے میں بھولا نہیں بلکہ انسانی حالات اور تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت میں مادر رحم میں بچہ کی خوراک سے لے کر شباب تک مختلف تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جو انسانی حیات کے لیے ازحد ضروری تھیں اسی طرح شریعت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ خدا کی بھول کی وجہ سے نہیں بلکہ خدا کی حکمت کے تحت تھیں۔

3۔ہم روزمرہ کی زندگی میں تغیرات اور تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں۔ وہ تبدیلیاں ہی انسان کے لیے بہتر ہوتی ہیں مثلاً ایک طبیب کسی مریض کو اس کی بیماری کے پیش نظر دوائی تجویز کرتا ہے۔ جب مریض صحت یاب ہونا شروع ہو جاتا ہے تو طبیب پہلی دوائی کو تبدیل کر کے اور دوائی تجویز کر دیتا ہے۔ یہ تبدیلی مریض کی حالت کے پیش نظر کی گئی ہے اور ضروری تھی۔ اسی طرح دنیا کے تمام ممالک میں آئین مرتب ہوتے ہیں بعد ازاں ملکی حالات کے پیش نظر آئین میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں عوام اور ملک کے لیے بہتر تھیں۔ جب دنیا کے حالات متغیر ہیں اور ایک جیسے نہیں رہتے تو لازمی طور پر ان حالات کے پیش نظر ہی آئین مرتب ہوگا۔ اگر حالات کے مطابق نہیں ہوگا تو ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتب میں جو تبدیلیاں کی تھیں وہ زمانہ کے حالات کے مطابق تھیں وہی انسانی فلاح کی ضامن تھیں۔ خدا حکیم ہے اور ہر نقص سے پاک ہے۔ لہٰذا شرائع تبدیل کرنے میں نہ اس نے غلطی کی ہے اور نہ وہ بھولا ہے۔ اس نے اپنی حکمت کے تحت تبدیلیاں کی ہیں اور آخر کار قرآن مجید کی شکل میں شریعت پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی ہے۔

4۔ساری شرائع انوار الٰہیہ ہیں۔ ان شرائع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مانند آفتاب ہے (سراجاً منیرا)۔ جب آفتاب طلوع ہو جاتا ہے تو ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کے مقابلے پر دوسری شرائع ماند پڑ گئی ہیں اور روشنیاں مدھم پڑ گئی ہیں۔ لیکن وہ سابقہ شرائع ہیں برحق وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں۔ اسی لیے اسلام نے ان شرائع پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ان کے نسخ سے وہ باطل نہیں ہوئیں بلکہ وہ اسلامی شریعت کی تکمیل کا باعث تھیں۔

5۔جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے سلسلہ انبیاء شروع کیا تو اس کے ساتھ انسان ذہنی، تمدنی اور اخلاقی تربیت کے لیے انبیاء علیہم السلام پر شریعت نازل کی۔ اس طرح انسان تہذیب وتمدن کے مختلف ادوار میں سے گزرتا رہا۔ اور اللہ تعالیٰ ان ادوار کے نئے نئے تقاضوں کے مطابق شریعت نازل کرتا رہا۔ اس طرح انسانی عقل اور تہذیب وتمدن ترقی کرتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت میں ضرورتوں کے مطابق تبدیلی آتی چلی گئی۔ تمدنی ترقی کے ساتھ معمورہ دنیا کے دروازے ایک دوسرے ملک پر وا ہوتے چلے گئے اور انسان وحدت کے راستہ پر گامزن ہو گیا۔ تو ضروری تھا اس انقلاب کے موافق اللہ تعالیٰ احکام شریعت نازل کرتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی منصوبہ کے تحت آخری اور اکمل شریعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔ اس تکمیل میں پہلے کی سابقہ ادوار کی شرائع کا حصہ ہے۔ اور پہلی شریعتوں کے دائمی اور قائم رہنے والے اصول شریعت محمدیہ میں آگئے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ اس میں ان تمام اصولوں کو جمع کر دیا گیا ہے جو رہتی دنیا کے لیے ضروری ہیں۔

الغرض مختلف اوقات میں مختلف احکام نازل ہوتے رہے۔ یہ اختلاف بغرض تکمیل تھا۔ حسب تقاضہ وقت ان مختلف اور متغیر قوانین اور شرائع کو جو مختلف ادوار میں واقع ہوئے نسخ کہا جاتا ہے۔ اور قرآنی اصطلاح کے مطابق یہ تکمیل شریعت ہے۔

مولانا رومی نے اس نسخ کو حکیمانہ انداز میں ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

رمز ننسخ آیات او ننسہا
نات بخیراً وز عقب میدان مہما
ہر شریعت را کہ حق منسوخ کرد
او گیاہ برد و عوض آورد ورد
شب کند منسوخ نورِ روز را
بین جمادی وآن خرد افروز را
باز شب منسوخ شد از نورِ روز
تا جمادی سوخت زاں آتش فروز

6۔نقلی دلیل۔ بنیادی عقائد یعنی توحید باری تعالیٰ اور صفات الٰہیہ، عبادت، خیرات صدقات، روزہ، مکارم اخلاق اور اسی طرح ممنوعات جو انسانی روح کو مردہ کرتی ہیں ان میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ یہ ازلی صداقتیں اور حقیقتیں ہیں۔ ان جملہ باتوں میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور سب کی ایک ہی شریعت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوری رکوع 2) ''اور تمہارے (مسلمانوں) لیے وہ شریعت قائم کی ہے جس کا ہم نے نوحؑ کو حکم دیا تھا۔ اور وہ جو اے پیغمبر تیری طرف وحی کی گئی اور وہ جس کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا گیا۔ کہ اس شریعت کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ کرنا۔''

دوسری جگہ آتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام 6:90) ''یہ پیغمبر جن کا ذکر ہوا ہے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی۔ اے رسولؐ! آپ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں۔''

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ شریعت محمدیہ پہلی شریعتوں اور جدید احکام منزل من اللہ کا مجموعہ ہے۔ کوئی نئی شریعت نہیں۔ دوم اصول دین اور شریعت سب انبیاء کے مشترکہ اور متحدہ ہیں۔ ان میں قرآن مجید نے کوئی نسخ نہیں کیا۔

نسخ محض فروعات اور اس تعلیم میں جو صرف مخصوص دور اور وقت کے لیے تھی ہوا ہے۔ یہ نسخ ابتداء سے ہوتا چلا آیا ہے۔ نماز ہر مذہب میں ہے۔ لیکن اس کے ارکان اور ہیئت میں فرق تھا۔ چنانچہ اسلام نے نماز کو تو قائم رکھا لیکن اس کے ارکان اور ہیئت میں تبدیلی کردی۔ چنانچہ فروعات میں نسخ دیگر مذاہب میں بھی ہوتا رہا ہے اور یہ لازمی طور پر ہونا چاہیے تھا۔ جس کے نظائر یہ ہیں: 1۔آدم علیہ السلام کے عہد میں بہن بھائی کا نکاح درست تھا بلکہ سارا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی علاتی بہن تھیں جیسا کہ تورات سفر تکوین کے بیسویں باب میں ہے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں منسوخ ہو گیا اور بمنزلہ زنا قرار دیا گیا جیسا کہ سفر احبار کے اٹھارویں باب میں ہے۔

2۔نوح علیہ السلام کے عہد نبوت میں زمین پر چلنے والے کل جانور حلال تھے جیسا کہ سفر تکوین کے باب 9 میں ہے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں حرام ہو گئے جن میں خنزیر بھی ہے، سفر احبار کا گیارھواں باب۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دور میں دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا جائز اور درست تھا چنانچہ لیا اور راحیل دو حقیقی بہنیں تھیں۔ ایک ہی وقت میں حضرت یعقوب علیہ السلام

کے نکاح میں تھیں جیسا کہ سفر تکوین کے 29 باب میں ہے۔ پھر یہ نکاح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں حرام ہوا۔ (سفر احبار کا آٹھورواں باب۔)

4۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بہت سے جانور حرام تھے ختنہ اور تعظیم سبت فرض تھی اور ان کو ابدی قرار دیا گیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ کی اس شریعت کو حواریوں نے منسوخ کر دیا اور صرف چار حکم باقی رہنے دیئے، ذبیحہ صنم، خون، گلا گھونٹا ہوا جانور اور زنا۔ جیسا کہ نامہ حواریوں کے پانچویں باب میں ہے۔ پھر پولوس مقدس نے زنا کے سوا ان کو بھی منسوخ کر دیا۔ (نامہ حواریاں باب 5)

مذکورہ حوالہ جات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک حکم کسی ایک نبی کے عہد میں جائز ہے جب کہ بعد میں آنے والے نبی نے اس کو حرام قرار دے کر منسوخ کر دیا۔ اس طرح فروعات میں نسخ کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ نسخ تکمیل شریعت کے لیے ضروری تھا۔ جو حکم منسوخ کیا جاتا تھا اس کی جگہ بہتر تعلیم لائی جاتی تھی۔

❁......❁......❁

ویداور بائبل کے ہوتے ہوئے قرآن مجید کی ضرورت

اعتراض

اگر بائبل وغیرہ پر ایمان لانا واجب ہے تو مسلمان بائبل کے پیروکاروں کی طرح ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اور اگر لاتے ہیں تو قرآن کا لازم ہونا کس مطلب کے لیے ہے۔ اگر کہو کہ قرآن میں زیادہ ہدایتیں ہیں تو پہلی کتاب میں کیا خدا لکھنا بھول گیا تھا۔ اگر نہیں بھولا تو قرآن کا نازل ہونا فضول ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل اور قرآن کی بعض بعض باتیں آپس میں نہیں ملتیں۔ بہت سی ملتیں ہیں۔ ایسی صورت میں دو کتابیں نازل کرنے کی بجائے وید کی طرح ایک ہی کتاب کیوں نہ نازل کی۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں، اعتراض 5)

دیانند جی نے اس اعتراض کو دوسری جگہ بھی دہرایا ہے اور لکھا ہے اگر موسیٰ کو کتاب دی تو قرآن کا ہونا فضول ہے۔ ایک پادری نے عدم ضرورت پر کتاب بھی لکھی ہے۔

یہ وہ اعتراض ہے جس کو مختلف معترضین نے مختلف پیرائے میں دہرایا ہے۔

دوسرے مذاہب کی کتب کی موجودگی میں قرآن (اسلام) کی ضرورت

پہلی ضرورت: تکمیل شریعت

قرآن مجید (اسلام) سے پہلے جس قدر مذاہب آئے وہ سب قومی اور محدود ضروریات کے مطابق تھے۔ ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیر حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے متعلق آیا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (55:17) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (65:17) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے: اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (73:17) ثمود قوم کی طرف ان کا بھائی صالح نبی بن کر آیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آیا: اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا (75:17) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (5:14) اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: رَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ (آل عمران 3:49)

اگر مذاہب عالم کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی کہ کسی کتاب نے بھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ویدوں کو لیجیے۔ نہ تو خود وید نے عالمگیر الہام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کسی وید بھاسکر نے وید کی تعلیم کو عالمگیر قرار دیا۔ اگر وید کی تعلیم عالمگیر ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کی تعلیم کی اشاعت اور تبلیغ ہندوستان کی چار دیواری سے باہر ہوتی، اور وید کے ماننے والے دنیا کی دوسری اقوام تک اس کے پیغام کو پہنچانا ضروری سمجھتے۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں شودر وید کا کلام سننا تو درکنار

وید کی شکل دیکھنے سے محروم رہا۔ منوجی کے قول کے مطابق ایک شودر برہمن کے منہ سے وید کو سن لے تو اس کو قتل کر دینا ضروری ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وید کی تعلیم عالمگیر نہیں تھی، بلکہ صرف ایک قوم کے لیے تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول تو اب تک انجیل میں لکھا ہوا ہے:

''میں صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، پس میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا۔'' (متی، 15 باب)

پہلے انبیاء علیہم السلام کا پیغام ربانی لے کر صرف ایک ہی قوم کی طرف آنا زمانہ اور فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ نزول قرآن مجید سے قبل دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے، ذرائع رسل ورسائل مفقود تھے، اس وجہ سے قومیں ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھیں۔ دوسرے انسان کا ذہن ایک عالمگیر شریعت کو اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق مختلف وقتوں میں پیغام بھیجتا رہا۔ جب دنیا رسل ورسائل اور ذرائع آمد ورفت کی وجہ سے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی تو ایک مکمل شریعت کی ضرورت پڑی جو بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے۔ سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے رسول کریم ﷺ کو اسلام کی تعلیم دے کر بھیجا۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ 5:3) ''آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔ دین اسلام تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 98:3) اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی اس میں تمام کتاب کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

دوسری ضرورت: مذہبی اختلاف کا فیصلہ

اسلام سے پہلے تمام مذاہب اختلافات اور تنازعات کا شکار بن چکے تھے، اب ضروری تھا کہ تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ ہوتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسلام کی تعلیم کو نازل فرمایا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل 16:64) اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ جب ہم مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اختلافات کے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہودی مذہب میں فریسیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر نجات پا جائیں گے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرہ 2:80-82) ''اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی، کہہ تم نے اللہ سے کوئی اقرار کر لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

ان آیات میں ان کے باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ کسی نبی کی راست بازی سے راست باز ٹھہر کر کوئی نجات نہیں پا سکتا بلکہ

نجات کا دارومدار عمل پر ہے چنانچہ فرمایا: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی بُرے اعمال کی سزا کو کسی نیک آدمی کی راست بازی دور نہیں کر سکتی۔ بُرے اعمال کی سزا ضرور انسان کو گھیر لیتی ہے۔

اسی طرح یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ابنیت کی پُرزور تردید کی۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ (مریم 88-90) اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنالیا ہے یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے ہو، قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائے اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اختلافات ہی اختلافات نظر آتے ہیں۔ رومن کیتھولک تین خداؤں کے سوا حضرت مریم کو بھی معبودیت کے تخت پر بٹھاتے ہیں اور پوپ کو معصون عن الخطا گردانتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ صرف باپ، بیٹا اور روح القدس تک ہی الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں اور پوپ کو معصون عن الخطاء نہیں مانتے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔

عشاء ربانی کے نظریہ کے تحت بعض کے نزدیک شراب اور روٹی حلق کے نیچے اترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت بن جاتی ہے۔ اور عشاء ربانی میں شامل ہو کر مسیح سے توصل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ نے مسیحیوں کو گناہ کی زندگی میں دھکیل دیا ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ تثلیث کو باطل قرار دیا ہے، ارشادِ الٰہی ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (171:14) ”پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ خدا تین ہیں اس عقیدہ سے باز آجاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی معبود ہے۔

اسی طرح عیسیٰ اور مریم کے خدا ہونے کی تردید کی: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (116:5) ”اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو“

کفارہ کی تردید یوں کی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام 164:6) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے گا۔

قرآن مجید نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقیدہ کی کئی جگہ پُرزور الفاظ میں تردید کی، ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (64:3) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

عقیدہ تناسخ کا رد:

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ایک انسان کو اپنے بُرے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے مختلف جونوں میں تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (جزا و سزا کے دن کا مالک) میں اس عقیدہ کا رد کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ملک محدود اختیارات کا حاکم ہوتا ہے، وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مالک کے اختیارات وسیع ہیں جسے چاہے معاف کر دے۔ پس خدا تعالیٰ جزا و سزا کے دن جسے چاہے معاف کر سکتا ہے۔ پھر

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کو: غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (3:40) کہتا ہے۔ یعنی اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

روح و مادہ کی ابدیت اور ازلیت کا عقیدہ:

یہ عقیدہ بھی ہندوازم کا ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے خدا کی صفات میں شرک لازم آتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک جگہ نہیں بلکہ بے شمار جگہ پر ہر قسم کے شرک کا رد کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 3:64) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا گیا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں، وہ مادہ اور روح کا بھی رب ہے۔ اس وجہ سے یہ خدا کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتے۔

تیسری ضرورت: کتب سابقہ کی غلطیوں کی اصلاح:

لوگوں نے سابقہ کتب سماوی میں بعض ایسی غلط باتیں شامل کر دی تھیں جو مذہب کی روح کے سراسر منافی تھیں۔ قرآن مجید نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔ مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے، حضرت لوط علیہ السلام اپنی ہی بیٹیوں سے فعل شنیع کے مرتکب ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کا ایک بت بنایا، حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا، حضرت سلیمان نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کی پوجا کی۔

قرآن مجید نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر انتہائی تعریفی الفاظ میں کیا ہے اور اصولی طور پر عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ٥ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ٥ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (الانبیاء 21:25،26)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ يَّغُلَّ (16:13) کسی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

یہ دونوں آیات عصمت انبیاء علیہم السلام پر محکم دلیل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وہی کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی ہو، ان کی زندگی وحی الٰہی کے مطابق گزرتی ہے۔

چوتھی ضرورت: سابقہ کتب سماوی کے برحق ہونے کی تصدیق اور حفاظت:

قرآن مجید کے نزول سے قبل ہر نبی کی بعثت قومی سطح پر ہوتی تھی اس وجہ سے ان پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ بھی اسی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔

اس طرح ہر قوم صرف اپنے آپ کو ہی وحی کی نعمت عظمیٰ سے مستفیض سمجھتی تھی دوسروں کو محروم۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قوم میں تنگ نظری اور تعصب کا مرض پیدا ہو گیا۔

اسلام آیا تو اس نے نہ صرف پہلی وحیوں کو برحق قرار دیا بلکہ ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا اور کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ پہلی کتب پر ایمان نہ لائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (بقرہ 2:41) اور

پس اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ بنو۔

دوسری جگہ آتا ہے، وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (مائدہ 48:5) اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جو اس سے پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محافظ ہے اور ان کے درمیان ان کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

قرآن مجید پہلی کتب کا مصدق دو لحاظ سے ہے: ایک تو اس لحاظ سے کہ قرآن تمام کتب ساوی کو من جانب اللہ مانتا ہے۔ دوسرا اس لحاظ سے مصدق ہے کہ پہلی کتب میں قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں۔ قرآن مجید نے ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کتب کو سچا ٹھہرایا ہے۔

پانچویں ضرورت: گم شدہ توحید کو قائم کرنا:

قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا سے توحید کا چراغ جو مختلف انبیاء علیہم السلام نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں میں روشن کیا تھا بجھ چکا تھا۔ ہندو مذہب میں تینتیس کروڑ دیوتا بن چکے تھے۔ بدھ مذہب میں خدا کی ہستی کا تصور خرافات، توہمات اور قیاسات کے نیچے دب کر گم ہو چکا تھا۔ زرتشت مذہب میں خالق خیر و خالق شر دو معبود یزدان اور اہرمن کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ یہودیوں نے عیسائیت کے نقش قدم پر چل کر حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا تھا۔ عیسائیت تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔ غرض کہ تمام دنیا کسی نہ کسی رنگ میں شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے توحید کی بجھی ہوئی شمع کو از سر نو جلایا اور تاریک دلوں کو خدا کی توحید سے منور کیا اور شرک کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔

چھٹی ضرورت: تکمیل انسانیت:

سابقہ مذاہب کی کتب ساوی میں انسانی قویٰ کی نشوونما و تربیت کے لیے افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ یہودی مذہب انتقامی جذبہ کو زیادہ ابھارتا ہے اور عیسائیت جذبہ رحم کی اس رنگ میں تربیت کرتی ہے کہ غصہ جو انسان کا طبعی جذبہ ہے وہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کی تعلیم کی رُو سے اگر کوئی کسی عیسائی کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف کر دینا چاہیے۔ یہی حال ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا ہے۔ اس وجہ سے تکمیل انسانیت کے لیے ایک ایسے دین کی ضرورت تھی جو انسانی قوتوں کی اعتدال پر نشوونما کرے، سو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل کیا۔

اسلام میں تفریط کا رنگ نہیں ہے بلکہ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید انتقام کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر، قرآن مجید انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن تبذیر سے روکتا ہے۔ قرآن مجید رحم کی بھی تعلیم دیتا ہے لیکن مناسب موقع پر غرض کہ اسلام نے انسانی قویٰ کی نشوونما اعتدال پر کر کے انسانیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

ساتویں ضرورت: نسلِ انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کرنا

اللہ تعالیٰ کی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ نسلِ انسانی کو وحدت کی لڑی میں منسلک کر دیا جائے۔ اس تقاضا کو اسلام نے پورا کیا۔ اسلام سے پہلے کسی مذہب نے بھی نسلِ انسانی کی وحدت کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس 19:10) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ○ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ

حِزْبٍ ۢبِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ o فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰی حِیْنٍ o (المومنون 23:52۔53) یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ ہی سے ڈرو۔ مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے، سو ایک وقت تک انہیں اپنی جہالت کی نیند میں چھوڑ دے۔

اسلام نے وحدت نسل انسانی کو ختم کرنے والے تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

مذہبی تعصب:

مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے یہ تعلیم دی کہ تمام کتب اور رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔ وہ تمام قابلِ احترام اور معزز ہستیاں ہیں۔ اسی وجہ سے ایک مسلمان ہونے کے لیے سابقہ کتب سماوی اور تمام رسل پر ایمان لانا فرض قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ 2:285) ہم کسی رسول کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَلْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (الانعام 6:285) مومن سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔''

اسلام صرف تمام مذاہب کے انبیاء علیہم السلام کو ہی صرف سچا نہیں مانتا بلکہ یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مذاہب میں نیک آدمی پائے جاتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ o يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِی الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ o (آل عمران 3:113 تا 114) یعنی اہلِ کتاب سب برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں سے ایک جماعت حق پر ہے جو اللہ کی آیات کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں، وہ اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہیں، نیکی کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکی کرنے میں جلدی کرتے ہیں، وہی لوگ نیکوں میں سے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ o (الاعراف 6:181) ''اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں۔

مذہبی تعصب کو بالکل ختم کرنے کے لیے قرآن مجید نے تمام مذاہب کو ایک مشترکہ امر یعنی توحید پر جمع ہونے کی دعوت دی ہے کیونکہ تمام مذاہب کی بنیاد توحید پر ہی قائم ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء 21:25) ''تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو۔''

اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے۔ یہ ایک الگ امر ہے کہ مرور زمانہ سے مذاہب کے اس تصور میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوتی چلی گئی ہے۔

قرآن مجید نے اس مرکزی نقطہ کے سامنے رکھ کر یہ دعوت دی: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران 3:64) ''کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان امر مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی

عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

قومی، لونی، لسانی تعصبات:

وحدت نسل انسانی کے لیے قومی، لونی اور لسانی تعصبات نہایت ہی خطرناک ہیں۔ ان تعصبات نے دنیا کی اقوام میں منافرت اور مخاصمت کی آگ بھڑکا دی ہوئی ہے۔ قرآن نے ان تعصبات کو ختم کرنے کی نہایت ہی اعلیٰ پیرایہ میں تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات 13:49) ''یہ خطاب تمام دنیا کو ہے...... اے لوگو! غور کرو تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ہی نسل کے افراد ہو تمہاری شاخیں اور قبیلے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، خدا کو کسی قوم کا فرد عزیز نہیں ہاں خدا کو صرف وہ عزیز ہے جس کے دل میں خوف الٰہی ہو اور نیک عملی زندگی بسر کر کے نوع انسانی کی خدمت کرے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: لافضل لعربی علی عجمی ولعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود و لالاسود علی ابیض الابتقویٰ (زادالمعاد ص 32 ج 4) کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے ہاں اگر فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ ہے۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (روم 22:30) ''اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں میں اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں علم رکھنے والوں کے لیے نشان ہے۔''

یہ تمام آیات قومی، لسانی اور لونی تعصبات کی جڑ پر تبر رکھ کر کاٹ رہی ہے۔

قرآن مجید نے اس نظریہ کو عملی رنگ میں نماز اور حج کی عبادت میں پیش کیا ہے جہاں تمام انسان بلاتفریق قوم و ملت ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر وحدت نسلِ انسانی کی تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا انسان قومی تعصبات کے بدنتائج اور عواقب کو دیکھ کر خود اس نظریہ سے بیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہکسلے نے 1947ء میں لکھا تھا:

''قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیر کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بحیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔''

ڈاکٹر "GAULD" اپنی کتاب ''MAN, NATURE AND TIME'' میں لکھتا ہے: ''اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوع انسان کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔''

یہ ہے اسلام کے زندہ اور سچا مذہب ہونے کا ثبوت۔ جس نظریہ تک انسان کا ذہن اب پہنچا ہے اس نظریہ کو قرآن نے چودہ سو سال قبل بیان کر دیا تھا۔

آٹھویں ضرورت: اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ازلی کی تکمیل کرنا:

خدا کا وہ ارادہ جس سے اشیاء پیدا کرتا ہے اس کی تکمیل ایک ضروری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے وحی نازل کرے۔ سو وحی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی۔ اس ارادہ کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسلام اپنی مکمل صررت میں قرآن کی شکل میں نازل ہو۔ اگر قرآن مجید نازل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں نقص لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام نقائص سے منزہ اور تمام خوبیوں کی جامع ہے اس وجہ سے اسلام کا مکمل صورت میں آنا ضروری تھا۔

نویں ضرورت پیشین گوئیوں کی صداقت کا اظہار:

پہلے انبیاء علیہم السلام نے ایک موعود نبیؐ کی بعثت کی پیشگوئیاں کی تھیں اور اپنی اپنی امت کو تلقین کی تھی کہ جب وہ نبی آئے تو اس پر ایمان لانا۔ ان پیشگوئیوں کی وجہ سے موعود نبیؐ کا آنا ضروری تھا۔ یہ صرف قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کو ہی ظاہر نہیں کرتیں بلکہ پہلی کتب اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت اور حقیقت کو بھی واضح کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَاِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (الشعراء 196:26) اور بے شک یہ (قرآن) پہلوں کی کتابوں میں بھی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ٥ (سورہ آل عمران 81:3) ''اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے۔ پھر تمہارے پاس وہ رسولؐ آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی ضرور مدد کرنی ہوگی، کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ کہا پس تم گواہ رہو۔ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔''

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں جملہ انبیاء علیہم السلام کی کتب میں پائی جاتی ہیں اختصار کے ساتھ پہلے نبیوں کی کتب سے پیشگوئیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بشارات کے متعلق ایک اصولی بحث:

1۔ بشارت کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خواب کا سا مضمون رکھتی ہیں۔ عام طور پر عوام پر مشتبہ رہتی ہیں اور خواص پر بھی کبھی قرائن سے اور کبھی اس نبی کے ظہور کے وقت جس کی نسبت وہ بشارات ہیں یا اس کے اور دلائل سے ثبوت نبوت کے بعد اور اس مبشر نبی کی تفسیر سے ظہور پاتی ہیں۔ عیسائی نکتہ خیال سے تو جس کی نسبت بشارت ہو کبھی کبھی وہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یوحنا خود ایلیا ہونے سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ مسیح علیہ السلام اسے ایلیا قرار دیتے ہیں۔ (دیکھو لوقا 1-27، متی 11-14- اور 17-41)

2۔ بشارات میں بالعموم نام صفاتی ہوتے ہیں ذاتی نہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی قیمت اس کی صفات کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذاتی نام کے لحاظ سے۔ جیسے حضرت مسیحؑ کا ذاتی نام یسوع ہے، اس نام کی پیشگوئی کتب سابقہ میں نہیں پائی جاتی، مسیح کے نام کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

3۔ بشارات میں مقامات اور ملکوں کے نام بھی صفاتی ہوتے ہیں۔

4۔ بشارات کی مدت سے انسانوں کی مدت مراد نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ یعنی اللہ کے ہاں ایک دن تمہارے شمار سے ہزار برس ہوتا ہے۔

5۔ کسی بشارت کا کوئی حصہ عقل اور علم کے خلاف ہوگا تو وہ نا قابلِ قبول ہوگا۔

6۔ بشارت کا افسانوی حصہ واقعات کی تعبیر کے مطابق قبول کیا جائے گا۔

7۔ کسی نبی کے متعلق دوبارہ دنیا میں معبوث ہونے کی بشارت سے مراد اس نبی کی صفات پر کسی دوسرے نبی کا معبوث ہونا ہے۔ لوقا 1، 17 میں مسیح نے ایلیا کے دوبارہ آنے کی تشریح اسی طرح کی اور جناب کرشن فرماتے ہیں کہ ہم کسی اور شکل میں حسب ضرورت اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔

8۔ اگر کسی مقدس کتاب کی بشارت میں ایک ہی ہستی کے متعلق دو جہتیں ہوں گی تو اس کی ایک ہی جہت قابل قبول ہوگی۔ کیونکہ الہامی کتب تحریف کی وجہ سے کم وبیش اپنی اصلیت ضائع کر چکی ہیں۔ نیز یہ امر خود کتاب کی صداقت کے خلاف ہے کہ وہ ایک ہی ہستی کے متعلق دو مخالف ومتضاد خیال رکھتی ہو۔

پارسی مذاہب میں نوید آنحضرت ﷺ:

زرتشتی مذہب جسے عوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں اور جو ایران کا قدیم مذہب ہے، اسی مذہب کو آتش پرستی اور مجوسی دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتاب ژندی اور پہلوی دو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں، ایک کا دساتیر اور دوسرے کا اوستا یا ژند اوستا نام ہے۔ ان کتب کے دو حصے ہیں، خورد دساتیر اور کلاں دساتیر۔ 2۔ خورد اوستا اور کلاں اوستا۔ انہی دو کو ژند اور مہا ژند کہتے ہیں۔

جناب زرتشت کو خدا تعالیٰ نے مخاطب کر کے ژند اوستا کی کتاب ژند اوستا فروردیں۔ یشت 13 میں فرمایا:

''اس کا نام فاتح مہربان اور اسی کا نام ''استوت اریتا'' (تعریف کیا گیا یا محمد) ہوگا۔ وہ رحمت کا مجسمہ ہوگا کیونکہ وہ تمام جہان کے لیے رحمت ہوگا۔ وہ حاشر ہوگا اس لیے کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے خلاف معبوث ہوگا۔ وہ مشرک لوگوں اور ایمان دار لوگوں کی اصلاح کرے گا۔ یعنی مشرکین، بت پرست اور زرتشتی مذہب کے پیروؤں کی بدیوں کی اصلاح کرے گا۔'' (جیمس ڈاریٹر مترجم ژند اوستا کا اس آیت پر نوٹ فروردین یشت 28 آیت 129)

دنیا میں ایک ہی عظیم الشان رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں جن پر یہ پیش گوئی لفظاً لفظاً صادق آتی ہے۔ وہ تمام صفات جو اس بشارت میں بیان کی گئی ہیں وہ آپؐ کی ذاتِ مقدس میں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ کا فاتح مہربان ہونا فتح مکہ کے دن ظاہر ہوا۔ اپنے خونخوار دشمنوں کو: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم کہہ کر چھوڑ دیا۔ آپؐ کا نام محمدؐ۔ آپؐ کا لقب رحمۃ للعالمین ہونا، جبکہ آپؐ سے قبل تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کے لیے رحمت تھے۔ آپؐ کا حاشر ہونا یعنی آپؐ کے قدموں پر دنیا کی تمام قوموں کا اکٹھا ہونا، بت پرستوں کی اصلاح کرنا۔ یہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ہیں۔

مہاتما بدھ کی پیشگوئی:

مہاتما بدھ کی ایک پیش گوئی میتیا (METTEYYA) کی آمد پر مشتمل ہے چنانچہ ''چکاوتی سنگھ ناد'' ستنا ڈی 3:76 میں لکھا ہے:

ترجمہ: ''بھائیو! اس وقت دنیا میں ایک اعلیٰ ہستی معبوث ہوگی۔ اس کا نام برگزیدہ میتیا ہوگا۔ کامل معرفت والا، حکمت، نیکی اور

سرور مطلق والا۔ تمام عالمین کا عالم بے نظیر۔ ہدایت کے متمنی لوگوں کا ہادی، ملائکہ اور انس کا معلم، ایک بدھ اعظم جیسا میں اس وقت ہوں۔ وہ خود کامل طور پر جانے گا اور دیکھے گا۔ گویا کہ یہ کائنات اس کے روبرو اپنی ساری ارواح عرفا جن و شیطان برہمنوں کشتریوں، ویشوں (علماء اہل سیاست اور کاروباری لوگوں) کے ساتھ موجود ہے، جیسا کہ میں برای العین اسے دیکھ اور جان رہا ہوں۔ صداقت اپنی اصلی پیاری کامل اور اُٹھتی ہوئی خوبصورتی میں ہوگی اور اعلیٰ زندگی کی معرفت مع اپنے کمال وصفاتی اصلی روح اور الفاظ دونوں کی وساطت سے ظاہر کی جائے گی۔ جیسا کہ میں اب ظاہر کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہزاروں صحابہؓ کی جماعت ہوگی جیسا کہ میرے ساتھ چند سو کی جماعت ہے۔'' (بدھ کی کتب مقدسہ 4، ص 73-74)

لفظ میتیا کے معنی سنسکرت اور پالی لغت میں:

جس طرح اس نام کا تلفظ مختلف کتابوں میں مختلف ہے اسی طرح اس کے معنی میں بھی خفیف سا اختلاف ہے۔

ا: میتیا کے معنی سنسکرت لغت میں مہربان، دوست یا رؤف الرحیم کے ہیں۔ (سنسکرت انگلش ڈکشنری مولفہ مونیر ولیم صفحہ 181)

ب: بودھی ستو کا نام اور آئندہ آنے والے بدھ کا نام جو موجودہ دور عالم کا پانچواں بدھ ہوگا۔ (بدھ ازم مذکور ص 181)

ج: یہ لفظ میتری سے ہے جس کے معنی دوست، خیر خواہی کے ہیں۔ (کتاب مذکور ص 128)

د: معلم محبت ہے رحمتہ للعالمین۔ اقرب فی المودۃ۔

ہ: پالی لغت میں اس کے معنی دوستی، رحم، رحمت، محبت، شفقت، ہمدردی، مخلوق کی خیر خواہی ہیں۔ (پالی ڈکشنری مصنف ولیم سٹیڈ)

اس پیشگوئی میں میتیا کا لفظ قابلِ غور ہے جس کے معنی مہربان دوست یا رؤف رحیم ہیں۔ قرآن مجید نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت کا حامل قرار دیا ہے۔ جس کی شہادت آپؐ کی سوانح زندگی میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

ا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء 21:107) آپؐ کو تمام قوموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ب: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران 3:159) سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔

ج: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ 9:128) یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسولؐ آیا ہے۔ تمہارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے وہ تمہارے لیے بھلائی کا خواہش مند ہے اور مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

میتیا کے دوسرے معنی معرفت، حکمت، نیکی وعلم، تعلیم و ہدایت میں کمال رکھنے والے کے ہیں۔ یہ تمام صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق پیشگوئی:

مہا تما بدھ کے اصل الفاظ کا ترجمہ کتب مقدسہ جلد 4 ص 74 پر یوں دیا ہے:

The truth lovely in consummation will be proclaimed both in the spirit and in the letter.

''پیغامِ حق اپنی دلنواز تکمیل اور روز افزوں خوبصورتی میں حافظہ اور حروف دونوں میں شائع کیا جائے گا۔''

اس ایک جملہ میں قرآن مجید کے اکثر خصائص بیان کر دیئے گئے ہیں جو دنیا کی کسی کتاب کو میسر نہیں۔

1۔وہ پیغام حق ہے۔

2۔قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہے۔

3۔اس کی صداقت روز بروز کھل کر سامنے آئے گی۔

4۔حفاظ کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔

5۔احاطۂ تحریر میں آ کر اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہو جائے گا۔

اہل ہنود کی کتب مقدسہ میں پیشگوئی:

مہر دیاس ہندوؤں کے ایک بڑے مرتاض اور صفا کیش رشی مانے جاتے ہیں۔ان کی سب سے بڑی تالیف 18 مجلدات پران ہیں۔ان پرانوں کے 18 سمندر ہیں۔ایک بڑے پایہ کی کتاب بھوشیہ پران ہے جس میں آئندہ کی خبریں بیان کی گئی ہیں۔اس کے پرتی سرگ پرو 3 کھنڈ 3 ادھیاء 3 شلوک 5 تا 8 میں یہ بشارت موجود ہے۔

پیش گوئی کا ترجمہ:

ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلم روحانی اپنے صحابہؓ کے ساتھ آئے گا اس کا نام محمدؐ ہو گا۔راجہ بھوج نے اس مہا دیو (ملائک سیرت) عرب کے رہنے والے کو آب رود گنگا اور پنچ گویہ سے غسل کرا کے (یعنی تمام گناہوں سے پاک ٹھہرا کر) دلی ارادت سے نذر و نیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا میں تیرے حضور جھکتا ہوں۔اے فخرِ نسلِ انسانی عرب کے رہنے والے! شیطان کے مارنے کے لیے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے، دشمن ملیچھوں سے محافظت کیے گئے ہو۔اے پاک ہستی مطلق اور سرور کامل کے مظہر میں تیرا غلام ہوں، مجھ کو اپنے قدموں میں آیا ہوا جانیے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

1۔اس بشارت میں حضور کا نام محمدؐ صاف بتا دیا۔

2۔ملک عرب کا آپؐ کو رہنے والا بتایا ہے۔(لفظی معنی مرو ستھل کے ریگ زار کے ہیں)

3۔آپ کے صحابہؓ کا ذکر خصوصیت سے کیا۔شاید ہی دنیا میں کوئی اور نبی آیا ہو گا جس نے اپنے پیروکاروں کو اپنے رنگ میں اتنا رنگین کیا ہو۔

4۔وہ گناہوں سے پاک فرشتہ سیرت ہو گا۔

5۔ہندوستان کا راجہ اس سے دلی عقیدت رکھے گا۔

6۔آپؐ کی دشمنوں سے حفاظت ہو گی۔

7۔آپؐ ہر قسم کی بدی کو مٹانے والے ہوں گے۔

8۔آپؐ خدا کے مظہر اتم ہوں گے۔

9۔مہرشی اپنے آپ کو آپؐ کے قدموں میں آیا ہوا قرار دیتا ہے۔

10۔آپ کو فخرِ نسل انسانی بتایا ہے۔

یہ بشارت اس قدر صاف اور واضح ہے جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔

اتھروید میں رسول کریم ﷺ کی بشارت:

کُنتاپ سوکت کا پہلا منتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک۔

ترجمہ: ''یہ سنو اے لوگو! ایک قابلِ تعریف تعریف کیا جائے گا۔ اے کورم ہم نے دشمنوں کے بیچ میں ساٹھ ہزار اور نوے ہزار لیے ہیں۔'' یہ ترجمہ پنڈت راجہ رام صاحب پروفیسر ڈی اے وی کالج نے کیا ہے۔

''اے لوگو! یہ احترام سے سنو لوگوں میں تعریف والا انسان تعریف کیا جائے گا۔ اسے زمین پر خوش خرامی کرنے والے بادشاہ آٹھ ہزار نوے دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے والے بہادروں میں ہم پاتے ہیں۔'' (اتھروید کانڈ 20 سوکت 127 منتر) یہ ترجمہ پنڈت کھیم کرن الہ آبادی نے کیا ہے۔

اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ آپ کا نام محمدؐ ہوگا۔

2۔ وہ شہزادۂ امن ہوگا۔

3۔ دشمنوں کی کثرت میں خدا اس کی حفاظت و صیانت کرے گا۔

یہ تینوں امور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

سام وید میں احمدؐ رسول اللہ کی بشارت:

ترجمہ: احمدؐ نے اپنے رب سے پُر حکمت شریعت کو حاصل کیا، میں سورج کی مانند (اس سے) روشن ہو رہا ہوں۔ (پرپاٹھک 2 کھنڈ 6 کا منتر 8)

اس بشارت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر ہے:

1۔ حضورؐ کا نام احمد ہے۔

2۔ آپؐ کو شریعت دیئے جانے کا ذکر ہے۔

3۔ شریعت کے ساتھ حکمت ملنے کا بھی اظہار ہے۔

4۔ اس بشارت کو دیکھتے وقت رشی آفتاب رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہے۔

تورات مقدس میں مثیل موسیٰ کی پیشگوئی:

موسیٰ کی پانچویں کتاب استثناء باب 18 آیات 17 تا 22 میں ملاحظہ کریں:

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبیؐ برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا، تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اور اگر تو۔۔۔۔ کہے میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی کچھ خداوند کے نام سے کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے پورا نہ ہو، یا واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ نبی نے گستاخی سے کہی تو اس

سے مت ڈر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نبی نے ایسا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ بشارت میں مذکور ہے اور یہودی برابر موسیٰ جیسے ایک نبی کی آمد کے منتظر چلے آتے تھے۔

چنانچہ یوحنا 1:19۔23 میں ہے کہ لوگوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے دریافت کیا کہ تو مسیح ہے تو اس نے کہا نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا تو ایلیاس ہے تو اس نے کہا نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کیا تو وہ نبی ہے تو اس نے کہا نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود کو ایک مسیح کی آمد کا انتظار تھا اور ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا۔ تیسرے کسی وہ ''نبی'' کا جس کی اس قدر شہرت تھی وہاں نام لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسیح اور الیاس کی دوبارہ آمد کے سوائے جو بشارت یہود میں مشہور تھی وہ صرف مثیل ہی کی تھی جو استثناء میں مذکور ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی انبیاء کے منتظر تھے، ایک مسیح کا ایک الیاس کی دوبارہ آمد کا ایک مثیل موسیٰ نبی کا۔ اب حضرت عیسیٰ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت یحیٰی الیاس کی دوبارہ آمد کے مصداق پائے مگر ''وہ نبی کے مثیل ہونے کا دعویٰ نہ حضرت مسیح نے کیا اور نہ حضرت یحیٰی علیہ السلام نے۔ ان کے بعد بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت ختم ہو جاتا ہے اور بنی اسماعیل میں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا اور مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمل 15:83) یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا ہے جیسا کہ فرعون کی طرف بھیجا۔

قرآن مجید نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں۔

دس ہزار قدوسیوں والی پیش گوئی:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔'' (استثناء 2:33)

سینا سے آنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے جو سینا سے نکلا۔ سعیر سے جس کے پاس بیت لحم اور ناصرہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام ظاہر ہوئے۔

وہ کون سا فاران ہے جس میں سے خدا ظاہر ہوا۔ جہاں سے مسیح کے بعد رسول نکلا۔ اس پر روشن شریعت نازل ہوئی۔ وہ کون سا دین ہے جو فاران سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ وہ مکہ کی وادی غیر ذی زرع ہے جہاں ایک امی نبی پر خدا کی آخری مقدس شریعت نازل ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔

دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے والا ایک ہی انسان دنیا کی تاریخ میں ہے یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو دس ہزار مقدس انسانوں کے ساتھ فاتحانہ شان میں مکہ میں داخل ہوئے۔

انجیل مقدس میں رسول کریم ؐ سے متعلق نوید احسن:

ایک اور تمثیل سنو: ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اسے چاروں طرف سے گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور برج بنایا اور اسے باغبانوں کو ٹھیکہ پر دے کر پردیس چلا گیا اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو

قتل کر دیا اور کسی کو سنگسار کیا، پھر اس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور انہوں نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ انہوں نے اس سے کہا: ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکے دار باغبانوں کو کر دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ (متی 21:33)

باغ لگانے والا خداوند بنی اسرائیل ہے۔ (یسعیاہ 5 باب، 2۔3)

انگور بنی اسرائیل کی قوم ہے (80 زبور۔9) انگورستان یروشلم ہے (غزل الغزلات 8 باب 13 یسعیاہ 5 باب 3۔5۔17) اور موسم پر ایک نوکر باغبانوں کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس انگور کے باغ کا پھل اس کو دیں لیکن باغبانوں نے اس کو پیٹ کے خالی ہاتھ پھیرا۔ دیکھو تفسیر یرمیاہ 27 باب 25، 28۔

پھر اس نے دوسرے نوکر کو بھیجا، انہوں نے اس کو پیٹ کر اور بے عزت کر کے خالی ہاتھ پھیرا۔ تفسیر: یہ شخص اوریا تھا۔ یرمیاہ 26 باب 23۔ یہ اس لیے کہ متی 21 باب 35 میں مار ڈالنا لکھا ہے پھر اس لیے تیسرے کو بھیجا انہوں نے اسے گھائل کر کے نکال دیا۔ تفسیر 2 تاریخ 24 باب 21۔ تب باغ کے مالک نے اپنے بیٹے (یہ مسیح ہیں) کو بھیجا شاید اسے دیکھ کر دب جائیں۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہی وارث ہے، اسے قتل کر کے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں اور اسے پکڑ کر باغ سے باہر نکالا اور قتل کر دیا۔

یہاں بیٹے سے مراد صلح کار کے ہیں۔ بیٹے کا لفظ کتب مقدسہ میں وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے۔ متی 5 باب 9 میں لکھا ہے، مبارک وے جو صلح کار ہیں کیونکہ خدا کے فرزند کہلائیں گے اور مسیح صلح کا شاہزادہ ہے۔

مار ڈالا سے مراد سخت ایذائیں ہیں۔

آخر کار باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انہوں نے اس سے کہا ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں گے۔

مالک خود آئے گا۔

بیٹے کے قتل کے بعد باغبانوں کو سزا دینے کے لیے مالک خود آئے گا۔ یعنی خدا خود آئے گا۔ اس سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آمد ہے۔ خدا کے آنے سے مراد وہ شخص کامل ہے جو الوہیت کا مظہر اتم ہے، اس میں تمام صفات الٰہیہ ظلی طور پر بدرجہ اتم پائی جائیں۔

باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا سے مراد یہ ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کو دے دی جائے گی۔ متی 31 باب 43 میں ہے۔ اس لیے میں تمہیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لاوے دی جائے گی۔

مذکورہ بالا انگورستان کی تمثیل کے بعد ایک اور تمثیل اس کی تشریح میں بیان کی:

''کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب ہے۔'' (مرقس 12:5، 11)

''جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے اسے پیس ڈالے گا۔'' (متی 21:44، 45)

''پھر وہ کیا ہے؟ جو لکھا ہے کہ وہ پتھر، جسے راج گیروں نے رد کیا وہی کونے کا سرا ہوا، ہر ایک جو اس پتھر پر گرے چور ہو گا اور جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔'' (لوقا 20:17۔18)

معماروں سے مراد بنی اسرائیل ہیں جو ہمیشہ اپنے بنی اسماعیل کو رد کرتے رہے۔ آخر کار ان میں سے نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ جو کونہ کا پتھر ہے جس سے نبوت کی عمارت کی تکمیل ہوئی۔

تمثیلی زبان میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ بیٹے کو صلیب دیئے جانے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اور مامور ظاہر ہو گا جو کونے کا پتھر کہلائے گا۔ عبری میں لفظ پنّہ ہے جو کونے کے پتھر کے معنی دیتا ہے لیکن لغت میں اس سے مراد شہر کی عمارت کی زمین کی حفاظت کے بُرج کا وہ محافظ پتھر ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ سلاطین دوم 14:13، یرمیاہ 31:40، سلاطین اوّل 7:34، ایوب 38:9، تواریخ دوم 28:24 اور 26:15 میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور صفنیاہ 3:6 میں قوموں کی حفاظت کا پتھر معنی دیتا ہے۔ ان معنوں کے علاوہ یہ سب کے سردار، سب پر حکمران اور سب کے محافظ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ (دیکھو یشوع 20:2، سموئیل 14:38، یسعیاہ 19:13، زکریا 10:4)

ان معنوں کی بناء پر کونے کا پتھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس نے تمام انبیاء علیہم السلام اور مذاہب کی تصدیق کی اور تمام کو من جانب اللہ قرار دیا۔

اس بشارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پتھر جس پر گرے گا وہ بھی چُور چُور ہو جائے گا اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ بھی چُور چُور ہو جائے گا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشارت بھی آپ ؐ کی ذات بابرکات سے پوری ہوتی کہ جنہوں نے آپ ؐ کے ساتھ مقابلہ کیا وہ بھی ہلاک ہوئے اور جن کے ساتھ آپ ؐ نے مقابلہ کیا وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے۔

احمد ؐ کی آمد کے متعلق بشارت:

حضرت مسیح ؑ نے اپنی جدائی کی خبر دیتے ہوئے اپنے غمگین حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

15۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں کو مدنظر رکھو۔

16۔ میں باپ سے دُعا کروں گا اور وہ تمہیں ایک دوسرا فارقلیط دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔

17۔ روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اسے نہیں دیکھتی اور نہ اسے جانتی ہے (مگر تم اسے پہچانو گے کیونکہ وہ تم میں ہمیشہ رہے گا)

18۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا، میں تمہارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب 14:15 تا 18)

مگر جب فارقلیط آئے گا جسے میں تمہارے پاس باپ کے پاس سے بھیج دوں گا۔ وہ حق جو باپ سے آئے گا وہ میری شہادت

دے گا۔ (یوحنا باب 15 آیت 26)

7۔ تاہم میں تمہیں سچ کہتا ہوں میرا جانا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا۔ اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

8۔ جب وہ آئے گا تو وہ دنیا کو گناہ، نیکی اور عدالت سے ملزم گردانے گا۔

9۔ گناہ سے اس لیے کہ انہوں نے مجھے نہیں مانا۔

10۔ صداقت سے اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے اب نہ دیکھو گے۔

11۔ عدالت سے اس لیے کہ دنیا کا سردار آزمایا جائے گا۔

12۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں، مگر تم میں ابھی ان کی برداشت نہیں۔

13۔ البتہ جب وہ روح حق آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی طرف رہنمائی کرے گی۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گی مگر جو کچھ وہ سنے گی وہی کہے گی اور وہ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی۔ (یوحنا باب 16، آیات 7-13)

لفظ فارقلیط پر بحث:

فارقلیط کا صحیح ترجمہ پیراکلیٹوس ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی احمد ہیں۔ سیل نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ عبرانی لفظ فارقلیط کے معنی احمد ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے انجیل برنباس میں تحریف کر کے پاراکلیٹ کو پری کلیوطاس بنا دیا ہے جس کے معنی ستودہ یعنی احمد ہیں۔

پس عیسائیوں کے اپنے اقرار کے مطابق فارقلیط کے معنی احمد ہیں جس کے متعلق مسیح نے اپنے بعد آنے کی بشارت دی تھی۔ فارقلیط والی بشارت کو پڑھ کر کئی نیک دل راہب دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

قرآن مجید میں بھی آتا ہے: وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (القف 6:61) ''اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ میں تصدیق کرتا ہوں تورات میں سے اس کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ ان کے پاس کھلے دلائل لے کر آ گیا تو انھوں نے کہا یہ ایک صریح جادو ہے۔''

انجیل یوحنا میں فارقلیط (احمد) سے متعلق جتنی نشانیاں بیان ہوئی ہیں وہ سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے پوری ہوتی ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بشارت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ اسلام دین موعود ہے جس کے متعلق تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام نے پیشگوئیاں کی تھیں تو اس سے منطقی طور پر حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں جن سے تمام مذاہب عالم میں دین اسلام کو ایک ارفع مقام حاصل ہو جاتا ہے:

1۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

2۔ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

3۔ دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین نہیں آئے گا۔

اسلام کی عالمگیریت:

جیسا کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتداء میں سب اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ پڑی ہوئی تھیں اور ان کی ذہنی و روحانی استعدادیں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ایک مکمل شریعت برداشت کر سکتیں۔ تو اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ ہر ایک قوم میں الگ الگ نبی آتے اور ان کی استعدادوں اور ضرورتوں کے مطابق الگ الگ شریعت لاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو نامکمل چھوڑ رہے ہیں۔ انجیل یوحنا 16:7، 8، 12، 13 میں لکھا ہے:

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آوے گا۔ مجھے تم سے اور باتیں بھی کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔''

یہ ضروری تھا کہ انسانی استعدادیں ارتقائی منازل طے کر کے بلوغت کو پہنچ جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ وہ مکمل شریعت کو برداشت کر سکیں، اور وہ وقت آجائے کہ تمام اقوام عالم آپس میں ملنا شروع کر دیں۔ تو یہ ضروری تھا کہ اس وقت ایک ایسا رسول آئے جو عالمگیر شریعت لائے، جو ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے ہوتا کہ اقوامِ عالم کی باہمی منافرت اور مغائرت دُور ہو کر ایک عالمگیر اخوت قائم ہو جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر نبی اپنی قوم سے یہ عہد لیتا کہ جب وہ موعود نبی عالمگیر شریعت لائے تو اس کو ضرور ماننا اور اس موعود نبی کی مدد کرنا۔ اگر ہر نبی اس موعود نبی کی بشارت نہ دیتا تو اس کی امت یہ عذر کر سکتی تھی کہ وہ اپنے قومی مذہب کو ترک نہیں کر سکتی۔

دنیا میں نہ کوئی ایسی کتاب ہے اور نہ مذہب جس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہو اسوائے اسلام کے، قرآن مجید میں آتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سباء 28:34) ''اور اے محمدؐ! ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔''

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف 158:7) ''اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ میں تم سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔''

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء 107:21) ''ہم نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

كان كل نبى يبعث الى قومه خاصة و بعثتُ الى كل احمر واسود (مسلم باب المساجد) ہر ایک نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مَیں تمام سرخ اور سیاہ اقوام کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

یہ آیات اور حدیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔

دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے:

دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی مقدس کتاب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، ارشاد الٰہی ہے:
اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ3:5)''آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے اور تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔''

اسلام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (الانعام38:6) یعنی نوع انسانی کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس میں بیان نہ ہوئی ہو۔ دوسری جگہ آتا ہے: فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (البینۃ3:98)

اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی اس قرآن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اوّل و آخرین جمع ہیں۔

دین اسلام کے بعد کوئی نیا دین اور نبی نہیں آئے گا:

دین اسلام کا کامل ہو جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سلسلہ نبوت ترقی اور ارتقاء کی تمام منازل طے کر چکا ہے، اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح اکمال دین خاتم نبوت ہے۔ نبوت کے ختم ہونے کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے: مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب40:33)''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبیین ہیں۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر ذیل کے ارشادات میں فرمائی ہے:

1۔ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ (میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

2۔ ان النبوۃ الرسالة قد انقطعت فلا نبی بعد ولا رسول۔ نبوت اور رسالت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، اب میرے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول۔

3۔ مثلی و مثل الانبیاء کمثل رجل بنٰی بیتًا فاحسنه واجمله الاموضع لبنة فجعل الناس یطوفون حوله ویتعجبون هلا و ضعت هذه اللبنة اناهذه اللبنة و انا خاتم النبیین۔ یعنی میرے اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا ہو اور اس کو ہر لحاظ سے خوبصورت کیا ہو، ہاں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو۔ لوگ اس مکان کے گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ آخری اینٹ کیوں نہیں لگائی۔ وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔''

قرآن مجید کے اوّل مفسر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہی مہبط وحی ہیں۔ جس آیت کی تفسیر آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہے وہ صحیح ہے اور اس کو نہ ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر لا نبی بعدی بیان کی ہے جس کے معنی ہیں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لَا نفی جنس کا ہے جس نے نبوت کے اجراء کی ہر لحاظ سے نفی کر دی ہے۔

یہ کہنا کہ بغیر شریعت کے نبی آ سکتا ہے، یہ نبوت کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ نبی میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جبرائیل علیہ السلام کا وحی نبوت لے کر اس پر نازل ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شریعت ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ کیونکہ وحی نبوت

احکام الٰہیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں نئے احکام الٰہیہ کے نازل ہونے کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ قرآن مجید دین اسلام کو اکمل قرار دیتا ہے۔

پس جو شخص نبوت کے جاری ہونے کا قائل ہے وہ دراصل اسلام کو کامل دین نہیں سمجھتا۔ پس دین اسلام کامل ہو چکا ہے۔ اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی راہنمائی یہ دین نہ کرتا ہو۔ اس دعویٰ اور اعلان کے ہوتے ہوئے اجرائے نبوت کا قائل ہونا، پھر مدعی نبوت کے ماننے کو جزو ایمان قرار دینا اور ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا نہایت ہی افسوس ناک اور نقصان دہ امر ہے۔ اجرائے نبوت کے عقیدہ سے صرف امت اسلامیہ کا اتحاد ہی پارہ پارہ نہیں ہوتا بلکہ اسلام کا ہی تختہ الٹ جاتا ہے۔

❀......❀......❀

قرآن مجید محفوظ کتاب نہیں، مستشرقین (قرآن مجید محفوظ کتاب ہے، اسلام)

اعتراض:

مستشرقین کی طرف سے اہم اعتراض یہ تھا اور ہے کہ قرآن مجید محفوظ کتاب نہیں۔ ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد کے صفحہ 555,557 پر لکھتا ہے ''قرآن کا اولین ایڈیشن ملت نے تسلیم نہ کیا موجودہ نسخہ نظر ثانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔

جب عیسائی مشنریوں پر تورات اور انجیل کے غیر محفوظ ہونے کا دلائل کے ساتھ اعتراض ہونے لگا تو انہوں نے جوابا قرآن مجید کے غیر محفوظ ہونے کا اعتراض عائد کر دیا۔ پادری رام چندر نے ایک کتاب ''تحریف القرآن'' کے نام سے لکھی۔ ایک فاضل مستشرق آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) نے جمع و تدوین قرآن کے متعلق مختلف احادیث جن میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کتاب شائع کر دی۔ جس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید ایک غیر محفوظ کتاب ہے۔

کتاب کا نام یہ ہے: "Materials for the History of the text of the Quran"

تدوین قرآن کے تین مرحلے ہیں: پہلا عہد نبویؐ، دوسرا عہد ابوبکرؓ، تیسرا عہد عثمانؓ۔

عہد نبوی:

مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید محفوظ کتاب ہے۔ اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہوئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر 15:9) ''بے شک ہم ہی نے ذکر (قرآن مجید) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں ہی احاطہ تحریر میں آ گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اسی وقت آپؐ کسی ایک کاتب وحی کو بلوا کر اس آیت کو اس کی جگہ لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح تمام کا تمام قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی لکھا گیا۔

لکھنے کا رواج اس زمانہ میں موجود تھا، جیسا کہ مشہور قصائد سبعہ معلقات لکھے گئے اور ان کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا۔ سر ولیم میور بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''لیکن اس بات کو ماننے کے لیے بہت زبردست وجوہ موجود ہیں کہ (حضرت) رسول (کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن شریف کے نسخے لکھے ہوئے صحابہ کے پاس موجود تھے۔ اور ان نسخوں میں سارا قرآن یا قریباً سارا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ (حضرت) محمد (مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے مکہ میں فن تحریر مروج تھا۔ اور مدینہ میں جا کر تو خود پیغمبر خدا (ﷺ) نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لیے کئی صحابہ مقرر کیے ہوئے تھے۔ جو لوگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے انہیں اس شرط پر وعدہ رہائی دیا گیا تھا کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھا دیں اور اگرچہ اہل مدینہ اہل مکہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے

لیکن وہاں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے۔ (لائف آف محمد کا دیباچہ از سر ولیم میور ص 28)

قرآن مجید کی اندرونی شہادت:

قرآن مجید کی اندرونی شہادت بھی اس امر پر موجود ہے کہ قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (بقرہ 2،1:2)
المص كِتَابٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔

اس طرح بے شمار آیات میں قرآن مجید کو کتاب کہا گیا ہے۔ کتاب کے معنی لکھے ہوئے کے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کو صحف بھی کہا گیا ہے صحیفہ کے معنی لکھے ہوئے کاغذ کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البینۃ) ''یعنی اللہ کا رسول مقدس اوراق پڑھ کر سناتا ہے جس میں مضبوط کتابیں ہیں۔''

اسی طرح دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (واقعہ 56:77-79) ''یہ بڑی قدر و منزلت والا قرآن ہے اس محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے اسے نہیں چھوتے مگر پاک لوگ۔''

اس آیت میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی بھی تحریف نہیں کر سکتا۔ دوم۔ قرآنی وحی ابتداء سے ہی احاطہ تحریر میں لائی گئی تبھی یہ کہا ہے اس کو پاک ہاتھ ہی مس کرتے ہیں۔ اگر یہ تحریر میں نہ آ چکی ہوتی تو چھونے کا مطلب ہی کیا۔ کیونکہ مس کے لیے خارج میں کسی شے کا ہونا ضروری ہے۔

اسلامی تاریخ میں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ اپنی ہمشیرہ کے گھر غصہ کے عالم میں پہنچتے ہیں کہ ان کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے تلوار کے ذریعے لقمہ اجل بنائیں تو وہاں حضرت خبابؓ موجود تھے جن کے پاس ایک جلد موجود تھی۔ جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔

قرآن مجید کے لکھے جانے کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن نے کہیں دس سورتوں کے بالمقابل دس سورتیں، کہیں تمام قرآن مجید کے مقابل پر ایک کتاب، کہیں ایک سورۃ کے مقابل پر ایک سورۃ بنانے کا تحدی سے چیلنج دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (ہود) ''یا ان کا یہ کہنا ہے کہ اس شخص نے قرآن مجید کو خود بنا لیا ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ۔''

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل 17:88) یعنی اے رسول ان لوگوں سے کہو کہ اگر آدمی اور جن اس قرآن جیسی کتاب بنانے کے لیے جمع ہو جائیں تو وہ اس قسم کی کتاب نہ بنا سکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

اسی طرح سورہ بقرہ کی آیات 23، 24 میں یہ چیلنج درج ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ''اور اگر تم اس کلام کے بارہ میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو اس کی مانند کی ایک سورت بنا لاؤ۔ اگر تم سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لاؤ، اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو دوزخ کی آگ سے ڈرو۔ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

یہ چیلنج مکی اور مدنی دونوں سورتوں میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس چیلنج کے وقت قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اگر لکھی ہوئی نہ ہوتیں تو یہ چیلنج بے سود تھا۔ بلکہ کفار بھی کہہ اٹھتے پہلے سورتیں تو دکھاؤ جن کا مقابلہ چاہتے ہو۔

حدیث کی شہادت:

قرآن مجید کی اپنی شہادت کے علاوہ اسلام کی سب سے مستند تاریخ سے جو حدیث کے نام سے موسوم ہے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینزل علیہ السور ذوات العدد فکان اذاانزل علیہ الشی دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھذا فی السورۃ التی یذکر فیھا کذاو کذا (مختصر کنز ص 48) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آپؐ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھنا جانتے تھے ان سب سے کسی کو آپؐ بلوا بھیجتے۔ اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورۃ میں لکھو جس میں فلاں فلاں آیتیں ہیں۔ ایک اور حدیث براء کی روایت سے ہے: قَالَ لَمَّا نَزَلَت لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُجَاھِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ النَّبِّی صَلّی اللّٰہ عَلَیہ وِسَلم اُدْعُ لِی زَیْدٌ اَوْلَیَجِی بِاللَّوحِ وَالدَّوَاۃِ وَالْکَتِفِ اَوْالْکَتف وَالدّاوۃِ ثُمَّ قَالَ اُکْتُبْ لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ (بخاری باب کاتب النبی ﷺ) یعنی جب آیت لَایستوی القاعدون نازل ہوئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زیدؓ کو میرے پاس بلاؤ اور کہو کہ وہ دوات اور تختی ساتھ لائے۔ پھر جب آن پہنچا تو اسے حکم دیا کہ لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْن کی آیت لکھو۔

ایسے ہی صحیح بخاری کے اسی باب میں ایک اور حدیث ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ کو مخاطب کر کے فرمایا اِنّک کُنْتَ تَکْتُبُ الْوَحْیَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ یعنی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتا تھا۔

حضرت زیدؓ کے علاوہ اور بھی کاتبین وحی تھے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن ابی سرح (جو مرتد ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے بعد دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا) زبیر بن عوام، حضرت خالد وابان ابنائے سعید، حضرت ابی بن کعب، حضرت حنظلہ بن الربیع، حضرت معیقب بن ابو فاطمہ، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت شرجیل بن حسنہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ۔ (فتح الباری جلد 9 صفحہ 19 باب کاتب وحی رسول اللہ)۔ ان کے علاوہ مشہور کاتب حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم تھے۔

کاتبان وحی کی تعداد 50 تا 70 بیان کی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض صحابہ کرام قرآن مجید میں اتنی گہری نظر رکھتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے صحابہ کرام کو فرمایا کہ ان سے قرآن سیکھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں جہاں مناقب انصار کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ چار صحابی ایسے ہیں کہ ان سے قرآن مجید سیکھو۔ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یادداشت (حافظہ) اور علم قرآن کی تصدیق کی تھی۔

کاتبوں کی تعداد اس وجہ سے زیادہ کی تھی کہ اگر کوئی کاتب کسی وقت دستیاب نہ ہو تو دوسرا اس مبارک کام کو سرانجام دے دے۔

عقد الفرید میں ابن عبدربہ نے حضرت حنظلہ بن ربیع کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے: اِنّ حَنْظلۃَ بْنَ رَبِیْعٍ کَان خَلِیْفَۃً کُلِّ کَاتِبٍ مِنْ کِتَابِہٖ عَلَیْہِ اَذَا غَابَ (عقد الفرید ج 2 صفحہ 144) یعنی حنظلہ بن ربیع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کاتبوں کے نائب

تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حنظلہ ؓ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تا کہ ضرورت پر بلایا جا سکے۔
ام المومنین ام سلمہؓ سے طبرانی کے حوالہ سے مجمع الزوائد میں یہ روایت ہیثمی نے نقل کی ہے: قَالَتْ کَانَ جِبْرَائِیلُ عَلَیْہِ السَّلامِ یُمْلِی عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رواہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ج 7 صفحہ 157) یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ جبرائیل کے سامنے ہی نازل شدہ آیات لکھوادی جاتی تھیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف لکھوادینے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ پڑھوا کر سنتے تھے۔حضرت زیدؓ کا بیان ہے فَاِنْ کَانَ فِیْہِ مَسْقَطٌ اَقَامَہٗ (مجمع الزوائد ج 1 صفحہ 60) اگر کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ جاتی تو اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے۔جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام دیا کرتے تھے۔
حضرت زیدؓ کے الفاظ ہیں ثُمَّ اَخْرَجَ بِہٖ اِلَی النَّاسِ یعنی کتابت و تصحیح وغیرہ کا سارا کام ختم ہو جانے کے بعد آیات کی اشاعت لوگوں میں ہوتی تھی۔

سرکاری نسخہ سے پھر آگے صحابہ کرام سے نقل کر لیا کرتے تھے۔اس طرح صحابہ کے پاس عام لکھے ہوئے نسخے موجود تھے۔ایک روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے۔زید بن ثابت فرماتے تھے: کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نُؤَلِّفُ الْقُرْاٰن من الرِّقَاعِ۔'ہم لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر رقاع (چرمی قطعات) میں قرآن لکھ لیا کرتے تھے'۔
اسی حدیث کو حاکم نے مستدرک جلد 2 میں جلال الدین سیوطی نے اتقان جلد 1 ص 81 میں ابن حجر نے فتح الباری میں نقل کیا ہے اور سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے اور صحیح ہے۔ذہبی نے بھی تلخیص مستدرک میں حاکم کی تائید کی ہے۔معلوم ہوا کہ سرکاری مکتوبہ نسخہ قرآن سے نقل کرنے کا عام رواج تھا۔صحابہ کے پاس لکھے ہوئے نسخے موجود تھے۔
اسی طرح بخاری کی ایک اور حدیث ہے: نُھِیْنَا اَنْ نُسَافِرَ بِالْقُرْاٰنِ اِلٰی اَرْضِ الْعَدُوِّ یعنی ہم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا کہ قرآن کو لے کر دشمن کے علاقے کی طرف نہ جایا کریں۔تا کہ کوئی بے حرمتی نہ ہو جائے۔اگر قرآن مجید لکھنے جانے کا رواج ہی نہ تھا تو ممانعت کیسی۔بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر صحابی کے پاس کچھ نہ کچھ حصہ قرآن لکھا ہوا موجود تھا۔
ایک اور حدیث ہے: قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْاٰنُ فِی الْعُسُبِ و الْقُضُمِ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے جب قرآن شریف کھجور کے پتوں اور کھالوں پر لکھا ہوا تھا۔
ایک اور حدیث ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن دیکھ کر پڑھنے کی تلقین فرمائی۔آپؐ فرماتے ہیں: اَعْطُوْا اَعْیُنَکُمْ حَظَّا مِنَ الْعِبَادَۃِ النَّظْرِ فِی الْمُصْحَفِ وَالتَّفَکُّرِ (جامع صغیر للسیوطی) اپنی آنکھوں کو عبادت سے بہرہ مند کرو۔وہ مصحف کو دیکھ کر پڑھنا اور اس پر تفکر کرنا ہے۔
صحابہ کرام اپنے گھروں میں مصحف رکھتے اور اس کو دیکھ کر تلاوت کرتے تھے۔حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے: اِذَا رَجَعَ اَحَدُکُمْ فَلْیَاتِ الْمُصْحِفَ فَلْیَفْتَحْہٗ وَلْیَقْرَاْفِیْہِ (منتخب کنز العمال) جب تم میں سے کوئی گھر واپس لوٹے تو سب سے پہلے مصحف کھولے اور پڑھے۔ایک اور حدیث ہے: بَیْنَ اَظْھُرِنَا الْمَصَاحِفُ وَقَدْ تَعَلَّمْنَا مَافِیْھَا وَعَلَّمْنَا ھا نساء نا وذَرَارِیْنَا وَخَدَمَنَا (مسند احمد) مصحف ہمارے درمیان لکھے ہوئے موجود تھے جن سے ہم نے خود دین سیکھا اور اپنے بچوں اور خادموں کو سکھایا۔
تاریخ اس بات پر شاہد ناطق ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی قرآن مجید احاطہ تحریر میں آچکا تھا جس کے نسخے تمام ریاست میں صحابہ کے پاس موجود تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں: جَمَعْتُ الْقُرْاٰنَ فَقَرَاْتُ كُلَّ لَيْلَةٍ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِقْرَاهُ فِي شَهْرٍ (مسند احمد) میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی سارا قرآن جمع کر ڈالا تھا اور رات بھر میں ختم کر دیا کرتا تھا۔ آپ ؐ کو علم ہوا تو فرمایا ایک ماہ میں ختم کیا کرو۔

ان حوالہ جات سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں ہی لکھا جا چکا تھا جہاں اتنی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن آپ ؐ کی زندگی میں ہی لکھا جا چکا تھا وہاں ایک شہادت بھی موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ قرآن آپ ؐ کی زندگی میں نہیں لکھا گیا۔ ان احادیث کا تمام دفتر ثابت کرتا ہے کہ کتاب قرآن کو تواتر اور قطعیت کا درجہ حاصل ہے۔

مکی زندگی میں قرآن مجید نبطی خط میں لکھا جاتا تھا۔ نبطی شمالی عرب کی ایک قوم تھی جس نے تحریر میں مہارت حاصل کی تھی اور خط ایجاد کیا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو یہاں خط حمیری کا رواج تھا۔ یہ خط نسبتاً ترقی یافتہ تھا۔ مدینہ میں کاتبین وحی حمیری خط سے مانوس تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جن چیزوں سے کام لیا جاتا تھا حسب ذیل ہیں:

عسیب:

کھجور کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے اس حصہ کو شاخ سے الگ کر لیا جاتا تھا پھر ان کو خشک کر کے ان پر لکھا جاتا تھا۔

لخعہ:

ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔

کتف:

اونٹ یا بکری کے مونڈھے کے پاس کی گول اور چوڑی ہڈی کو کہتے ہیں۔

ادیم:

باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا ہے اس سے خیمے وغیرہ بھی تیار ہوتے تھے۔

قتب:

اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی چھوٹی تختیاں استعمال ہوتی تھیں ان کو کہتے ہیں۔

رقاع:

رقعہ کی جمع ہے۔ یہ کاغذ یا چمڑے کا ٹکڑا ہوتا تھا جس پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کی روایت بخاری میں ہے: كُنَّا نُؤَلِّفُ الْقُرْاٰنَ مِنَ الرِّقَاعِ فِي زَمَنِ النَّبِيِّ کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید رقاع سے جمع کرتے تھے۔

مکی عہد میں مکتوبہ قرآن اپنی حفاظت میں رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد ابتدائی زمانہ میں مسجد نبویؐ کے ستون کے ساتھ اس مصحف کو

ایک صندوق میں مقفل رکھا جاتا تھا تاکہ حفظ کرنے والے اپنے شبہات کو دیکھ کر دور کرلیں۔ بعد میں حضرت حفصہؓ کے پاس رکھ دیا گیا۔

حفظ یاد کرنا:

کسی کتاب کی حفاظت کا دوسرا ذریعہ حفظ یاد کرنا ہے۔ قرآن کو عہد رسالت میں ہی بے شمار حفاظ نے اپنے سینہ میں محفوظ کرلیا تھا۔ یہ بات صرف احادیث سے ثابت نہیں بلکہ قرآن مجید خود اس کی گواہی دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ یہ قرآن مجید کی وہ کھلی کھلی آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی صحابہ کرام سارا قرآن حفظ کرچکے تھے۔ صحابہ کرام قرآنی آیات کو اپنی زندگی کی غذا سمجھتے تھے۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ فوراً یاد کرلیتے تھے۔ وہ آیات کے نزول کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو حفظ قرآن کا بہت شوق دلاتے تھے۔ بخاری میں حدیث آتی ہے: عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ یعنی حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہی ہے جو قرآن کو سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔

بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث ہے: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَأُ اَلْقُرْاٰنَ يَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ یعنی حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کے ماہران فرشتوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو بہت عزت والے اور بزرگ ہیں اور جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور نہایت مشکل سے اس کے حروف ادا کرتا ہے تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفظ قرآن کے ترغیب دلانے کی وجہ سے بے شمار لوگوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا۔ اس کی شہادت اس بات سے ہوتی ہے کہ جنگ یمامہ میں ستر حفاظ صحابہ شہید ہوئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بئر معونہ کے قریب بھی کئی حفاظ قرآن کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

صاحب فتح الباری نے لفظ قرا کے یہ معنی کیے ہیں: الذین اشتھروا بحفظ القرآن والتصدی تعلیمہ یعنی وہ لوگ جو قرآن کو حفظ کرنے اور دوسروں کو سکھانے میں مشہور تھے۔

ابوعبیدہ نے کتاب الفہرست میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو حضرات قرأ تھے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

مہاجرین میں سے چاروں خلفاء:، طلحہؓ، سعدؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، سالمؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن السائبؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، اور حضرت ام سلمہؓ انصار میں سے عبادہ بن صامتؓ، معاذ جن کی کنیت ابوحلیمہ تھی، مجمع بن جاریہؓ، فضالہ بن عبیدؓ اور مسلمہ بن مخلد۔

ابن ابی داؤد نے اُن صحابہ میں سے جو قاری تھے تمیم الداریؓ اور عقبہ بن عامرؓ کو بھی شامل کیا ہے۔

ابوموسیٰ اشعریؓ نے بھی قرآن کو اپنے سینہ میں محفوظ کرلیا تھا۔ اسی طرح ابی بن کعب، ابوالدرداء اور زید بن ثابتؓ مشہور قرأ میں سے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسجد نبوی کے سات ہی صفہ مدرسہ تھا۔ جہاں صحابہ قرآن حفظ کیا کرتے تھے پھر انہی میں سے تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہ میں سے ساتھ حضرات نے خصوصی شہرت پائی تھی۔ ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔ عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ۔
پہلے مرحلے یعنی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو طبعی طریقوں یعنی کتابت اور حفظ سے قرآن مجید کو کما حقہ محفوظ کرلیا گیا تھا۔

دوسرا مرحلہ (عہد صدیقی):

قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدوّن ہو چکا تھا اور بے شمار حفاظ کے صدور میں محفوظ تھا۔ بے شمار افراد کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے۔ امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفہ اول ابوبکرؓ کے زمانہ میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں لوگوں کے پاس کثرت سے قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے نہ ہوں۔ اور حضرت عمر کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الملل والنحل)
عہد صدیقی میں کتابی صورت میں ایک مستند نسخہ مرتب کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی جب حفاظ لڑائیوں میں کثرت سے شہید ہو رہے تھے تو قرآن مجید لکھا ہوا موجود تھا لیکن اس کے اجزا منتشر تھے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا۔ بخاری میں زید بن ثابت سے روایت ہے:
''مجھے ابوبکرؓ نے جنگ یمامہ کے بعد بلوایا میں آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ عمر بن الخطاب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے قراء شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ محسوس ہوا ہے کہ اگر اسی طرح دوسری لڑائیوں میں قراء شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ تو میں نے عمرؓ کو جواب دیا کہ ہم اس کام کو کس طرح انجام دیں جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ تو عمر نے کہا، خدا کی قسم یہ نہایت ضروری اور بہتر کام ہے۔ اور عمر مجھ سے اس معاملہ میں اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو عمر کی تھی۔
حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ابوبکر نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا ''تم جوان اور زیرک ہو ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے نیز تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کاتب وحی تھے۔ لہٰذا تم پورے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگ جاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو مجھ پر اس قدر گراں نہ گزرتا جتنا قرآن کے جمع کرنے کی ذمہ داری کا بار گراں، جس کا انہوں نے حکم دیا۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا جس کے لیے اس نے ابوبکر اور عمر کے سینوں کو کھول دیا تھا۔ چنانچہ قرآن کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے اور پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا۔ البتہ یہ سورۃ توبہ کا آخری حصہ مجھے صرف ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس سے ملا اور ان کے سوا کسی اور کے پاس سے وہ مجھے نہ ملا۔ یعنی لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ختم سورۃ براءۃ تک۔
پس یہ صحیفے ابوبکرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے۔ پھر وہ عمرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے۔ پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

کے پاس آگیے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ پہلے شخص تھے جس نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کیا۔''

حضرت ابوبکرؓ کے اہتمام سے تدوین قرآن کا کام ایک سال کی مدت میں تکمیل پایا۔ حضرت زید بن ثابت نے قرآن مجید کو کس طرح کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کی ٹہنیوں، پتھر کی سلوں، چمڑے کے ٹکڑے اور کجاوہ کی لکڑی سے جمع کیا حضرت علیؓ فرماتے ہیں: حضرت زیدؓ بن ثابت نے قرآن کا جو نسخہ کتابی شکل میں تیار کیا وہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا۔ جب آپ نے وفات پائی تو وہ نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس آ گیا۔ آپؓ کی شہادت کے بعد یہ صحیفہ ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمر کی تحویل میں آ گیا۔ (البرہان ج 1 ص 239)

حضرت ابوبکر کے جمع کردہ قرآن مجید پر پوری امت مسلمہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اس کو تواتر کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے جمع کردہ قرآن اور عہد رسالت میں مرتب قرآن کے درمیان کامل یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

کمیٹی کی تشکیل اور شرائط تدوین:

جب یہ طے پا گیا کہ قرآن مجید کی کتابی شکل میں تدوین ضروری ہے۔ تو پھر حسب دستور مجلس مشاورت بلائی گئی جس میں تقریباً پچیس تیس حضرات نے شرکت کی۔ جن کے اسماء کتب تاریخ اور حدیث میں موجود ہیں۔ ان میں چاروں خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ مذکورہ سات افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک یہ شرط عائد کی جب یہ ساتوں حفاظ جس آیت پر متفق ہو جائیں اس کے ساتھ ان کے پاس قرآنی آیات کے جتنے تحریری ذخائر موجود ہوں جو حضورؐ کے سامنے عرضہ میں پیش ہو چکے ہوں اور حضورؐ نے ان کو منظور اور مستند قرار دے دیا ہو۔ ان کی تحریری ذخائر میں موجودگی کے ساتھ اس آیت کی اپنے اپنے طور پر سب حفاظ تصدیق کریں۔ اس طرح ایک ایک آیت پر چودہ چودہ گواہیاں ہو جاتی تھیں۔ یعنی ان ساتوں ارکان کی اپنی اپنی یادداشت کی بنیاد پر زبانی گواہیاں پھر ان ساتوں حضرات کے تحریری ذخائر میں سے دستاویزی گواہیاں پھر ان سب گواہیوں کے بعد بھی ہر آیت پر مزید دو گواہیاں کمیٹی کے باہر سے لی جائیں۔ ہر آیت پر کوئی دو صحابی یہ گواہی دیں کہ اس آیت کو ہم نے اسی طرح سنا ہے اور ہمیں اس طرح یاد ہے۔ پھر ہر آیت کی تائید میں دو دو تحریری نوشتے لائے جائیں اور ہر نوشتے کی دو دو صحابی آکر گواہی دیں۔ جب یہ سارا عمل مکمل ہو جائے تو اس کے بعد قرآن کی اس آیت کو صحیفہ میں لکھا جائے۔

ان شرائط کے ساتھ تدوین قرآن میں کسی تحریف و تبدل کا امکان نہیں رہتا۔ یہ مقدس کام خدا کے گھر میں بیٹھ کر کیا گیا تاکہ سب لوگوں کے سامنے یہ کام انجام پائے اور حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے حضرت عمرؓ بھی گواہیوں کے وقت کمیٹی میں شامل ہو جاتے تھے۔

الغرض ہر آیت پر دو دو گواہیاں زبانی اور دو دو گواہیاں تحریری لی گئیں۔ ساتوں حفاظ کی اپنی اپنی تحریری اور زبانی گواہیوں کے ساتھ سرکاری صحیفہ مرتب ہوا۔

کمیٹی کی تشکیل:

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی باہمی مشاورت اور رضامندی کے بعد، حضرت ابوبکرؓ نے ایک بڑی مجلس مشاورت طلب کی۔ وہاں سے بھی منظوری کے بعد سات اشخاص کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس کے ارکان چاروں خلفاء

کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت سالم مولی ابن حذیفہ رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ شرائط مقرر کیں کہ ارکان مجلس اپنی اپنی یادداشت اور اپنے اپنے سابقہ نوشتہ قرآن کی شہادت کے بعد ہر ایک آیت پر دو، دو صحابیوں کی گواہی لی جائے۔ کہ ہم نے اسی طرح آیات سنیں اور ہمیں اسی طرح یاد ہے۔ اسی طرح ہر آیت کی تائید میں دو دو تحریری نوشتے لائے جائیں اور ہر نوشتے کی دو دو صحابی گواہی دیں۔ جب یہ سارا عمل مکمل ہو جائے تب وہ آیات سرکاری مدونہ قرآن میں لکھی جائیں۔ ان شرائط کے ساتھ تدوین قرآن میں کسی تحریف وتبدل کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ پھر یہ مقدس کام مسجد میں بیٹھ کر کیا گیا۔ تاکہ تدوین کے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہر وقت دامن گیر رہے کہ اس مقدس کام میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرنی۔ دوم، عوام کے سامنے یہ کام کیا جائے۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ چند آدمیوں نے مل کر کسی گھر میں یہ کام کر لیا ہے۔

حضرت عمرؓ خصوصاً گواہیوں کے وقت اجلاس میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ تب جا کر قرآن مجید تقریباً ایک سال کے دوران مدون ہوا۔ قرآن مجید کی تدوین کے دوران ہر ایک آیت پر شرائط کے مطابق دو، دو صحابی دستیاب ہو گئے۔ صرف سورۃ توبہ کی آخری دو آیات: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ سے لے کر سورت کے ختم تک شرائط کے مطابق دو صحابی ایک وثیقہ پر دستیاب نہ ہوئے۔ جب کہ ارکان مجلس مطمئن تھے کہ یہ قرآن مجید کی ہی آیات ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پڑھی جاتی تھیں۔ کمیٹی سے باہر کے دو صحابہ کرام نے بھی آ کر شہادت دے دی کہ یہ دونوں آیات سورۃ توبہ کے آخر کی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ توبہ کے آخر میں لکھوایا تھا۔ دو وثیقے بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک تحریری وثیقہ کی شہادت دینے کے لیے گواہ بھی آ گئے لیکن ایک وثیقہ ایسا تھا جس کا صرف ایک گواہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ دوسرا گواہ بھی لاؤ۔ لیکن دوسرا گواہ دستیاب نہ ہوا۔

مدینہ اور ارد گرد کی بستیوں میں اس وثیقہ کی دوسری شہادت لینے کے لیے اعلان کیا گیا۔ لیکن دو گواہیاں میسر نہ آئیں۔ آخر کار ایک انصاری صحابی حضرت خزیمہؓ بن ثابت نے گواہی دی۔ اور آیت کو شامل قرآن کر لیا گیا۔ حضرت خذیمہؓ ابن ثابت کی صرف ایک گواہی پر اس آیت کو اس لیے شامل کیا گیا کہ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ کے متعلق ایک موقع پر فرمایا تھا کہ حضرت خزیمہؓ کی گواہی دو اشخاص کے برابر مانی جائے۔

اس طرح پورے حزم واحتیاط کے ساتھ قرآن مجید کا ایک مستند اور سرکاری نسخہ مرتب ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جن اصحاب کو کمیٹی کے ارکان کے طور پر منتخب کیا تھا وہ اپنی قرآن دانی اور قرأت کے لحاظ سے مشہور تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' چار صحابہ سے قرآن سیکھو یعنی عبداللہ بن مسعود، سالم مولی ابن حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم۔ (بخاری ج 6 صفحہ 186)

تیسرا مرحلہ (عہد عثمانی):

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہولت کے لیے عرب کے ہر قبیلہ کو اپنے اپنے لہجہ اور رسم الخط میں پڑھنے اور لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عہد عثمانی میں اختلاف قرأت کی وجہ سے نومسلم عجمیوں میں ایک فتنہ سا کھڑا ہو گیا تھا۔ حضرت امام بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے:

'' حذیفہؓ بن الیمان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ارمینیہ کی فتح میں اہل شام کے ساتھ اور آذربائیجان

کی فتح میں اہل عراق کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تھی ۔ وہاں ان دونوں علاقوں کے مسلمانوں کا قرأت قرآن میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے ۔ پس جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو کہا اے امیر المومنین! اس امت کی خبر لیجئے قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں اس طرح اختلاف کرنے لگیں جس طرح یہود اور نصاریٰ نے اختلاف کیا۔ تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس صحیفے ارسال کر دیں تاکہ اس کی نقلیں مصاحف میں کر لیں ۔ پھر آپ کو اصل صحیفے واپس کر دیں گے ۔ تو حضرت حفصہؓ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیج دیا اور حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارث رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا۔ حضرت عثمان نے (زید بن ثابت کے سوا بقیہ) تینوں قریش اصحاب سے کہا کہ جب تم لوگ اور زید بن ثابت قرآن کے کسی لفظ میں اختلاف کرو تو اس کو لغت قریش میں لکھنا کیونکہ قرآن انہیں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب اصل مسودات مصاحف میں نقل کر لیے گئے ۔ تو حضرت عثمانؓ نے اصل صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور جو مصاحف نقل کرائے تھے ان میں ایک ایک نسخہ مملکت کے ہر علاقے میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہے جلا دیا جائے ۔ حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ جس وقت ہم مصحف لکھ رہے تھے تو سورہ احزاب کی ایک آیت (اصل صحیفوں) میں نہ ملی جسے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ تو ہم نے اس کو تلاش کی تو خزیمہ بن ثابتؓ انصاری کے پاس لکھا ہوا پایا۔ وہ آیت "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" تھی۔ چنانچہ ہم نے اس کو اسی سورۃ میں مصحف میں شامل کر لیا۔" (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن باب دوم وسوم)

اختلاف قرأت کی وجہ سے صرف حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ ہی نہیں گھبرائے تھے اور صرف انہوں نے ہی صرف اس طرف توجہ نہ دلائی تھی بلکہ عام صحابہ بھی اختلاف قرأت کی وجہ سے پریشان تھے ۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں جہاں ابو قلابہ کی روایت کردہ حدیث ذکر کی ہے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک معلم ایک طرح پڑھاتا اور دوسرا دوسری طرح ۔ جب ان کے شاگرد باہم ملتے تو مختلف طریقوں سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ معلمین تک پہنچا اور وہ غلط قرأت کی بناء پر ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ جب حضرت عثمانؓ ان اختلافات سے آگاہ ہوئے تو ایک خطبہ میں فرمایا:

"جب تم میرے پاس ہوتے ہوئے باہم اختلاف کرتے اور قرآن کریم کو غلط طریقہ سے پڑھتے ہو تو جو لوگ مجھ سے دور دراز شہروں میں رہتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا؟ اے اصحاب محمدؐ! اکٹھے ہو کر لوگوں کے لیے قرآن کا ایک نسخہ مرتب کر دو۔" (تفسیر ابن جریر طبری ج 1 صفحہ 21) چنانچہ حضرت عثمان کے ارشاد کے تحت 25ھ میں ان چاروں صحابہ نے کام شروع کر دیا اور چاروں حافظ قرآن تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مرتب کردہ صحیفہ کے مطابق چھ یا سات نسخے مرتب کیے ۔ جو سلطنت کے مختلف صوبوں میں بھجوا دیے گئے اور یہ حکم دیا گیا ان نسخوں کے علاوہ جن حضرات کے پاس نسخے ہیں ان کو جلا دیا جائے ۔ تاکہ مستقبل میں کسی وقت بھی امت میں افتراق پیدا نہ ہو۔ کیونکہ مختلف صحیفے عرب کے مختلف قبائل کے لہجے میں بھی مرتب ہوئے تھے ۔ وہ مختلف لہجوں میں لکھے ہوئے نسخے امت کے لیے ضرر رساں ہو سکتے تھے ۔ اس خدمت کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جامع القرآن کا لقب دیا گیا۔ کہ آپ نے تمام امت کو قرآن مجید کی ایک قرأت (قریش) پر جمع کیا۔ جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔

عہد عثمانؓ میں دو مصحف مشہور تھے ۔ مصحف ابی بن کعب اور مصحف عبداللہ بن مسعود ۔ ان دو کے علاوہ بھی قرآن مجید کے نسخے

موجود تھے۔ چنانچہ ابن الندیم نے ''الفہرست'' میں، ابن ابی داؤد اور ابن اشتہ نے اپنی اپنی ''المصاحف'' میں ان نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے اس اقدام کو صحابہ کرام نے بنظر استحسان دیکھا۔ البتہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس اقدام کو ناپسند کیا۔ نسخہ جلانے سے انکار کیا۔ بعد ازاں ترغیب اور دلائل سے قائل کر لیے گئے اور ان کا نسخہ بھی جلا دیا گیا۔ اس طرح قرآن مجید کی تحریف و تبدل کے تمام امکانی دروازے بند کر دیے گئے۔

ذاتی مصاحف کو جلا دینے کے سرکاری حکم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں متن کے ساتھ رسول کریم ﷺ کے بیان کردہ معانی بھی درج تھے۔ بعد میں یہ اختلاف اٹھ سکتا تھا کہ آیا وہ معانی جو رسول کریم صلعم نے بتائے تھے اور نسخہ میں متن کے ساتھ شامل کر دیے گئے تھے قرآن کا حصہ ہیں یا کہ نہیں۔

حضرت عثمان نے قرآن مجید جلانے کا حکم صحابہ کے مشورہ سے دیا تھا اور حضرت علیؓ نے جلانے کے عمل کو پسندیدگی سے دیکھا تھا۔ حضرت سوید بن غفلہ کا قول ہے: ''حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ عثمانؓ کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو۔ آپؓ نے مصاحف کے بارے میں جو کچھ کیا ہمارے مشورہ کے مطابق اور ہماری موجودگی میں کیا۔'' (الاتقان ج 1 ص 103)

معترضین کی ایک غلط فہمی کا جواب:

بعض معترضین نے قرآن مجید کو محرف و مبدل ثابت کرنے کے لیے بعض شیعہ حضرات کے اس اعتراض کا سہارا لیتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اہل بیت کے بارے میں جو آیات تھیں اصل نسخہ قرآن سے حذف کر دی تھیں۔

اوّل بات تو یہ ہے کہ تمام اکابرین شیعہ اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید تحریف و تبدل سے پاک ہے۔ چنانچہ شیخ صدوق ابو جعفر محمد بن علی بابویہ اپنے رسالہ عقائد میں فرماتے ہیں جو قرآن کہ اللہ نے حضرت کو دیا تھا وہی ہے کہ جو لوگوں کے پاس موجود ہے نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے نہ زیادہ۔''

تفسیر مجمع البیان میں سید مرتضی جو شیعہ کے مسلم علماء میں سے ہیں یوں لکھتے ہیں کہ جو قرآن عہد پیغمبر میں تھا اب بھی وہی بلا تفاوت ہے۔''

قاضی نوراللہ شوستری اپنی کتاب مصائب النواصب میں لکھتے ہیں کہ یہ بات جو شیعہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تبدل و تغیر کے قائل ہیں محض غلط ہے۔ محققین شیعہ میں سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں اور جو کوئی ہو بھی تو اس کا اعتبار نہیں۔ یہ اعتراض اس وجہ سے بھی بیہودہ اور لغو اور بلا دلیل ہے کہ وہ صحابہ جو قرآن مجید کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے، جس کی خاطر انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو قربان کیا۔ وہ کیوں کر برداشت کر سکتے تھے کہ قرآن مجید میں تحریف و تبدل کیا جائے۔ اگر اس قسم کی جسارت کسی خلیفہ کی طرف سے کی جاتی تو تمام صحابہ نے مل کر تحریف و تبدل کرنے والے خلیفہ کو معزول کر دینا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی کوئی آواز بلند نہ ہوئی اور نہ تاریخ میں کوئی ریکارڈ ہے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا دور خلافت آیا انہوں نے بھی حضرت عثمانؓ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا کہ انہوں نے رسول کریمؐ کے قرآن کو بدلا ہے اور نہ خارج شدہ آیات والا قرآن شائع کرایا بلکہ ان کے تمام عمل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

غیر مسلموں کی شہادتیں:

سرولیم میور اپنی تصنیف ''لائف آف محمدؐ'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے: ''اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں حضرت محمد (ﷺ) نے اسے دنیا میں پیش کیا تھا۔ (دیباچہ لائف آف محمد ص 25)

''نیو یونیورسل انسائیکلو پیڈیا'' میں ''قرآن'' کے عنوان سے مقالہ درج ہے۔ اس میں لکھا ہے ''یہ کتاب پیغمبر محمد (ﷺ) پر ان کی زندگی کے آخری تیئس سال میں اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے۔ بہ خلاف اس کے جو مجموعہ کلام رسول (ﷺ) ہے یعنی قرآن پیغمبر کی زندگی میں ہی اور انہی کی زیر ہدایت و نگرانی ضبط تحریر میں آ گیا تھا اور ان کے صحابیوں نے اسے حفظ یاد کر لیا تھا۔ اور یہ معمول آج تک جاری ہے۔ چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں بغیر کسی غلطی کے۔ اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آ گئے ہیں اور یہ کہ آخری اور نا قابل تغیر کتاب ہے۔ نیز یہ کہ نوع انسان کے لیے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام یعنی دین فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دین ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے۔ اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا مسلم ہے۔

جرمن کے مشہور مستشرق نولڈ یکی نے لکھا ہے:

''یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ثابت کریں وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا، بری ٹانیکا زیر لفظ قرآن)

مشہور مستشرق وگ ہرشفیلڈ اپنی کتاب:

"New Researches into the Composition and exegeses of the Quran."

میں لکھتا ہے: ''عہد حاضر کے نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زیدؓ نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جسے محمد (صلعم) نے (لکھا کر) دیا تھا۔

سرجان ہیمرٹن کے زیر اہتمام یونیورسل انسائیکلو پیڈیا شائع ہوا تھا۔ اس میں قرآن کے عنوان سے جو مقالہ درج ہے اس میں تحریر ہے: ''اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا مسلّم ہے۔''

مشہور مستشرق برونس مارگریٹ (Baroness Margorate) قرآن مجید کے متعلق لکھتا ہے: ''اگرچہ تمام مذہبی صحائف اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں تاہم صرف قرآن ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردوبدل نہیں ہوا اور وہ اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔''

خلاصہ کلام:

1۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی قرآن کی کتابت کا بندوبست کاتبین وحی کے ذریعے کیا ہوا تھا۔ یہ بات مسلمہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے۔

2۔ قرآن مجید کو لکھا جانے کی وجہ سے ہی لفظ کتاب کے نام سے پکارا گیا ہے۔

3۔ قرآن مجید کو لکھنے والے نیک، فرشتہ سیرت کاتبین تھے۔

4۔ عہد نبوی میں ہی قرآن مجید کے نسخے مسلمانوں کے گھروں میں موجود تھے۔
5۔ مسلمان دن رات قرآن مجید کی تلاوت قرآن مجید کے نسخے کو دیکھ کر کرتے تھے۔
6۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بے شمار حفاظ قرآن تھے۔ یہ بات بھی مسلمہ تاریخی شہادتوں سے واضح ہے۔
7۔ عہد ابو بکرؓ میں حضرت رسول کریم صلعم کے دور کے مکتوبہ اجزائے قرآنی کو حفاظ کی مدد سے کتابی شکل دی گئی۔
8۔ مرتبین نے پورے حزم واحتیاط کے ساتھ قرآن مجید کو مرتب کیا۔
9۔ عہد عثمانی میں قریشی لغت پر قرآن مجید کو مرتب کیا گیا۔
10۔ مروجہ قرآن پر ابتداء سے تمام امت کو اتفاق ہے کہ یہ بغیر ردو بدل کے مدون کیا گیا ہے۔
11۔ شیعہ علماء بھی قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر شاہد ہیں۔
12۔ حق پسند مستشرق اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ قرآن مجید ایک محفوظ کتاب ہے۔

لہٰذا معترضین کا یہ اعتراض کہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں ہے اور اس میں ردو بدل کیا گیا ہے سراسر غلط ہے۔

سبعہ احرف یا اختلاف قرأت کی وضاحت

قرآن مجید کی عدم حفاظت کا اشتباہ یا اعتراض سبعہ احرف یا اختلاف قرأت کے سبب پیدا ہوا۔اس وجہ سے سبعہ احرف کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔سبعہ احرف والی حدیث تواتر کا درجہ رکھتی ہے۔اس وجہ سے اس حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

احرف سے مراد:

احرف حرف کی جمع ہے۔حرف کے معنی عربی لغت میں بعض عرب قبائل کی محض زبان یا محاورہ یا طرز ادا کو کہتے ہیں۔تاج العروس میں حدیث کے ان الفاظ ''انزل القران علی سبة احرف'' کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ای **علی سبع لغات من لغات العرب** یعنی قرآن کریم عرب کی لغتوں میں سے سات لغات پر نازل ہوا۔بعض دوسری لغات کی کتب میں بھی طرز ادا کے معنی لکھے گئے ہیں۔

عام قاعدہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لہجہ اور تلفظ میں فرق پڑ جاتا ہے۔اس طبعی قاعدہ کی رو سے عرب کے مختلف قبائل کے لہجہ اور تلفظ میں فرق تھا۔مثلاً بنوتمیم ''ہمزہ ابتداء'' کو ''عین'' کردیتے تھے۔جیسے اسلم کو عسلم، بنوقضاعہ ''ی'' کو ''ج'' کردیتے تھے تمیمی کو تمیج بولتے تھے بنوسعد ''ع'' کو ''ن'' بولتے تھے ''اعطی'' کو ''انطی''۔قریش کی زبان میں یائے مضارع کو فتحہ یا ضمہ ہوتا ہے ان کے علاوہ دیگر قبائل کسرہ کردیتے تھے مثلاً یَفْعَلُ، یِفْعَلُ۔چنانچہ ابن خلدون اس اختلاف کے متعلق لکھتا ہے: ''قرأت کے اختلافات قرآن کے تواتر میں مطلق خلل انداز نہیں ہوسکتے کیونکہ ان اختلافات کا مرجع کیفیت ادائے حروف تھا۔''

کسی کے لیے یک لخت اپنے تلفظ اور لہجہ کو چھوڑ کر دوسرا تلفظ اور لہجہ اپنانا مشکل ہے۔اس مشکل کو دور کرنے کے لیے عارضی طور پر سبعہ احرف میں قرآن مجید کے پڑھنے کی اجازت دے دی۔جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے: **و نقل ابو شامہ عن بعض شیوخ انه قال انزل القران اوّلاً بلسان قریش و من جاورھم من العرب الفصحاء ثم ابیح للعرب ان یقرء ہ بلغاتھم الّتی جرت عادتھم باستعمالھا علی اختلافھم فی الالفاظ والاعراب و لم یکلف احد منھم الانتقال من لغته الی لغته اخری للمشقة وَلما کان فیھم من الحمیة ولطلب تسھیل فھم المراد کل ذالك مع اتفاق المعنی**۔یعنی ابوشامہ نے ایک بزرگ سے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اول قرآن کا نزول زبان قریش میں اور فصیح عربوں کی زبان میں ہوا تھا۔جو ان کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔پھر دوسری عرب قوموں کے لیے یہ اجازت دی گئی کہ اسے اپنی لغت یعنی محاورہ میں جس کے استعمال کے وہ شروع سے عادی تھے پڑھ لیا کریں۔ان کے الفاظ اور اعراب میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو بھی مجبور نہ کیا گیا کہ وہ اپنے محاورہ کو چھوڑ کر دوسرے محاورہ کو اختیار کریں۔اس لیے کہ ایسا کرنا ان کے لیے گراں اور دشوار تھا۔ان میں اپنے اپنے محاوروں کے لیے حمیت تھی۔اور اس سے معنوں کے سمجھنے میں بھی بہت آسانی تھی یہ سب کچھ اتفاق معنی کے ساتھ ہوا۔''

اگر احادیث کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اجازت محض آسانی پیدا کرنے کے لیے تھی۔

سات حروف میں قرآن مجید پڑھنے کی وجہ سے جو اختلاف قرأت پیدا ہوا تھا وہ جزو قرآن نہ تھا۔ بلکہ وہ عارضی اور وقتی طور پر تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں جب یہ اختلاف نومسلم عجمیوں کے لیے فتنہ کا موجب ہوا تو آپ نے ان تمام نسخوں کو تلف کرنے کا حکم دیا تھا جو قریش کی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں لکھے ہوئے تھے اور اس قرآن کی نقلیں کر کے جو ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں قریش کی زبان میں مرتب کیا گیا تھا باہر کے علاقوں میں بھیجیں اور حکم دیا کہ آئندہ لوگ قریش کی زبان میں ہی تلاوت قرآن کیا کریں تا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی عارضی اور وقتی اجازت کے انکار کا موجب نہ بنے۔

عہد عثمانی میں مرتبہ شدہ چار نسخے دنیا میں موجود ہیں۔

نوٹ: صحابہ نے ایک تو قریش کے لہجے کے علاوہ دوسرے لہجوں میں قرآن مجید لکھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے قرآن مجید کے الفاظ کے ہجوں میں فرق تھا۔ اور یہ طبعی فرق لازمی تھا۔ دوم صحابہ کرام قرآن مجید کے متن کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے الفاظ کے معنی بھی اپنی یادداشت کے لیے لکھ لیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر عائشہ صدیقہؓ کی یہ عادت تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کے جس لفظ کا معنی سیکھتیں اسے اپنے نسخہ کے حاشیہ پر لکھ لیا کرتی تھیں مثلاً قرآن مجید کی آیت **حَافِظُوْا علیَ الصلوات والصلوة الوسطی** میں **صلاة وسطی** سے **صلوة العصر** مراد ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت **وقومو اللّٰہِ قانتین** لکھی تھی۔ ان دونوں کے درمیان انہوں نے صلوۃ العصر کے الفاظ لکھ رکھے تھے۔ اسی طرح مصحف عبداللہ بن عباس میں بھی الصلوٰۃ الوسطی کے ساتھ صلوۃ العصر کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ مستقبل میں متن اور حاشیہ کا التباس ہو جاتا۔ اس وجہ سے حضرت عثمانؓ نے تمام صحابہ کے مشورہ سے سرکاری مرتب شدہ نسخہ کے علاوہ تمام مصاحف کو جلا دینے کا حکم دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل نسخہ قرآن تو وہی تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں احاطہ تحریر میں آ چکا تھا۔ دوم حفاظ کے صدور میں بھی محفوظ تھا۔ اس نسخہ کو حضرت ابوبکرؓ بڑی احتیاط سے دوبارہ تحریر میں لائے۔ پھر اسی نسخہ کو حضرت عثمانؓ کے عہد میں قریش کی زبان میں مرتب کر کے رائج کیا۔ گویا عہد نبویؐ کا ہی نسخہ تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

امام ابن ابی داؤد نے ایک مستقل باب میں صحابہ کے مختلف تحریر شدہ نسخوں کے اختلافات کو اجاگر کیا ہے۔ انہی اختلافات کو دیکھ کر معترضین نے قرآن مجید کی عدم حفاظت پر اعتراض کیا ہے۔ وہ قرآن قریش کی زبان کے علاوہ دوسرے قبائل کے ہجوں اور لہجوں میں لکھے گئے تھے وہ محض عارضی وقت کے لیے تھے۔ عرب لہجہ (ہجہ) کے اختلاف کے باوجود صحیح حقیقت سے واقف تھے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہولت کی خاطر اجازت دے رکھی تھی۔ جب عجمی فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو وہ قبائل کے اس اختلاف سے ناواقف تھے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے ایک فتنہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ نے عہد نبویؐ میں مرتب شدہ قرآن کی ترویج کر دی۔ بقیہ تمام ذاتی مصاحف کو جلا دینے کا حکم دیا۔ یہ حکم تمام اکابر صحابہ کے مشورہ سے کیا گیا تھا۔

علماء کرام نے سبعہ احرف کی مختلف توجیہات کی ہیں، میں نے لہجوں میں تبدیلی مراد لی ہے اور اسی مفہوم کو سامنے رکھ کر معترضین کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔

❀……❀……❀

نظم قرآن

قرآن مجید ایک بے ربط کتاب ہے (مستشرقین)

قرآن مجید ایک منظم کتاب ہے (اسلام)

اعتراض:

مستشرقین کا ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید ایک بے ربط پر تکان، گنجلک اور پُر پیچ ہے''

"The omas Carlyle: On Heros, Hero worship and the Heroic in History " PP 64,65

جواب:

مفسرین نے الفاظ وکلمات کی ترتیب کے لیے اصطلاح نظم آیات کی باہمی ترتیب کے لیے تناسب اور سورتوں کی باہمی ترتیب و ربط کے لیے نظام کی اصطلاحیں مقرر کیں۔ الفاظ وکلمات کی ترتیب، آیات کا باہمی ربط اور سورتوں کا باہمی تعلق ایک دقیق، مشکل اور اہم موضوع قرآن ہے۔ اور علماء نے اس پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

مجھے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن مجید ایک منظم کتاب ہے۔ قرآن مجید تقریباً تیئس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں منشائے الٰہی کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ آپؐ کاتبین وحی کو بلا کر خدا کی ہدایت کے مطابق جس سورت کی آیت ہوتی وہاں لکھوا دیتے۔ اس طرح قرآن مجید آپ کی زندگی میں الٰہی ترتیب کے ساتھ جمع ہو گیا۔ قرآن مجید ایک منظم کتاب ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اندرونی اور بیرونی شہادتیں تحریر کی جاتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر تمام شکوک وشبہات رفع ہو جائیں گے۔

اندرونی شہادتیں:

اندرونی شہادت سے مراد ایک آیت سے دوسری آیت کا اور ایک سورت کا دوسری سورت سے ربط اور تعلق ہے۔ اگر تعصب کو بالائے طاق رکھ کر قرآن مجید کا گہری سوچ بچار کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کی ہر ایک آیت اور سورۃ ایسی منظم اور موزوں طور پر مرتب ہے کہ اس سے بہتر کوئی ترتیب نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر چند ایک آیات اور سورتوں کا باہمی تعلق بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○

پہلی تین آیات میں چار صفات کا ذکر ہے ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت۔ ان چاروں صفات کا تعلق طبعی ہے۔ ربوبیت کا اقتضاء یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دے کر اس کو کمال تک پہنچائے۔ امام راغب نے رب

کے یہ معنی بیان کیے ہیں نشو ونما اور تکمیل کے جن اسباب کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام اسباب صفت رحمانیت کے تحت پیدا کیے ہیں۔ مثلاً کائنات میں انسانی ضرورت کے لیے ہر چیز کا پیدا کرنا پھر روحانی ربوبیت کے بعد صفت رحمانیت کا لانا طبعی امر تھا۔ پھر ان سامانوں اور اسباب کو استعمال میں لانے کی تحریک صفت رحیمیت کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ سو صفت رحمانیت کے بعد صفت رحیمیت کو لایا گیا۔ اس کے بعد مالکیت کی صفت بیان کی یعنی جو ان اسباب کو اپنی تکمیل کے لیے استعمال کرے گا وہ کامیاب زندگی بسر کرے گا۔ جو استعمال نہ کرے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

پس ربوبیت تکمیل کائنات کا تقاضا کرتی ہے اور صفت رحمانیت اس تکمیل کے لیے اسباب قبل از وجود مہیا کرتی ہے۔ صفت رحیمیت ان اسباب سے متمتع ہونے کی تحریک کرتی ہے اور صفت مالکیت یہ چاہتی ہے جو ان اسباب کا صحیح استعمال کرے گا وہ ثمرات حسنہ سے ہم کنار ہوگا۔ جو ان کی خلاف ورزی کرے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

رموز قرآن کا جاننے والا جان سکتا ہے کہ ان صفات میں کس طرح ایک طبعی لگاؤ ہے اور ان کا طبعی مقام وہی ہے جہاں وہ بیان ہوئی ہیں۔

چوتھی آیت میں رشتہ عبودیت کا اقرار ہے یعنی خدا کے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے صحیح فائدہ اٹھانا خدا کی عبودیت اور استعانت میں مضمر ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم سامانوں کا غلط استعمال کر کے تباہی و بربادی کے گڑھے میں جا گرتی ہے۔

آخری تین آیات میں تکمیل کے حصول کا طریقہ بتایا ہے کہ انسان صراط مستقیم پر گامزن رہے اور افراط اور تفریط سے بچے کیونکہ افراط اور تفریط ہی ہلاکت کا باعث ہے۔ غیر المغضوب علیھم میں تفریط سے بچنے کی ہدایت اور الضالین سے افراط سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ پس سورۃ فاتحہ میں الحمد للّٰہ رب العالمین سے لے کر الضالین تک تمام آیات مربوط اور منظم دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ایک آیت کو دوسری آیت سے آگے پیچھے رکھ دیا جائے تو تمام مضمون ہی بگڑ جائے گا۔ اس طریقہ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک زنجیر کی طرح مربوط اور منظم ہیں۔ ہر لفظ اور ہر آیت اپنی اپنی جگہ پر ایک جامع اور مکمل مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے ولم یجعل له عوجا یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کی کجی نہیں۔

اس کے بعد اگر سورتوں کے ربط پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی ایک نہایت گہرا تعلق نظر آئے گا۔ اگر قرآن مجید کی تمام سورتوں کا باہمی تعلق بیان کیا جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا۔ صرف چند ایک سورتوں کا باہمی تعلق کو بیان کیا جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ کا سورہ فاتحہ سے تعلق:

سورہ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تو سورۃ بقرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥ (یہ وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں یہ اور متقیوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے)۔ گویا یہ اسی دعا کا جواب ہے اور بتا گیا ہے کہ قرآن مجید ہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر چل کر انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس سورۃ میں منعم علیھم اور مغضوب علیھم کا ذکر تفصیل کے ساتھ اور ضالین کا ذکر مجمل طور پر بیان ہوا ہے۔

سورۃ بقرہ کا سورۃ آل عمران کے ساتھ تعلق:

سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کا تعلق نہایت گہرا ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق ان دونوں کو الزھراوان کے نام سے

پکارا ہے۔

سورۃ بقرہ میں جو باتیں مجمل طور پر بیان ہوئی ہیں وہ سورۃ آل عمران میں مفصل ہیں اور جو آل عمران میں مفصل ہیں وہ سورہ بقرہ میں مجمل ہیں۔ سورۃ بقرہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ شروع کیا ہے جو پہلے نبی ہیں۔ آل عمران کو حضرت عیسٰی کے ساتھ شروع کیا ہے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ دونوں سورتوں کی ابتداء اور انتہاء میں ایک تعلق نظر آتا ہے۔ سورۃ بقرہ کے آغاز میں اصول کامیابی بیان ہوئے ہیں تو آل عمران کا خاتمہ بھی تفلحون پر ہوتا ہے۔ گویا دونوں کا ایک ہی عمود اور ایک ہی مضمون ہے۔ دوسری طرف اگر سورۃ بقرہ کا خاتمہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ پر کیا ہے تو آل عمران کی ابتداء ایک ایسی قوم سے ہوتی ہے جس کے ساتھ اسلام کا سب سے بڑھ کر مقابلہ ہونا تھا یعنی نصاریٰ۔

مزید مطالعہ کے لیے امام جلال الدین سیوطی، امام رازی، زمخشری، مولانا امین اصلاحی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حمید الدین فراہی کی تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے تو قاری پر واضح ہو جائے گا کہ قرآن مجید پر غیر منظم اور بے ربط ہونے کا اعتراض بے جا اور مبنی بر تعصب اور جہالت ہے۔

خارجی دلائل از روئے قرآن:

قرآن مجید خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظم قرآن وحی الٰہی کے تحت کیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o (القیامۃ: 17-18) یعنی ہمارے ذمہ اس کو جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے پس جب ہم اس کو پڑھیں تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔

ان آیات میں قرآن مجید کے متعلق دو باتوں کا ذکر ہے۔ اوّل قرآن کا جمع کرنا دوم اس کا پڑھنا۔ یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں قرآن مجید کا پڑھنا بذریعہ وحی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچانا۔ اس کے جمع کرنے میں قرآن مجید کو ایک ترتیب میں لانا مراد ہے۔ کیونکہ بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآن کریم نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے سے کی اور نہ کوئی اسے تبدیل کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ نظم اور ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔ اسی لیے آپؐ ہر آیت اور ہر سورۃ کے متعلق خود حکم دیتے تھے کہ اسے فلاں موقع پر رکھو۔ دوسری آیت جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی سے ہوئی ارشاد الٰہی ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان) ''اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس پر قرآن سارا ایک دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔ اس لیے کہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اسے ترتیب احسن کے ساتھ مرتب کیا۔''

ترتیل کے معنی میں تالیف بھی شامل ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے: رتل القران احسن تالیفه و ابانه وتمهل فیه یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کھول کر اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا۔

خارجی شواہد از روئے حدیث:

احادیث صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہدایت فرما دیتے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ رکھ دو۔

عن ابن عباس قال قال عثمان ابن عفان رضی اللہ عنھما کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا نزل

علیہ شیء دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھولاء الایات فی سورۃ التی یذکر فیھا کذا و کذافاذا نزلت علیہ ایۃ فیقول ضعوا ھذہ الایۃ فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا کذا (ترمذی وابوداؤد بحوالہ مشکوۃ ابواب فضائل القرآن) یعنی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب آیات نازل ہوتی تھیں تو کاتبانِ وحی کو ارشاد فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھ دو۔ وہ اگر ایک آیت اُترتی تو پھر بھی یہی فرماتے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھ دو۔

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وحی الٰہی کے تحت مناسب جگہ لکھوا دیتے تھے۔ اگر قرآن مجید میں کوئی خاص ترتیب نظم و ربط نہ ہوتا تو پھر کیوں کاتب وحی کو خاص جگہ پر رکھنے کا ارشاد فرماتے۔ آپ ترتیب نزولی ہی رہنے دیتے لیکن ایسا نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولی ترتیب اور ہے اور موجود قرآن کی منظم ترتیب اور ہے۔

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سورتوں کی مقررہ آیات کی تلاوت کا ارشاد فرمایا۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی خاص ترتیب اور نظم نہیں تھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سورتوں کی آیات کا تعین کیسے فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ حضرت امام بخاری نے باب فضل سورۃ البقر کے ضمن میں ایک حدیث بیان کی ہے: عن ابی مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قرأ بالا یتین من آخر سورۃ البقر فی لیلۃ کفتاہ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی رات کو سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں تلاوت کرے گا تو یہ اس کے لیے کافی ہیں۔

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کے نظم کی نگہداشت فرماتے تھے جس کو سب صحابہ کرام جانتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات کا تعین کیسے فرماتے۔ جب کہ کوئی خاص ترتیب ہی نہیں تھی۔

اسی طرح اس حدیث کی تائید میں دوسری حدیث یوں بیان ہوئی ہے۔ کہ سورۃ بقرہ کی یہ آیت اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ سے شروع ہو کر آخر سورۃ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ تک پڑھے۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورۃ بقرہ کی آخری یہی دو آیات تھیں۔ آج بھی سورۃ بقرہ انہی دو آیات پر ختم ہوتی ہے جن پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ختم ہوتی تھی۔

ایسا ہی ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ خروج دجال میں سورۃ الکہف کی دس آیات پڑھنے کا ارشاد فرمایا۔ حدیث ہے عن ابی الدرداء قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم من حفظ عشر آیات من اول الکھف عصم من الدجال یعنی ابو درداء سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سورہ کہف کی پہلی دس آیات یاد کیں وہ فتنہ دجال سے بچ جائے گا۔

غور کا مقام ہے اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی خاص ترتیب و نظم نہیں تھا تو فتنہ دجال کے متعلق جو کسی آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا اس سے بچاؤ کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیسے سورۃ کہف کی پہلی دس آیات کا

ذکر فرمایا۔

اس طرح احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے بعض صحابہ نے سورتیں سیکھی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ کے دہن مبارک سے ستر سورتیں سیکھی تھیں۔ ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ کے عہد میں ہی سورتوں اور آیات کی ترتیب تھی۔ اگر کوئی ترتیب و نظم نہ ہوتا تو ان سورتوں کا تعین کیسے ہو سکتا تھا۔

عقلی شواہد:

قرآن مجید میں الگ الگ سورتوں کا قائم کیا جانا اس بات پر ثبوت ہے کہ قرآن مجید میں ایک نظم ترتیب و ربط ہے، اگر قرآن مجید ایک غیر منظم کتاب ہوتی تو یہ الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ اگر سورتوں کے مضامین الگ الگ نہ ہوتے تو سورتوں کو موجودہ تقسیم میں محدود نہ کیا جاتا بلکہ جس طرح آیات نازل ہوتی رہتیں اسی طرح ان کو جمع کر لیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قرآن مجید کی تاریخ جاننے والا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ سب سے پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ نازل ہوئی۔ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے سورۃ علق کی پہلی آیت ہے اور یہی سورۃ علق آخری سپارہ میں چھیانویں نمبر کی سورت ہے۔ نزول کے لحاظ سے تو آیت اقراء سے قرآن کا آغاز ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں۔

پس جب ایسا نہیں کیا گیا بلکہ الگ الگ سورتیں قائم کی گئیں۔ جن میں کوئی بڑی ہے اور کوئی چھوٹی کوئی پہلے نازل ہو رہی ہے کوئی بعد میں۔ تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہر سورۃ کے مضامین الگ الگ ہیں پھر ہر سورۃ کا مضمون موجودہ ترتیب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

قرآن مجید کے منظم ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنی فصاحت و بلاغت اور نادرہ مضامین کی وجہ سے اعلیٰ کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور پھر اس کی مثل بنالانے کا چیلنج کیا ہے۔ جو کلام نظم و ترتیب سے خالی ہو وہ اعلیٰ کلام کیسے ہو سکتا ہے کہ پورا کلام بالکل بے معنی ہوگا۔

قرآن مجید نے جہاں کہیں بھی چیلنج دیا ہے وہاں عربوں سے اپنی مثل ایک کتاب یا دس سورتیں یا کم سے کم ایک سورۃ پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے کم کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے کم میں حسن نظم اور نادرہ مضمون واقع نہیں ہو سکتا۔

دراصل نظم و ترتیب ہی قرآن مجید کی اصل جان و روح ہے اور یہ نظم و ترتیب وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزولی ترتیب سے ہٹ کر وحی الٰہی کے تحت موجودہ ترتیب دی ہے۔

کائنات سے شہادت:

کائنات خدا کا فعل ہے اور قرآن مجید خدا کا قول۔ خدا کے قول اور فعل میں مخالفت اور تضاد نہیں ہو سکتا۔ قول، فعل کا تابع ہوتا ہے۔ اور فعل قول کا، جب ہم خدا کے فعل کو دیکھتے ہیں تو بظاہر یہاں بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے مثلاً کسی جگہ پہاڑ ہیں اور وہیں سے دریا نکل رہے ہیں، کہیں میدان نظر آ رہے ہیں، کہیں درختوں کے جھنڈ اُگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہیں ریت کے ٹیلے ابھرے ہوئے ہیں۔ یہ سب بظاہر بے ترتیبی کیوں؟ لیکن ایک سائنس دان ہی بتا سکتا ہے کہ جو جو چیز جہاں کھڑی کی گئی ہے وہیں اس کی ضرورت تھی۔ اس کو خدائے علیم و حکیم کی ترتیب ابلغ و محکم کہتے ہیں۔ ہر چیز اپنی

ضرورت کے موقع پر موجود ہو۔ جس طرح کائنات میں بظاہر بے ترتیب نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں وہاں ایک ترتیب ابلغ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا جاننے والا ہی بتا سکتا ہے۔ یہاں ایک ایسی ترتیب ہے اس کے علاوہ اور کوئی ترتیب نہیں ہو سکتی۔

کسی دعوئ کو ثابت کرنے کے لیے دو قسم کے شواہد اور دلائل ہوتے ہیں۔ سالبہ اور مثبتہ۔

سالبہ یعنی اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ ہو۔ مثبتہ اس کے حق میں زبردست شواہد وار دلائل موجود ہوں۔

قرآن مجید کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں اس قسم کی شہادت موجود نہیں جس سے یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن مجید میں آیات یا سورتوں میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا ہو۔ اس کے علاوہ مثبتہ دلائل کی بھرمار ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی حکم کے مطابق ترتیب دی اور وہی ترتیب آج تک موجود ہے۔

نظم قرآن کی تلاش ایک بہت مشکل کام ہے اس وجہ سے اس موضوع پر بہت کم کتب لکھی گئی ہیں ان میں سے چند ایک مصنفین کی کتب اور خیالات درج کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین اپنے مطالعہ میں مزید اضافہ کر سکیں۔ علامہ سیوطی اتقان جلد دوم میں لکھتے ہیں ''علامہ ابو جعفر بن زبیر شیخ ابو حبان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی ہے اس کا نام البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن'' رکھا۔ ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر ''نظم الدرر فی تناسب الای والسور'' بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔

علامہ سیوطی نے خود بھی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اس کا نام ''اسرار التنزیل'' ہے۔ اس میں وجوہ اعجاز اور بلاغت کے اسالیب کا بیان بھی شامل ہے۔ علامہ نے اس کتاب سے خلاصہ کر کے سورتوں کی مناسبات کو ایک الگ رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس کا نام ''تناسق الدرر فی تناسب السور'' ہے۔

امام فخر الدین رازی نے بھی اپنی تفسیر میں کثرت سے مناسبات کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ قرآن شریف کے اکثر مطالب اس کی ترتیبوں اور روابط میں ودیعت کیے گئے ہیں۔

ابن العربی کتاب ''سراج المریدین'' میں بیان کرتے ہیں ''قرآن کی آیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ یوں ربط دینا کہ وہ سب مل کر ایک باہم مناسب رکھنے والے الفاظ اور مسلسل معانی کا ایک مجموعہ مرتب کلام اور ایک کلمہ معلوم ہونے لگے نہایت شریف اور عظیم علم ہے۔ (الاتقان حصہ دوم صفحہ 325 اردو ایڈیشن)

علامہ مخدوم مہائمی ؒ نے بھی اپنے ذوق کے مطابق اپنی تفسیر ''تبصیر الرحمان وتیسیر المنان'' میں آیات کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ ولی الدین ملوی نے نظم قرآن سے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ''جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم تلاش نہیں کرنا چاہیے ان کو دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات جستہ جستہ ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں گہری حکمت ملحوظ ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز عالم دین اور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ ''دلائل النظام'' کے نام سے لکھا ہے۔ افسوس وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ مولانا کی تفسیر کے کچھ اجزاء اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد رشید اور پاکستان کے معروف عالم دین اور

مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی گراں مایہ تفسیر ''تدبر قرآن'' جو نو جلدوں میں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اس میں بھی انہوں نے نظم قرآن کو بطور اساسی عنصر کے پیش کیا ہے۔ مولانا فراہی کے تفسیری اصولوں کو مولانا اصلاحی نے آگے نقل کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے نظم قرآن کے حوالے سے ایسا گراں قدر کام کیا ہے کہ شاید عرب وعجم میں کہیں بھی اس مقدار اور معیار میں کام نہیں ہوا۔ تاہم ان کے کام کو تکمیل کے مراحل تک مولانا اصلاحیؒ نے پہنچایا ہے۔ نظم قرآن کے حوالے سے مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کا کام بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں نہایت ہی گہرا تعلق اور مناسبت ہے۔

سورتوں کے خواتم اور مقاطع میں بھی وہ مناسبت ہے جس نے فصحاء و بلغاء کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس موضوع پر بھی بے شمار کتب لکھی گئی ہیں جن میں سے سیوطی کی تصنیف ''مراصد المطالع فی تناسب القاطع والمطالع'' اور علامہ کرمانیؒ کی کتاب ''عجائب'' نہایت ہی عمدہ ہیں۔

قرآن مجید کے مربوط اور منظم کلام ہونے کی سب سے بڑی دلیل ''اعجاز قرآن'' ہے۔ نزول وقت عرب میں بڑے بڑے فصحاء و بلغاء موجود تھے۔ قرآن نے بڑی تحدی کے ساتھ اس کی مثل ایک سورۃ، دس سورتیں یا اس جیسی کتاب لانے کا چیلنج کیا۔ لیکن کوئی بھی اس کی مانند نہ کوئی سورۃ لایا نہ کوئی دس سورتیں لایا اور نہ اس جیسی کتاب لایا۔ بے ربط اور غیر منظم کتاب کبھی اعجاز نہیں ہوتی۔ لہٰذا عرب بلغاء کی عاجزی ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تمام عرب اس کتاب کو مربوط اور منظم ہی سمجھتے تھے اور یہ چیلنج آج تک موجود ہے۔ معترضین پہلے چیلنج تو قبول کریں اور اس کی مانند کوئی کتاب تو بنا کر لائیں۔ جب دور حاضر کے فصحاء بھی اس کی مانند کوئی سورۃ بنا کر نہ لا سکیں۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن اپنے نظم و ربط کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے۔

❀......❀......❀

انشقاق قمر

اعتراض:

محمد صاحب نے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دونوں آستینوں سے نکال دیا سو یہ امر قانون قدرت کے برخلاف ہے۔ (لالہ مُر لی دھر ڈرائنگ ماسٹر) یہ اعتراض صرف ہندوؤں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے بھی عموماً کیا جاتا ہے۔ اس معجزہ کو خلاف عقل اور خلاف قانون قدرت قرار دیا ہے۔

جواب:

انشقاق قمر کی تین توجیہات ہیں۔

پہلی توجیہہ:

قرآن مجید میں آتا ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (قمر 1:54) گھڑی قریب ہے اور چاند پھٹ گیا۔

شق قمر کے معجزہ میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ وہ گھڑی قریب آرہی ہے کہ جب رؤسا کفار کی قوت پاش پاش ہو جائے گی جیسا کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے ظاہر ہے۔ یہاں الساعۃ سے مراد قیامت کبری نہیں بلکہ ساعۃ وسطی مراد ہے یعنی عدوان اسلام کی ہلاکت کی گھڑی۔ جیسا کہ سورہ قمر سے پچھلی سورت نجم کے آخر پر اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (النجم 57:53) سے مراد بھی ساعت وسطی ہے یعنی مخالفین اسلام کی تباہی کی گھڑی۔ ساعۃ سے یہ مراد قرآن مجید اور احادیث سے واضح ہے جیسا کہ اسی سورت قمر میں آیت بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (القمر 46:54) یعنی بلکہ (موعودہ گھڑی کا وقت مقررہ ہے اور وہ گھڑی بہت مصیبت والی اور تلخ ہے) میں لفظ الساعۃ سے مراد کفار کی تباہی کی گھڑی ہے کیونکہ حدیث بخاری میں آتا ہے کہ غزوہ بدر کے دن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے دعا کر کے باہر نکلے تو آپ پڑھ رہے تھے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔ اور اسی لڑائی میں کفار کی جمعیت نے شکست کھائی اور اپنے بڑے بڑے روساء کو میدان کارزار میں مقتولین کو چھوڑ گئے۔

حضرت عمرؓ، قتادہ، عکرمہ، اور ابن عباس سے بھی یہی روایت ہے کہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ یوم بدر کے متعلق ہے۔

ان روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کو غزوہ بدر پر چسپاں کیا ہے۔ اس لیے الساعۃ سے مراد یقیناً قریش کی ساعۃ وسطی یعنی ان کی ہلاکت و بربادی کی گھڑی ہے نہ کہ قیامت کبری۔

قمر سے مراد اہل عرب بڑے آدمی بھی مراد لیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کا رویاء ہے کہ ان کے حجرہ میں تین قمر (چاند) گرے ہیں۔ بعد کے واقعات نے یہ بتایا تھا کہ ان تین اقمار سے مراد حضرت رسول کریم (فداہ ابی وامی) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ جن کا مدفن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مبارک ہے۔

پس اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے مراد قریش کی تباہی کی گھڑی ہے۔ اس آیت کریمہ کے بعد کا مضمون بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے اور سورہ قمر سے پچھلی سورۃ نجم کا مضمون بھی اس امر پر دال ہے۔

دوسری توجیہہ:

انشقاق قمر کا وقوع خلاف قانون قدرت نہیں اور انشقاق قمر کا وقوع خلاف سنت اللہ بھی نہیں۔ کسی قانون قدرت نے کوئی فیصلہ نہیں دیا کہ اجرام ساوی میں کوئی بڑے بڑے تغیرات نمودار نہیں ہوتے رہتے بلکہ قانون قدرت کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ آخر زمین پر جو بڑے بڑے پہاڑ بنے تو کیا یہ بغیر کسی تغیر عظیم کے ہی بن گئے اور خود سورج میں تغیر و انقلاب آتے رہتے ہیں اور بعض اوقات بڑے بڑے داغ نمودار ہو جاتے ہیں تو یہ کون سی بعید بات ہے کہ کوئی عظیم الشان تغیر چاند کے اندر نمودار ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوت اعجازی کے اظہار کے لیے یہ تغیر کفار کو بھی دکھا دیا تھا۔ جو آپؐ سے نشان طلب کرتے تھے۔ قرآن کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کفار نے وہ نشان دیکھا (وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً) لیکن نشان دیکھ کر بجائے اس کے حق قبول کرتے انہوں نے آپ کو جادوگر کہنا شروع کر دیا۔ (وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (کہتے ہیں یہ زبردست جادو ہے)۔

غلط فہمی کا ازالہ:

معترض نے جو یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ایک ٹکڑا ایک آستین سے دوسرا ٹکڑا دوسری آستین سے گزر گیا۔ یہ محض ڈھکوسلا، افتراء اور کذب ہے۔ اسلام کی کسی مستند روایت سے یہ ثابت نہیں۔ یہ ایک من گھڑت افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چاند کے دو الگ الگ ٹکڑے ہونا سب روایات میں نہیں بعض روایات میں ہے اور ان میں باہم اختلاف ہے۔ پس انشقاق قمر سے مراد چاند میں کوئی تغیر کا پیدا ہونا ہے۔ یہ تغیر اجرام میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔

تیسری توجیہہ:

انشقاق قمر سے مراد چاند گرہن بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں لگا تھا۔ اسی وجہ سے بعض بزرگوں نے انشقاق قمر سے مراد چاند گرہن لیا ہے اور وہ گرہن نصف چاند کا تھا یعنی نصف حصہ تاریک ہو گیا اور نصف روشن رہا۔ روایات میں تاریک اور روشن حصوں کو دو ٹکڑے قرار دے دیا ہے۔

❀......❀......❀
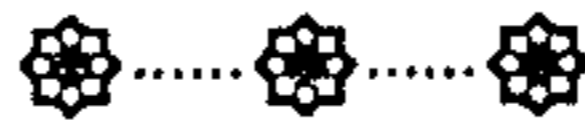
عربی زبان میں قرآن کیوں نازل کیا گیا

اعتراض:

یہ بات بھی قابل غور بات ہے کہ جس کتاب میں متعصبانہ باتیں پائی جائیں وہ کلام اللہ نہیں ہوسکتی مثلاً عربی میں قرآن نازل کرنے سے صرف باشندگان عرب کے لیے اس کا پڑھنا آسان اور غیر ملک والوں کے لیے مشکل ہے۔ اور اس سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے اگر خدا دنیا کے سب ملکوں کے آدمیوں کے واسطے انصاف کی نظر سے قرآن کو ایسی زبان میں نازل کرتا جو اور ممالک کی زبانوں سے علیحدہ سنسکرت زبان کی طرح کہ جس میں ویدنازل کیے سب ممالک کے لیے یکساں کوشش سے حاصل ہونے والی ہوتی تو یہ اعتراض ہرگز نہ ہوتا۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 4)

جواب:

قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے یہ بتایا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف نبی آتے رہے ہیں اور ہر قوم کو اس کی زبان میں ہی ہدایت نامہ ملتا رہا ہے۔ لہٰذا کوئی قوم اور کوئی زبان نبی اور کتاب سے محروم نہیں رہی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر 35:24) یعنی ہر امت میں نذیر آتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس 10:47) ہر امت کے لیے رسول آئے اور نبی بغیر کتاب کے نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے کتاب لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی کو وحی نبوت (کتاب) سے نوازتا ہے ارشاد الٰہی ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید 57:25) بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانات کے ساتھ بھیجا، ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (قواعد عدل وانصاف) بھی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہر خطہ کے لوگ کسی نہ کسی نبی اور رسول اور اس کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ قرآن مجید عربی زبان میں کیوں نازل ہوا، سنسکرت یا کسی اور زبان میں نازل ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ ہر زبان میں کتاب بھیج چکا ہے تو قرآن کا عربی زبان میں نازل کرنے کا اعتراض بے جا اور مبنی بر جہالت اور تعصب ہے۔

قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ پہلے نبی مختص بالقوم تھے۔ ان کی کتب بھی اسی دور اور اسی قوم کے لیے تھیں۔ قرآن مجید عالمگیر پیغام کی حامل کتاب ہے۔ اور پہلی تمام کتب کی جامع تعلیم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مزید برآں یہ کتاب تمام انسانی ضرورتوں اور احتیاجات کی تعلیمات کا خزانہ ہے۔ اور اس میں کوئی کمی اور نقص نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید نے اکمل کتاب ہونے کا دعویٰ کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ 5:3) آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام بطور دین پسند کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ 3:98) اس (قرآن) میں قائم رہنے والی کتب ہیں۔ بتایا گیا ہے قرآن مجید میں پہلی کتب کی وہ تمام موجود ہے جو قائم رکھنے کی قابل تھی۔

چنانچہ ضروری تھا اس قسم کی کتاب کے لیے وہی زبان ہو جو اپنے اندر اس خزانہ ہدایت کو سمو سکے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس قسم کی کتاب کے لیے صرف عربی ہی ایک ایسی زبان ہے۔ اب تحقیق سے یہ ثابت ہو رہی ہے کہ عربی زبان ہی تمام زبانوں کی ماں ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل کے لیے دو کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ام الالسنہ مصنفہ خواجہ کمال الدین بانی ووکنگ مشن لندن، ام الالسنہ مصنفہ محمد احمد وکیل فیصل آباد ان کتب میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان تمام السنہ کی ماں ہے۔

یہاں پر میں عربی زبان کی چند خصوصیات بیان کرتا ہوں۔ جن سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن مجید جیسی کتاب کے لیے یہی زباں موزوں تھی۔

زبان کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زبان الہاماً سکھائی ہے۔ اس کی بنیاد قرآن مجید کی اس آیت پر ہے: عَلَّمَهُ الْبَيَانَ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو زبان سکھائی۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زبان انسان کی اپنی بنائی ہوئی ہے پھر یہ نظریہ تین تھیوریوں میں بٹ جاتا ہے۔ پہلی تھیوری کا نام باؤ واؤ تھیوری، دوسری کا نام پوپو تھیوری اور تیسری کا نام ڈنگ ڈانگ تھیوری ہے۔ باؤ واؤ کتے کی آواز کو کہتے ہیں۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ جس طرح کتا اور دوسرے جانور آوازیں نکالتے ہیں اسی طرح انسان بھی شروع میں آوازیں نکالتا تھا۔ چونکہ انسان کے صوتی اعضاء دوسرے جانوروں کے صوتی اعضاء سے زیادہ لچکدار ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان میں مختلف آوازیں نکالنے کی زیادہ استعداد ہے جب انسان کے دل میں مظاہر قدرت کی مختلف اشیاء نے مختلف اثرات ڈالے تو ان کے اظہار کے لیے انسان کے اعضاء صوتی سے مختلف آوازیں پیدا ہوئیں۔ یہ آوازیں مختلف مفہوموں کے قائم مقام ہو کر مختلف الفاظ بنانے کا سبب ہوئیں۔

اس تھیوری سے ملتی جلتی دوسری تھیوری آنوموٹو پوئیک ہے جس کو صوتی تھیوری کہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے نیچر کی آوازوں کی نقل کر کے آہستہ آہستہ زبان بنالی۔

دوسری تھیوری ''پوپو'' تھیوری ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے مختلف جذبات کا اظہار مختلف آوازوں میں کیا۔ اسی بناء پر زبان بن گئی۔ تیسری تھیوری ڈنگ ڈانگ تھیوری ہے۔ اس کا موید پروفیسر میکس مُلر ہے۔ اس تھیوری کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مختلف چیزوں پر خارجی چوٹ پڑنے سے مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح انسانی دماغ پر بیرونی تاثرات مختلفہ نے مختلف طریقوں سے چوٹیں مار کر مختلف آوازیں پیدا کیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبان کی شکل اختیار کر گئیں۔

اگر ان نظریات پر تنقید کی جائے تو ان کا بطلان واضح ہو جائے گا۔ اگر زبان انسان کی اپنی ایجاد ہوتی تو اس صورت میں کسی نوزائیدہ بچہ کو تعلیم زبان کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بالغ ہو کر آپ ہی کوئی زبان ایجاد کر لیتا۔ لیکن ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جب تک بچے کو کوئی بولی نہ سکھائی جائے تو وہ کچھ بول نہیں سکتا۔ اکبر کے گنگ محل کا واقعہ مشہور ہے۔ اکبر نے انسان کی اصل زبان معلوم کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے چند نوزائیدہ بچے گنگ زبان دایہ کے زیر نگرانی ایک محل میں رکھے۔ جہاں دوسرے انسانوں کی آوازیں نہ پہنچتی تھیں۔ جب وہ بڑے ہوئے تو وہ مہمل آوازوں کے سوا کوئی آواز نہ نکالتے تھے۔ اگر انسان نے اپنی زبان ایجاد کی ہوتی تو وہ بھی اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی زبان ایجاد کر لیتے۔ تجربہ یہی ہے کہ جو آواز اور الفاظ بچہ سنتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے انسان میں مختلف قوتیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کی نشوونما کے لیے خارج میں سامان پیدا کیے ہیں مثلاً قوت شامہ ہے تو سونگھنے کے لیے خارج میں ہر قسم کی خوشبوئیں پیدا کر دی ہیں۔ اسی طرح دوسری قوتوں کا حال ہے۔ ان کی نشوونما کے لیے خارج میں ہی تمام اشیاء موجود ہیں۔ اسی طرح قوت تکلم اور قوت سمع ہے ان کی نشوونما کے لیے بھی ضروری ہے کہ خارج میں سامان ہو۔ قوت تکلم اور قوت سمع کی نشوونما کے لیے الفاظ کا ذخیرہ ہونا ضروری ہے تاکہ یہ قوتیں نشوونما پاسکیں۔ یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو الہاماً کوئی زبان سکھائی ہو۔

جب ہم اس نظریہ پر سوچ بچار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کون سی زبان سکھائی تو مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عربی زبان ہی الہامی زبان ہے جو انسان کو سکھائی گئی تھی۔ جس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

پہلی دلیل:

عربی اسماء کے اندر لطیف وجوہ تسمیہ پائے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ایک علیم وخبیر ہستی کی بنائی ہوئی ہے۔ مثلاً ارض کے معنی زمین کے بھی ہیں اور اس حرکت کو بھی کہتے ہیں جو کسی کے سر میں بلا اسباب ظاہری پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مارِوض اس کو کہتے ہیں جس کا سر اور جسم بلا ارادہ ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ پس زمین میں مستقل حرکت ہونے کی وجہ سے اس کو عربی زبان میں ارض کہا گیا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں مرد کو رجل کہتے ہیں اور عورت کو نسوۃ کہتے ہیں۔ رجل کے معنی مرد کے علاوہ مضبوط اور بالوں والا بھی ہوتے ہیں۔ ان معنی سے یہ واضح ہو گیا کہ مرد کو رجل کیوں کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نسوۃ کے معنی چربی دار ہونے کے ہیں۔ چربی ملائم اور نرم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ چونکہ عورت میں قدرتاً نرمی اور ملائمت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ملائمت کی وجہ سے عورت کو عربی زبان میں نسوۃ کہا جاتا ہے۔

غرض کہ عربی زبان میں خواہ اسماء ہوں یا افعال تمام کے اندر معانی اور حقائق کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ زبان کسی انسان کی ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی علیم وخبیر ہستی کی الہاماً بنائی ہوئی زبان ہے جس نے تمام چیزوں کی کنہ کو ملحوظ رکھ کر نام رکھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ (بقرہ) (آدم کو تمام نام سکھا دیے) یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زبان خدا کی بنائی ہوئی ہے نہ کہ انسان کی۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان الہامی زبان ہے اور یہی وہ زبان ہے جو سب سے پہلے آدم کو سکھائی گئی تھی اور تمام زبانوں کی ماں ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی زبان کے ام الالسنہ ہونے کے لیے دو امور کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ اس زبان اور دیگر زبانوں کے مادوں اور الفاظ میں صوری اور معنوی مشارکت ومجانست ہو۔ تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ان سب زبانوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔

2۔ اس زبان کے مادہ اور الفاظ ابتداء سے آج تک اپنی اصل شکل وصورت میں محفوظ ومصئون رہے ہوں۔

جب ان دو امور کو سامنے رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ عربی زبان ہی ام الالسنہ ہے۔

نمونہ کے طور پر چند ایک الفاظ بیان کیے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ عربی ور دوسری زبانوں کے مادہ اور الفاظ میں صوری اور معنوی مشارکت ومجانست کتنی ہے اور عربی زبان ہی دوسری زبانوں کا ماخذ ہے۔

رگ وید دنیا کی سب سے قدیم لٹریچر کی کتاب ہے۔ اس کا آغاز ہی اگنی (بمعنی آگ) سے ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی مادہ آج سے

ماخوذ ہے جس کے معنی آگ کا بھڑکنا ہے۔ آگ اور آج ایک ہی ہیں۔

انگریزی لفظ ہسٹری (تاریخ) سٹوری (کہانی) لاطینی مسٹوریکس عربی لفظ مَسطَرَ سے ماخوذ ہیں جس کے معنی لکھنا اور پھر اس کے خاص معنی تاریخ اور قصہ کہانی لکھنا ہے۔ پھر اسی مادہ سے اسطورہ ماخوذ ہے جس کے معنی افسانہ اور قصے کہانی کے ہیں۔ دیکھئے ان الفاظ میں کتنی مشارکت اور مجانست ہے۔

عبرانی لفظ ''کوپھر'' (Kophor) بمعنی ڈھانکنا انگریزی لفظ ''کور'' (Cover) بمعنی ڈھانکنا عربی زبان کے لفظ کفر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ڈھانپنا ہے۔ جرمنیک مادے قیپ (بمعنی پکڑنا) برگ (توڑنا) لیتی (بمعنی چمکنا) شک (کاٹنا) ویڈ (دیکھنا) مد (پیمائش کرنا) بالترتیب عربی مادوں قبض (پکڑنا) فرق (توڑنا) الاق (بجلی کا چمکنا) شق (کاٹنا) بداء (ظاہر ہونا، دکھلانا) مُد (پیمانہ) سے ماخوذ ہیں۔

ان الفاظ میں کتنی صوری اور معنوی مشارکت پائی جاتی ہے۔

انگریزی لفظ ''ماسٹر'' (آقا، نگران) عربی زبان مُسَیطِر (نگران) سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ابیوز (گالی دینا) عربی لفظ بَذَأ (گالی دینا) اَبذاء (کسی پر الزام لگانا) سے مشتق ہے۔

انگریزی لفظ ریفیوض (Refuse)، (انکار کرنا) عربی زبان رفض (انکار کرنا، ترک کرنا) سے ماخوذ ہے۔

انٹیق (Antique) (قدیم) عربی زبان (عتیق) یعنی پرانا سے ماخوذ ہے۔

انجائے (Enjoy) (فائدہ اٹھانا خوشی میں) عربی لفظ اَنْجَعْ (پھولنا پھلنا) اور نجع (فائدہ اٹھانا) سے ماخوذ ہے۔

انفیوز (Infuse) کسی چیز میں نفوذ کرنا عربی زبان کے لفظ اَنفَذ یا نفذ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز میں نفوذ کرنا ہے۔ مینٹل (Mantle) (تولیہ) عربی لفظ مندیل (تولیہ) سے ماخوذ ہے۔

سورج، سراج سے، ہوا، ہواسے، دھکا، دق سے گانا، غنا سے آسمان، سماء سے، سوٹا، سوط سے، سیدھا، سدید سے، ماخوذ ہیں۔

اگر لغتوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہر زبان میں بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو عربی زبان سے لیے گئے ہیں۔ چنانچہ اخبار الاندلس کا مصنف ایس۔ پی سکاٹ تسلیم کرتا ہے کہ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ روزمرہ کی اصطلاحات بغیر تبدیلی کے عربی زبان سے لی ہوئی ہیں اور اب تک ہماری زبان میں موجود ہیں۔ فرنچ زبان کے اکثر الفاظ ومحاورات عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ سپینی زبان کو تو بگڑی ہوئی عربی کہا جاسکتا ہے۔ زبان اطالیہ پر جوائر صقلیہ کے مسلمانوں نے ڈالا وہ صاف طور پر ظاہر ہے۔

دوسرا امر یہ کہ وہ زبان ہمیشہ سے محفوظ چلی آتی ہو۔ یہ خصوصیت بھی عربی زبان کو حاصل ہے۔ عربی زبان جو حجاز میں بولی جاتی ہے ہمیشہ سے محفوظ ومصئون چلی آتی ہے۔ بقول پروفیسر وٹنی یہ زبان تو اپنی شکل وصورت میں اس دن بھی حجاز میں بولی جاتی تھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ارض موعودہ کی تلاش میں اسرائیلیوں کو ہمراہ لے کر عرب کے ریگستانوں میں سے گزرے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کے تغیرات سے محفوظ چلی آرہی ہے تو پھر دوسری زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ کو کسی اور قدیمی زبان کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی علمی لغزش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین علم الالسنہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ اگر وہ عربی زبان کی طرف ان الفاظ کو پھیرتے تو تحقیق کی راہ میں جو سد سکندری آتی ہے وہ نہ آتی۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں چند قدم آگے چل کر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ دوراز کار تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے اگر کوئی ماہر علم الالسنہ دوسری زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ کو عربی

زبان کی طرف پھیرے تو وہ لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ دوسری زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ عربی سے ماخوذ ہیں اور یہی عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے کی دلیل ہے۔

خصوصیات:

عربی زبان کے حروف ہجائیہ کے نام اپنا الگ مفہوم رکھتے ہیں مثلاً (الف) اس کے لغوی معنی سخی مرد اور فضائل میں یکتا کے ہیں۔ت (التاء) کے معنی نرم لئی جو کھلی کے مریض اونٹ پر ملی جائے۔ج (الجیم) اس کے معنی اونٹ۔ی (الیاء) بچا ہوا دودھ تفصیل کے لیے الجاسوس علی القاموس ص 40، 41 ملاحظہ کریں۔

2۔عربی زبان کا ایک ایک حرف اپنے اندر معنی اور مفہوم رکھتا ہے مثلاً ق (بچا) ل (دوستی کرنا) ن (نرم ہو) ف (وفا کر) ع (یاد کرنا)۔

3۔عربی زبان میں یہ ندرت پائی جاتی ہے اس میں ایسے جملے اور کلمات آسانی سے وضع کیے جاسکتے ہیں کہ اگر ان کو الٹ دیا جائے تو بھی جملے بن جاتے ہیں۔جیسے رَبَّكَ فَكَبِّرْ ان حروف کو پیچھے سے ایک ایک کر کے پڑھا جائے تو وہی جملہ بن جائے گا۔یہ ندرت صرف نثر میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ نظم میں پائی بھی جاتی ہے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

اس ارملا اذاعر — وارع اذا المرء اسا

اسند اخا نباهة — ابن اخادنسا

اسل جناب غاشم — مشاغب ان جلسا

اسرا ذهب مرا — ارم به اذا رسا

اسكن تقو فعسى — يسعف وقت نكسا

ہر شعر کو پیچھے سے پڑھنا شروع کریں تو وہی شعر اور وہی اس کے معنی حاصل ہوں گے۔

عربی زبان میں ایک یہ خوبی بھی ہے کہ بے نقط حروف سے بھی مضمون آسانی سے ادا ہو سکتا ہے جیسا کہ اکبر کے عہد میں علامہ فیضی نے ''سواطع الالہام'' کے نام سے قرآن مجید کی غیر منقوط تفسیر لکھی ہے۔

4۔عربی زبان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ جن مفہومات کا اظہار دوسری زبانیں مرکب الفاظ اور فقرات کرتی ہیں ان کے اظہار کے لیے عربی کا مفرد لفظ ہی کافی ہے۔لفظ رب، رحیم، رحمان، اس قبیل کے بے شمار الفاظ ہیں تمام قرآن مجید اس خوبی پر شاہد ناطق ہے۔

رب وہ ذات ہے جو ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دے۔یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔''رحیم'' وہ ذات ہے جو انسان کی محنت کا بہترین بدلہ دے۔''رحمان'' وہ ذات ہے جس نے انسان کی پیدائش سے قبل ہی اس کی پرورش کے لیے تمام سامان مہیا کیے ہیں۔جن مفاہیم کو دوسری زبانیں مرکب الفاظ اور فقرات سے ادا کر رہی ہیں عربی زبان نے ان کو ایک ایک لفظ میں ادا کر دیا ہے۔یہ خوبی عربی زبان ہی کی ہے۔

5۔عربی زبان کے اندر الفاظ کا اتنا وسیع ذخیرہ ہے جن کا مقابلہ کوئی بھی ترقی یافتہ زبان نہیں کر سکتی مثلاً انسان کے اعضا میں ہر عضو، پھر عضو کے ہر ہر حصہ کے نام الگ الگ ہیں۔مثلاً انسان کے ہاتھ کو بحیثیت مجموعی عربی میں ید یا کف کہتے ہیں۔پھر ہاتھ کے

مختلف حصوں کے مختلف نام ہیں۔ انگلی کو اَصْبَعْ پھر انگلیوں کے نام الگ الگ ہیں۔ ''ابھام'' (انگوٹھا) ''سبابۃ'' (انگوٹھا سے دوسری انگلی) ''وُسْطٰی'' (تیسری انگلی) ''بنصر'' (چوتھی انگلی) خنصر (پانچویں انگلی) انگلیوں کے درمیانی خلا کو ''خلل'' انگوٹھا اور خنصر کے درمیانی فاصلہ کو ''شبر'' انگوٹھا اور سبابہ کے درمیانی فاصلہ کو ''فتر''۔ فاصلہ درمیان سبابہ اور وسطٰی ''رطب'' فاصلہ درمیان وسطٰی اور بنصر ''عقب'' فاصلہ درمیان بنصر وخنصر وسیم ناخن ''ظفر'' انگلیوں کے پوٹے ''انمل'' انگلیوں کے جوڑوں کی درمیانی ہڈی کو ''سلا'' غرض کہ انسان کے جسم کے تمام اعضا کے ہر ہر حصہ کا الگ الگ نام ہے۔

اسی طرح جب بچہ رحم میں آتا ہے ''جنین'' جب حالت پیدائش میں ہوا سے ''سلیل'' جب پیدا ہو ''ولید'' سات دن کے بچے کو ''صدیغ'' اس کے بعد ''طفل'' اور ''صَبِی'' جب دانت نکلیں تو ''لِفغر'' جب دودھ چھوڑے ''مُستکرش'' جب دانت توڑے ''فتع'' جب دانت نکالے ''ابدعہ'' جب چلنے پھرنے لگے تو ''فاکع'' جب کسی قدر مضبوط ہو جائے تو ''یاقع'' قریب بلوغت ''حناسی'' جب بلوغت کو پہنچ جائے ''مراھق'' یہ تمام نام آخری عمر تک چلے جاتے ہیں۔

6۔ عربی کے مصادر تین حروف سے مرکب ہوتے ہیں اس سہ حرفی لفظ کی ترتیب ایسے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ جب انہی حروف میں تقدیم وتاخیر وتقلیب کردی جائے تو اس سے دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے درجے تک مختلف معانی پیدا ہوتے ہیں مثلاً س۔ل۔ب تین حروف ہیں اس سے سلب۔ سبل۔ لبس۔ لسب۔ بلس۔ بسل۔ چھ الفاظ بن گئے جو سب کے سب بامعنی ہیں۔

(ق۔م۔ر) سے قمر، قرم، مقر، مرق، رمق، رقم، بامعنی الفاظ بنتے ہیں۔

(س۔ل۔م) سے سلم، سمل، لسم، لمس، ملس، سب بامعنی الفاظ بنتے ہیں۔

8۔ عربی زبان میں حرکات (ضمہ، کسرہ، فتحہ) سے بھی الفاظ کا کام لیا گیا ہے مثلاً (فَعَلْتَ) ''فتحہ تا'' سے مخاطب مذکر (تو ایک مرد نے کیا) ''کسرتا'' سے مخاطب مونث۔ (تو ایک عورت نے کیا (فَعَلْتِ) ''ضمہ تا'' سے واحد متکلم (فَعَلْتُ) (میں نے کیا) اور (فَعَلَتْ) ''جزم تا'' سے غائب مونث (اس ایک عورت نے کیا) کے معنی پیدا ہوئے ہیں۔

عربی زبان میں حرکات میں ضعف اور قوت کی تقسیم ہے۔ ضمہ قوی تر، پھر کسرہ، پھر فتحہ یہ تقسیم خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ حرکات کی اس ضعف اور قوت کا اثر الفاظ کے معانی پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً حَمْلٌ بالفتح ایسا بوجھ جس کا اٹھانا ناگوار نہ ہو۔ مادہ کے پیٹ کا بچہ یا درخت کا پھل۔

حِمْلٌ بکسر ایسا بوجھ جس کا اٹھانا دشوار ہو۔ فلہ حِمْلٌ یعنی اس کو اتنا غلہ دیا جائے گا کہ ایک مضبوط اونٹ اٹھا سکے۔

سُبْق بفتح اول جزم ثانی دوڑ سَبَقَ بفتحتین وہ روپیہ جو دوڑ کی شرط پر لگایا جاتا ہے۔ دوڑنا آسان ہے مگر دوڑ کی شرط پر روپیہ ادا کرنا دشوار ہے۔

9۔ عربی زبان میں ایسے الفاظ موجود ہیں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں مثلاً ''عین'' اس کے معنی ہیں آفتاب چشمہ، زرمسکوک آنکھ وغیرہ 51 معانی ہیں باوجود اس کثرت معانی کے ان سب میں ایک ایسی وحدت موجود ہے جو جملہ معانی کے لیے بطور وجہ مشترک ہے۔ اسی طرح ''خال'' کے ستائیس ''عجوز'' کے معنی ساٹھ ہیں عربی زبان میں ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جو شے واحد پر دلالت کرتے ہیں اور باوجود ایک وجہ اشتراک پائے جانے کے ہر ایک لفظ میں ایک ایسا مابہ الامتیاز موجود ہے جو اسے ایک مستقل لفظ بنائے ہوئے ہے مثلاً عربی زبان میں شہد کے لیے اسی، سانپ کے لیے دوسو، شیر کے لیے پانچ سو اور تلوار کے لیے ہزار نام ہیں۔ تاہم

ہر ایک نام اپنے اندر ایک الگ الگ صفت رکھتا ہے۔

10۔ عربی کے حروف کی بعض خاص خصوصیات ہیں ان حروف کو انہی خصوصیت کی وجہ سے اصل مادہ میں شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً م میں جمیعت کی خصوصیت ودیعت کی گئی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ خود حرف مذکور کا تلفظ اسی معنی کا خواستگار ہے دیکھو اس کے ادا کرنے میں ہونٹ مل جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ پر غور کرو جن میں حرف میم آتا ہے۔

ام۔ ماں یا درخت کے تنہ کو کہتے ہیں، بچے اپنی ماں سے، شاخیں اپنے تنہ سے جمیعت پاتی ہیں۔

توام۔ وہ دو بچے جو ایک پیٹ میں ایک وقت رہے ہوں۔

ہم۔ وہ فکر جو انسان کے دل میں جم جائے۔

ضم۔ ایک شے کا دوسرے کے ساتھ مل جانا۔

امام۔ وہ شخص جس پر جماعت کا اجتماع ہو جائے۔

تمام۔ وہ حالت جو جملہ اجزاء کی جامع ہو۔

حرف الف کی خصوصیت:

اس کے ادا کرتے ہوئے مد پیدا ہوتی ہے اس کی یہ خصوصیت معانی الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے۔

طویل کے معنی لمبا۔ لیکن طوال کے معنی بہت لمبا۔ یہ ترقی صرف الف کی وجہ سے ہوئی ہے۔

کبیر کے معنی بڑا لیکن کبار کے معنی بہت بڑا، شقدف چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں اس سے بڑی کشتی کو شقداف۔

11۔ عربی زبان میں بعض ایسے الفاظ ہیں کہ ان میں دو خاص حروف آجائیں تو وہ خاص مفہوم کے حامل ہوں گے۔ مثلاً ''نون'' اور ''ف'' اکٹھے ہوں گے تو ان میں ہمیشہ خروج کا مفہوم پایا جائے گا۔ مثلاً نفث، نفخ، نفر، نفق، اگر ''فا'' اور ''لام'' جمع ہو جائیں تو اس میں شگافتن کا مفہوم پایا جائے گا۔ فلق، فلج، فلذ، وغیرہ ''ج'' اور ''ن'' جس مادہ میں پائے جائیں گے وہاں پوشیدگی اور تیرگی کے معنی پائے جائیں گے۔ جن، جنین، جنت، جنون۔

12۔ عربی کا ایک لفظ کئی کئی الفاظ کا مورث اعلیٰ بن جاتا ہے مثلاً ایک لفظ صرف کبیر پر غور کریں تو ایک ہی لفظ بے شمار الفاظ کو جنم دے گا۔ مثلاً کَبَّرَ، یُکَبِّرُ، تَکْبِیراً، مُکَبِّرٌ، مُکَبَّرٌ۔ مادہ ک، ب، ر تھا۔ اس سے باب تفعیل بنایا گیا۔ پھر اس مادہ سے کئی الفاظ بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح مزید الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف عربی زبان میں ہی پائی جاتی ہے۔

13۔ عربی زبان میں مقفی اور مسجع عبارت لکھنا نہایت آسان ہے۔ مقامات بدیع اور حریری اس کی بہترین مثالیں ہیں اس سے بھی زیادہ لطف اندوز ہونا ہو تو پھر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے۔

14۔ الفاظ اور معنی کی باہمی مناسبت ہے سیبویہ کا قول ہے جو مصادر فعلان کے وزن پر آتے ہیں ان میں اضطراب اور حرکت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عطشان، غشیان وغیرہ۔ ابن جنی کہتا ہے کہ اکثر مُضَاعَف رباعی مصادر کے معنوں میں تکرار اور حرکت کا مفہوم ہوتا ہے جیسے قلقلہ، صلصلہ، تعتعہ اور وزن فُعَلٰی سرعت کے معنی لیے آتا ہے جیسے زُلَقٰی۔

15۔ عربی زبان بہت شیریں اور لطافت سے پُر ہے۔ ایس۔ پی۔ سکاٹ اپنی کتاب ''اخبار الاندلس'' میں لکھتا ہے کہ عربی زبان کی شیرینی اس کی حیات بخش قوت، اس کا رسیلہ پن، اس کے استعارات کی کثرت اور بوقلمونی نے اسے شاعری کے لیے اتنا

موزوں بنا دیا ہے کہ یہ درجہ دنیا کی کسی اور زبان کو بہت کم حاصل ہے۔کوئی لفظ، کوئی محاورہ ایسا نہیں جو خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ نظم میں موزوں نہ ہو جائے۔

16۔عربی زبان ایسے مفردات اور تراکیب اپنے ساتھ رکھتی ہے جو انسان کے تمام باریک در باریک خیالات کا اظہار کرنے کے لیے کافی ہے۔عربی زبان کی یہ خصوصیات جو فوق العادت کمالات سے مختص ہیں اور دوسری زبانیں ان خوبیوں اور خصوصیت میں ہرگز ہرگز شریک اور مساوی نہیں، ظاہر کر رہی ہیں کہ عربی زبان ہی الہامی زبان ہے اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ اپنی اکمل اور اتم کتاب اسی زبان میں نازل فرماتا۔ تاکہ وحی کی ظاہری خوبیوں مثلاً عبارت میں رنگینی، شیرینی، لطافت، فصاحت و بلاغت، روانی، حسن ترتیب اور حسن بیان اور باطنی خوبیوں مثلاً ادق سے ادق مسائل کا کم الفاظ میں بیان کو برقرار رکھا جا سکے۔

ظاہری اور خارجی شہادت:

1۔ سب سے بڑی خارجی شہادت ہر دور میں تفاسیر کا لکھا جانا ہے۔قرآن مجید کی تفاسیر احاطہ تعداد سے باہر ہیں اور ہر دور میں مزید لکھی جائیں گی۔لیکن قرآن مجید کے لطائف اور دقیق رموز اور معارف ابھی بھی دائرہ بیان سے باہر ہیں ہر دور میں نئے نئے معارف سامنے آتے ہیں اور ہر دور کے انسان کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے صراط مستقیم پر چلاتے ہیں۔ یہ صرف قرآن مجید کے عربی زبان میں نازل ہونے کا کمال ہے۔لہٰذا کوئی زبان بھی ان دقیق مسائل کو بیان کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

2۔ عربی زبان کے الہامی اور دقیق مسائل کے بیان کرنے کی صلاحیت رکھنے کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو دنیائے معمورہ کے ''ناف'' یعنی وسط میں آباد ہیں۔ یہ بات جغرافیائی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ مکہ دنیا کے وسط میں واقع ہے۔وسط ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں سے چاروں اطراف کو ملایا جا سکتا ہے۔اور جہاں سے چاروں اطراف تک پیغام پہنچانا آسان ہے۔مکہ کو اسی وجہ سے ''ام القریٰ'' (بستیوں کی ماں) کہا گیا ہے۔

☆ ستیارتھ پرکاش کے مصنف نے اسی اعتراض میں یہ بھی کہا ہے ''جس کتاب میں متعصبانہ باتیں پائی جاویں وہ کلام اللہ نہیں ہو سکتی۔

جواب دیگر:

اسلام کا خدا نہ کسی کا طرف دار ہے اور نہ قرآن مجید میں متعصبانہ باتیں پائی جاتی ہیں۔قرآن مجید کا آغاز ہی الفاظ ''رب العالمین'' کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اسلام کا خدا وہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔اسلام کے رب نے اپنی تمام مخلوقات کی زندگی کے لیے ان کی پیدائش سے پہلے ان تمام چیزوں کو پیدا کر دیا جن کی انسان اور دیگر جاندار مخلوقات کو ضرورت تھی۔اس کے ساتھ انسان کی راہنمائی کے لیے سلسلہ انبیاء شروع کیا۔دنیا کے ہر خطہ میں نبی بھیجے۔ان کو ان احکامات سے نوازا جو انسان کی معاشرتی، تمدنی، اخلاقی، اقتصادی، سیاسی زندگی اور روحانی زندگی کے لیے ضروری تھے۔پھر اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام کتب سماوی پر ایمان لانا ضروری ہے۔اس کے ساتھ تمام روئے زمین کے انسانوں کو من نفس واحدۃ قرار دے کر مساوات اور اخوت کی لڑی میں منسلک کر دیا۔اور اسلام ہی وہ دین ہے جس کے بانی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ کہ

تمام روئے زمین کے بندے بھائی بھائی ہیں جب کہ دوسرے مذاہب اپنے علاوہ دوسروں کو ملیچھ اور ناپاک نا معلوم کن کن ناموں سے پکارتے ہیں۔

الزامی جواب:

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہندو مذہب چار ذاتوں (برہمن، کھشتری، ویس، شودر) کے قائل ہیں۔ اچھوتوں (شودروں) پر مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ ان کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی طرح آریوں نے دراوڑی قوموں سے جو ظالمانہ سلوک کیا وہ بھی تاریخ میں رقم ہے۔ سب سے بڑھ کر ہندوؤں کے راہنما راجہ رام چندر جی نے شمبوک شودر کو خدا کی عبادت کرنے کے جرم میں قتل کر دیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں ظلم کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ جس قوم کی خود اپنی تاریخ جور و ستم روا رکھنے سے بھری پڑی ہو اس کا اسلام کے حسین چہرہ پر اپنی جہالت اور کم عقلی کی وجہ سے تعصب اور نفرت کا غازہ ملنا مقام حیرت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

❁......❁......❁

قرآن معجزہ نہیں (ستیارتھ پرکاش)

قرآن معجزہ ہے (اسلام)

اعتراض:

بھلا یہ کوئی بات ہے کہ قرآن کی سورتوں کی سی اور سورت نہ بن سکے۔ اکبر بادشاہ کے وقت علامہ فیضی نے ایک بے نقط قرآن نہیں بنالیا تھا۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں اعتراض 8)

جواب: قرآن مجید کا بے مثل ہونا

قرآن مجید وہ کتاب ہے جس نے ہر پہلو سے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور تمام دنیا کو اس کی مثل بنانے کا چیلنج دیا ہے۔ لیکن کوئی مقابلہ پر نہیں آیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ 23:2) ''اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو تم اس کی مانند کوئی سورۃ بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو تو پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔''

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل 88:17) ''اے رسول! (ان مخالفوں سے کہہ دے) کہ اگر انس و جن مل کر یہ کوشش کریں کہ اس کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔''

حقیقت یہ ہے کہ جو چیز بھی قدرت کاملہ خدا تعالیٰ سے ظہور ہو گی خواہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز مخلوق ہو خواہ اس کی کتب میں سے کوئی کتاب جو لفظاً اور معناً اس کی طرف سے نازل ہوئی ہو۔ وہ بے مثل اور بے نظیر ہو گی۔ یہ دعویٰ دو طرح سے ثابت ہوتا ہے۔

اوّل قیاس سے کیونکہ از روئے قیاس خدا تعالیٰ کا اپنی ذات، صفات افعال اور اقوال میں واحد لاشریک ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی صفت میں مخلوق کی شرکت جائز ہو تو دوسرا خدا بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے شریک باری تعالیٰ عند العقل ممتنع ہے۔ پس اس دلیل سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں واحد لاشریک ہے مگر قرآن مجید کی مثل اگر کوئی کتاب بنائی جا سکے تو خدا تعالیٰ کی صفت قدرت میں غیر کی شرکت لازم آتی ہے جو عند العقل ممتنع ہے۔ دوسرا ثبوت اس دعویٰ کا استقراء نام ہے ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو جیسے مکھی، مچھر، عنکبوت وغیرہ اس کی مثل بنانے میں انسان قاصر اور مجبور ہے۔ اس کی مثل تو بنانا ایک طرف رہا۔ ان کے عجائب کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس سائنسی عہد نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ خدا کی

مخلوق کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصہ میں اتنے راز اور عجائب ہیں کہ انسان ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جب استقراء تمام سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان خدا کی مخلوق کی مانند چیز نہیں بنا سکتا تو پھر خدا کے کلام کی مثل کیسے بنا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایک دلیل خدا کی مخلوق اور مصنوعات بھی ہیں۔ اگر دوسرا بھی ان کی مانند بنانے پر قدرت رکھ سکتا ہے تو پھر خدا کی ہستی مشتبہ امر ہو جائے گی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کن کن پہلوؤں کے لحاظ سے بے مثل اور معجزہ ہے۔ گو ان کا احاطہ کرنا انسان کے بس میں نہیں تاہم چند ایک پہلو بیان کیے جاتے ہیں۔

علمی لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید حقائق علمیہ کا خزانہ ہے جن کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہیے۔ قرآنی علوم کو چار موٹے موٹے عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

اول۔ رُوحانی علوم جس میں خدا کی توحید اور اس کی صفات کا علم، تعلق باللہ کا علم، ملائکہ کا علم، مبداء و معاد کا علم، اخلاق کا علم اور عبادات کا علم شامل ہے۔

دوم۔ معاشرتی علوم جس میں علم عمرانیات، علم سیاست، علم اقتصاد، علم قانون، علم تمدن، علم ہندسہ، علم نفس اور علم مناظرہ شامل ہے۔

سوم۔ سائنسی علوم میں علم فضائیات، علم کیمیا، علم طبعیات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم الجبال، علم الحیوان، علم ہیئت اور علم طبابت شامل ہے۔

چہارم علوم لسانیہ میں صرف ونحو اور معانی و بیان کے علوم شامل ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اس آیت میں رطب سے مراد ''روحانی علوم'' اور یابس سے ''باقی علوم'' مراد ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ہم نے کتاب میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ سب علوم خدمت دین کے لیے بطور خارق عادت بیان ہوئے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے دقیق مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ہستی باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لیے یہ علوم دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

برکات روحانیہ کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کے نزول سے قبل عرب قوم شراب خوری، قمار بازی، عیاشی، بت پرستی، جنگ و جدل، غربا پر ظلم و ستم، ڈاکہ زنی اور دختر کشی جیسی بے شمار بدیوں میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جن سے اس قوم کا نکلنا محال نظر آتا تھا۔ اس ظلمت اور فسق و فجور کی گھٹاٹوپ فضاؤں میں قرآن کا نزول ہوا۔ جس نے عربوں کی کایا پلٹ دی۔ ہر قسم کی بدیوں سے نجات دلا کر اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ کر دیا۔ عشق الٰہی کے سمندر میں ایسے غرق ہوئے کہ دنیا کی چمک دمک اور اس کی محبت انہیں اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ خدا کی رضا کے لیے اپنے وطنوں، اپنے مالوں، اپنے عزیزوں اور اپنی جانوں کے آراموں کو قربان کر دیا۔ اصلاح کا یہ بے نظیر کام قرآن مجید کی روحانی تعلیم کی وجہ سے ہوا۔ دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس سے یہ معجزہ رونما ہوا ہو۔ موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے: ''اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم کو نہیں دیکھا۔ جس کے اثر سے عربوں کی تمام بُری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ

ہوگئی۔ (بحوالہ تاریخ القرآن مصنف مولانا عبدالقیوم ندوی ص 71)

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ:

فصاحت و بلاغت ایک وجدانی چیز ہے گو علماء معانی و بیان نے فصاحت و بلاغت اور ان کے معارج و مراتب تعین کے لیے اصول و قواعد مدون کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی کلام کی فصاحت و بلاغت اہل زبان کے ذوق سلیم پر ہی منحصر ہے۔ ایک شعر ایک عامی پر کوئی اثر نہیں نہیں کرتا مگر وہی شعر کسی ادیب کے سامنے پڑھا جائے تو وہ سر دھننے لگتا ہے۔

کتاب الطراد کا مصنف فصاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے: ''جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لطف کے حسن تالیف کے فیصلہ کا دارومدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے قواعد وضوابط پر نہیں۔ (کتاب الطراد ج1 ص 118)

اسی بناء پر امام راغب نے لکھا ہے: ''جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے مالک ہوتے ہیں ان کے لیے اعجاز قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اس کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے برعکس جو لوگ اعجازی دلیل مانگتے ہیں وہ دو قسم کے اشخاص ہیں: ایک وہ جو ناقص ہونے کی بناء پر کلام الٰہی اور کلام بشری میں فرق نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ جو نقص کے علاوہ تعصب اور عناد کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں''۔ (کتاب الذریعہ ص 70)

غرض کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ لگانے کے لیے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کا مالک ہونا ضروری ہے۔

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار خود فرماتا ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر 28:39) قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ گویا قرآن مجید نہایت ہی واضح زبان یعنی نازل ہوا ہے جو مطالب کو نہایت ہی خوبی سے بیان کرتی ہے۔

قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ و بے مثل ہونا صرف اس زمانہ کا پیدا کردہ مسئلہ نہیں ہے۔ ہر دور میں علماء نے قرآن کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول قرآن کے وقت ہی تمام نامور خطباء، شعلہ بیان مقررین، اور نامور شعراء کو چیلنج دیا تھا۔ لیکن کسی نے بھی اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔ قرآن مجید کے اعجاز بیان کا یہاں تک اثر ہوا کہ بعض شعراء شعر گوئی ہی ترک کر گئے۔ لبید سبعہ معلقہ کا شاعر تھا۔ جونہی دائرہ اسلام میں داخل ہوا شعر کہنے ترک کر دیئے اور کہا کرتا تھا جب خدا نے مجھے سورۃ بقرہ اور سورہ آل عمران سکھائی ہیں تو اب شعر کہنا موزوں نہیں۔

تاریخ اور ادب کی کتب میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جو قرآن کی فصاحت و بلاغت پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے قرآن مجید کے یہ الفاظ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ سنے تو فوراً سجدہ ریز ہو گیا اور بولا میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر سجدہ کیا ہے۔

ایک دفعہ امام اصمعی نے ایک کمسن بچی کو دو شعر پڑھتے ہوئے سنا۔ شعر سن کر بولے اللہ اکبر! ہر شعر اپنے اندر کس درجہ کی فصاحت و بلاغت لیے ہوئے ہے۔ لڑکی بولی کیا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے بعد کوئی کلام اب

اس کا مستحق ہے کہ اسے فصیح و بلیغ کہا جائے۔تم دیکھتے ہو ایک آیت میں کس خوبی سے اللہ نے دو امر ''ارضیعہ'' اور ''القیہ'' دو نہی ''لاتخافی'' اور ''لاتحزنی'' دو خبریں ''انارادہ'' اور ''جاعلوہ'' اور دو بشارتیں جمع کر دیں۔

قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہونے کا غیر مسلموں کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ پاپولر انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

''قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب نہایت فصیح ہے اس کی انشائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے۔''

''قرآن مجید اثر ڈالنے، یقین دلانے کی طاقت، فصاحت و بلاغت اور تراکیب و بندش الفاظ میں بے نظیر ہے اور دنیائے سائنس کے تمام شعبوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث (ہرش فیلڈ نیو ریسرچز صفحہ 8،9)

''یہ امر کہ عرب کے بہترین مصنف بھی قرآن کی خوبیوں کے برابر کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہ ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔''

(Palmer, Introduction P58)

قوت تاثیر کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کی عبارت میں ایسی جاذبیت، کشش اور تاثیر ہے جو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت مخالفین قرآن مجید کے سننے سے لوگوں کو باز رکھتے تھے۔ان کو معلوم تھا کہ جونہی یہ قرآن مجید کو سن لیں گے ان کے دلوں میں قرآن مجید کی صداقت میخ کی طرح گڑ جائے گی۔تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اشد مخالف نے جونہی قرآن مجید کو سن پایا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔پھر شدید ایذاؤں اور مخالفتوں نے بھی پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کی۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ ہاتھ میں تلوار لے کر رسول کریم ﷺ کا کام تمام کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔راستہ میں کسی نے ان کو ان کے بہنوئی اور ہمشیرہ کے اسلام لانے کی خبر دی تو وہ سیدھے اپنے بہنوئی کے گھر پر گئے وہاں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات سنیں تو قرآن مجید کی محبت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا جوا اپنی گردن پر رکھ کر نکلے اور پھر تمام عمر قرآن کے مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہے۔

ایک اور واقعہ بیان کر دیتا ہوں۔عمرو بن جموح قبیلہ بنوسلمہ کا نامور سردار تھا۔اس کا بیٹا معاذ اسلام قبول کر کے واپس آیا تو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپؐ سے کیا سنا ہے۔معاذ نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر سنائی۔عمرو بن جموح پر اتنا اثر ہوا کہنے لگا یہ کلام تو بڑا عمدہ اور خوب ہے۔کیا آپ کا سارا کلام ایسا ہی ہے؟ معاذ نے جواب دیا ''ہاں بلکہ اس سے بھی عمدہ،اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔'' (شرح زرقانی ج5 صفحہ 102)

عدم اختلاف کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کا نزول تقریباً تئیس سال کے ایک لمبے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص پر نازل ہوا جو محض امی تھا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ منصوبہ باز شخص ان حالات میں ایک حالت پر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔اس کے نظریات اور عقائد بدلتے رہتے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک وہ وقت آیا جب اپنی قوم کی اصلاح اور بہتری کے لیے غار حراء میں آہ و بکا کیا کرتے تھے۔پھر چادر نبوت اوڑھ کر میدان عمل میں آ گئے تو چاروں طرف سے مخالفت کے طوفانوں میں گھر گئے،کیا اپنے کیا بیگانے سبھی جان لیوا بن گئے۔آخر کار مکہ معظمہ سے ہجرت کرنی پڑی۔اور مدینہ منورہ چلے گئے۔ان کے سر پر

قیادت وسیادت کا تاج رکھ دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔ ریاست اور صحابہ کی جانوں کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ تمام قبائل مخالف ہو گئے، مدینہ میں یہود ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ منافقوں کی ایک جماعت بن گئی۔ آپ ان پُرخطر حالات میں اسلام کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار اتارنے کے لیے کوشاں رہے، آخر وقت آ گیا کہ مخالفت کے بادل چھٹ گئے وہ شخص مغلوب ہو گئے۔

کیا کوئی آدمی یہ بات ذہن میں لا سکتا ہے کہ اس قسم کے مختلف حالات میں انسان ایک ہی حالت پر قائم رہے اور جو وہ کلام پیش کرے اس میں اختلاف نہ ہو۔ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے ہاں، اختلاف سے پاک کلام وہی ہو سکتا ہے جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہو۔ قرآن مجید نے منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نساء 82:4) پھر کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔

قوت دلائل کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کا نام بیّنۃ بھی ہے یعنی واضح اور کھلی دلیل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: فَقَدْ جَآءَکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (الانعام) یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی دلیل آ چکی ہے۔

قرآن مجید کو پڑھنے والا بڑی آسانی سے جان سکتا ہے کہ قرآن مجید کس طرح ایک دعویٰ کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر دلیل پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کوئی ایسا دعویٰ پیش نہیں کرتا جس کی دلیل اس کے ساتھ نہ ہو۔

غیب کی خبریں بیان کرنے کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید میں دو زمانوں ماضی اور مستقبل کے متعلق غیب کی خبریں بیان ہوئی ہیں کہ ان کا بیان کرنا من کل الوجوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت سے باہر تھا۔ کیونکہ وہ امور نہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بدیہی طور پر اپنا شہود وجود رکھتے تھے اور وہ غور وفکر سے معلوم کیے جا سکتے تھے۔ نہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے کسی واقف کار سے دریافت کر لیے ہوں گے۔

ماضی کی خبریں:

1۔ بائبل کی تحریف۔ قرآن مجید نے بائبل میں تحریف کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس سے بے خبر تھی۔ آج تیرہ سو سال بعد عیسائی محققین نے یہ اعتراف کر لیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (بقرہ 75:2) "پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا ہے پھر سمجھ لینے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے۔"

پادری ڈملو صاحب جنہوں نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہے وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ تورات اور انجیل محرف اور مبدل ہے۔

2۔ فرعون کی لاش کے متعلق۔ قرآن مجید نے فرعون کی لاش کی حفاظت کے متعلق اس وقت خبر دی کہ جب کسی کو بھی علم نہ تھا کہ فرعون کی لاش کہیں محفوظ ومصئون ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً

(یونس:92) سوآج ہم تیری لاش کو باہر نکال پھینکیں گے تاکہ تو اس کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان رہے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جو فرعون تھا وہ رعمسیس ثانی تھا۔ انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا میں مضمون ممی کے نیچے لکھا ہے کہ رعمسیس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مصالح وغیرہ کے ذریعہ سے رکھی جاتی ہیں۔

مستقبل کے متعلق خبریں:

خانہ کعبہ کا حج کا کبھی نہ رُکنا اور اس کا دشمنوں میں نہ جانا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:97) اس گھر کا حج کرنا صاحب استطاعت کے لیے ضروری ہے۔ دوم یہ بتایا ہے کہ یہ گھر کبھی بھی نہ تو دشمنوں کے ہاتھ جائے گا اور نہ تباہ و برباد ہوگا۔
تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ کسی زمانہ میں اس مقدس گھر کا حج اور زیارت نہیں رکی۔ عالمگیر جنگ میں جب کہ اس کے متولی ترک تھے اور وہ خود بھی جنگ میں شریک تھے لیکن اس وقت بھی حج نہ رکا تھا۔ وَمَنْ كَفَرَ میں یہ پیشگوئی ہے کہ اس گھر کو بڑے بڑے متکبر لوگ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہ ناکام رہیں گے۔ یہ وہ نشان ہے جو قیامت تک قائم رہے گا۔
دنیا میں جتنے بھی مقدس مقامات خیال کیے جاتے ہیں ان پر کسی نہ کسی رنگ میں ابتلا کا زمانہ ضرور آیا ہے۔ دشمنوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ بیت المقدس کو حضرت سلیمان نے کس شان و شوکت سے بنایا لیکن کچھ عرصہ بعد دشمنوں کے ہاتھوں سے پیوند خاک کر دیا گیا۔
خانہ کعبہ کے متعلق کتنی عظیم اور زندہ رہنے والی پیشگوئی ہے جس کی صداقت ہر زمانہ میں ظاہر ہوگی۔ اور قرآن مجید کی صداقت پر شاہد ہوگی۔

ہجرت کے بعد مکہ مراجعت کی پیشگوئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ إِلٰى مَعَادٍ یعنی جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ ضرور تجھے لوٹ کر آنے کی جگہ واپس لائے گا۔
یہاں معاد سے مراد مکہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہاں معاد سے مراد مکہ ہے (بخاری)۔ معاد سے مراد مکہ مجاہد اور ضحاک نے بھی لیا ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو یہ آیت جحفہ کے مقام پر نازل ہوئی۔ اس سے یہ مزید تائید ہوتی ہے کہ معاد سے یہاں مکہ ہی مراد ہے۔
اس زمانہ کی یہ پیشگوئی ہے جب دشمنوں نے آپ ؐ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چاروں طرف مخالفت ہی مخالفت تھی۔ ظاہری صورت میں کہیں بھی امید و یقین کی کرن نظر نہ آتی تھی۔ ان مصائب اور شدائد کی ظلمت میں آپ خدا سے خبر پا کر مکہ واپس لوٹنے کی پیشگوئی فرما رہے ہیں۔ شروع میں تو سننے والوں نے ایک مجنوں کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی ہوگی۔ لیکن ان کو کیا معلوم کہ یہ تمام کافر ایک قادر مطلق کے سامنے ہیچ ہیں۔ آخر وہی نبیؐ چند سالوں کے بعد دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ فاران کی پہاڑیوں سے جلوہ گر اہوا اور مکہ میں فاتحانہ صورت میں داخل ہوا۔ اور قرآن کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔
رومیوں اور اہل اسلام کا مغلوبیت کے بعد غالب آنا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (روم 30:2 تا 5) ''رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب کی زمین میں اور وہ

اپنے مغلوب ہونے کے بعد غالب آئیں گے۔ چند سالوں کے اندر اندر پہلے اور پیچھے اللہ کا ہی حکم ہے اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔ اللہ کی مدد سے، وہ جس کی مدد چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ غالب رحم کرنے والا ہے۔''

ان آیات میں دو پیشگوئیاں بیان کی گئی ہیں۔ ایک اس روم کی مغلوبیت کے بعد ان کا غالب آنا۔ دوم اہل اسلام کا غالب آنا۔

ایرانیوں اور اہل روم کے درمیان مدت سے مقابلہ چلا آرہا تھا۔ 602ء میں وہ عظیم الشان جنگ ہوئی جو خسرو ثانی شاہ ایران نے اہل روم سے کی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں لکھا ہے:

''اس کی افواج نے سیریا اور ایشیا کو چک کو لوٹا اور 608ء میں کیلیسڈون پر بڑھیں۔ 613ء اور 614ء میں جرنیل شاہ براز نے دمشق اور یروشلم کو فتح کیا اور مقدس صلیب کو لے گیا اور اس کے جلد بعد مصر بھی فتح ہو گیا۔

رومی کوئی مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔ کیونکہ ایک طرف اندرونی جھگڑوں سے اور دوسری طرف سلافیوں کے دباؤ سے وہ کمزور ہو رہے تھے۔

جب مکہ میں رومیوں کی مغلوبیت اور ایرانیوں کی فتح کی خبر پہنچی تو قریش نے خوشی کا اظہار کیا۔ تب ان آیات کا نزول ہوا۔ جن میں دو پیشگوئیاں ہیں:

اول۔ یہ کہ نو سال کے اندر اندر رومی اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کریں گے۔

دوم۔ مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی نصرت خاص سے نوازے گا اور وہ خوش ہوں گے۔

یہ پیشگوئیاں اس وقت کی گئیں جب کہ رومیوں کی سلطنت کا ایک بڑا حصہ ایرانیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا اور مسلمان مصائب کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ ان حالات میں رومیوں اور مسلمانوں کی کامیابی کی پیشگوئی کرنا قرآن مجید کی حقانیت اور معجزہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔

آخر قدرت الٰہیہ نے یہ معجزہ دکھایا کہ 634ء میں ہرقل اپنے علاقے کو دوبارہ فتح کر کے ایران کے اندر گھس گیا اور ان کے بڑے بڑے آتشکدوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی سال مٹھی بھر (313) مسلمانوں نے جن کے پاس نہ جنگی ہتھیار تھے اور نہ وہ خود جنگ آزمودہ تھے۔ کفار کے ایک ہزار مسلح سپاہیوں کو شکست فاش دے کر قرآن مجید کی پیشگوئی پر مہر ثبت کر دی۔

اس واقعہ میں صرف مسلمانوں کی کمزور حالت کے بعد فتح پانے کی صرف پیشگوئی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان قصص القرآن میں بھی اسی نوع کی اور پیشگوئیاں بھی مضمر ہیں۔ ان آیات میں یہ پیشگوئی مضمر ہے کہ جب کبھی بھی مسلمانوں پر کمزوری کی حالت آئے گی۔ اللہ تعالیٰ پھر ان کو اس کمزور حالت کے بعد کامیاب و کامران کرے گا۔ آج اس دور میں مسلمان مغلوبیت کی حالت میں ہیں۔ مذکورہ پیشگوئی یہ واضح کر رہی ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنی مغلوبیت سے نکل کر فاتح بنیں گے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی جو مسلمانوں کے سامنے آئے گی وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ کوئی خوش فہمی نہیں بلکہ نوشتہ تقدیر ہے۔ ایک وقت آرہا ہے کہ مسلمان اپنی کمزوریوں پر قابو پالیں گے۔ اور دشمن پر غالب آجائیں گی۔ سورۃ کہف مسلمانوں کی دوبارہ زندگی پر شاہد ناطق ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس انقلاب عظیم کو روک نہیں سکتی۔ میری سیاسی بصیرت یہ کہتی ہے اس انقلاب کا مرکز شام، مصر اور عراق وغیرہ کے علاقے ہوں گے۔ (ان شاء اللہ) وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اس انقلاب میں حصہ لیں گے اور جو اس فتح عظیم کے وقت حاضر ہوں گے۔

اے مسلمانو! اب وہ وقت دور نہیں۔ آسمان پر فیصلہ لکھا جا چکا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت خدائے توانا کے فیصلے پر غالب نہیں آسکتی۔ یہ کسی

مجنوں کی بڑنہیں یہ کوئی خوش فہمی نہیں یہ کوئی قیاس آرائی نہیں۔ یہ ایک نوشتہ تقدیر ہے۔ یہ پیشگوئی ٹل نہیں سکتی۔

تصرفات خارجیہ کے لحاظ سے معجزہ:

تصرفات خارجیہ یہ وہ بیرونی خوارق ہیں گو ان کا قرآن مجید سے ذاتی تعلق نہیں لیکن اس قسم کے معجزات قرآن مجید کے جمال اور خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔

تصرفات خارجیہ کے معجزات قرآن شریف میں کئی قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے ذریعے آسمان پر کفار کو انشقاق قمر کا معجزہ دکھایا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر 1:54) ''گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔'' چاند پھٹنے سے مراد کفار کی تباہی بھی ہے اور چاند کا انشقاق بھی ہے۔ یہ امر خلاف عادت الٰہیہ نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اجرام سماوی میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگر چاند میں تغیر آگیا جس کی خبر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے پہلے دے دی اور آپؐ نے کفار کو اطلاع دی تو کون سی بعید بات ہے۔

دوسری قسم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے عرب میں سات سال سخت قحط پڑ گیا۔

تیسری قسم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعجازی رنگ میں کفار کے شر سے محفوظ رکھ کر مدینہ پہنچا دیا۔ جب کہ کفار نے آپؐ کو قتل کرنے کے لیے گھر کا گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ آپؐ رات کے وقت پہرہ کے دوران گھر سے نکلتے ہیں اور ایک جانباز بھائی حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا دیتے ہیں اور اپنے ایک جان نثار دوست حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مدینہ کا رخ کرتے ہیں۔ راستہ میں غار ثور میں چھپتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر خارق دکھلایا کہ باوجودیکہ دشمن غار کے منہ پر پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے کبوتر کا جوڑا بھیج دیا جنھوں نے غار کے منہ پر آشیانہ بنالیا اور اس میں انڈے دے دیئے اور عنکبوت نے غار کے منہ پر جالا بُن دیا۔ یہ تمام تصرفات الٰہیہ ہیں۔

چوتھی قسم جنگ بدر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مٹھی بھر کنکریوں کا پھینکنا اور پھر کفار کا سراسیمہ ہو جانا اور کفار کے لشکر کا شکست کھا جانا یہ سب تصرفات خارجیہ ہیں۔

غرض قرآن مجید میں تصرفات خارجیہ کا ذکر بطور خارق عادت بہت جگہ آیا ہے۔ ایک طرف تو یہ تصرفات قرآن مجید کے جمال کو رونق بخش رہے ہیں اور دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور حقانیت پر شہادت دے رہے ہیں۔

حفاظت قرآن:

حفاظت قرآن کی پیشگوئی قرآن مجید میں پائی جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر 9:15) ''قرآن کو ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

اس پیشگوئی (حفاظت قرآن) پر تفصیلاً بحث گزر چکی ہے۔ مزید بحث لاحاصل اور باعث طوالت ہے۔

❁......❁......❁

منطق طیر

اعتراض:

حضرت سلیمان کا پرندوں کے ساتھ گفتگو اور پرندوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نطق پر ایک اہم اعتراض کیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں ہدہد اور نمل پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ کیسے انسانوں کی طرح ہمکلام ہوتے تھے۔ (ترک اسلام اعتراض 53,52) یہ محض من گھڑت اور پُر عجوبہ افسانے ہیں۔ ہر دور کے مشاہدے اور تجربہ کے خلاف واقعات ہیں۔

جواب:

سورۂ نمل میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم الشان دور حکومت کا ذکر ہے۔ اور اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے معترضین نے اعتراض کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ o وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ o وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ o حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ o فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ o وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىٕبِیْنَ o (النمل:27:15-20) ''اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور انہوں نے کہا سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔ اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر ایک چیز دی گئی ہے۔ یہ واضح فضل ہے اور سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں اور انسانوں اور پرندوں سے اکٹھے کیے گئے اور انہیں روکا جاتا تھا۔ (فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ، وہ بہترین نظم وضبط کے مالک تھے) یہاں تک کہ جب وادی نمل میں آئے ایک نملہ نے کہا اے نملو اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو......... اور پرندوں کو طلب کیا تو کہا کیا بات ہے۔ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا وہ غیر حاضر ہے۔

ان آیات میں جو الفاظ تشریح طلب ہیں وہ یہ ہیں۔ منطق طائر، جن، انس، نمل، ہدہد، یہی وہی الفاظ ہیں جن کے نہ سمجھنے کی وجہ سے معترضین نے اعتراض کیا ہے۔

قرآن مجید میں جو قصص بیان کیے گئے ہیں وہ محض قصے کہانیاں یا تاریخی واقعات نہیں ہیں بلکہ ان کے بیان کرنے کا مقصد صرف لوگوں کو ہدایت دینا ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے اس تاریخی واقعہ میں مسلمان کو رموز سلطنت سے آگاہ کیا گیا

ہے۔اور بتایا گیا ہے۔1۔علم کے بغیر کوئی سلطنت دیر پا چل نہیں سکتی اور بسطة في العلم ہی پہلا بنیادی اصل ہے جس کی بناء پر حکمران کو منتخب کیا جانا چاہیے۔2۔سلطنت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جس میں شرکت خاص و عام کی ہو۔3۔حکومت باہمی مشاورت سے چلائی جانی چاہیے اور دفاعی لحاظ سے مضبوط ہو۔

اب ان الفاظ کی طرف آیئے جن پر لاعلمی، ناسمجھی کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے۔منطق طائر: عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر ایک چیز دی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ طائر تشریح طلب ہے جب ''طائر'' کی وضاحت ہو جائے گی تو منطق کا مفہوم خود بخود واضح ہو جائے گا۔سورۃ نمل کی آیت 17 میں ہے: وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ اور سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں انسانوں اور طیر (پرندوں) سے اکٹھے گئے۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر تین حصوں میں منقسم تھا۔جن، انس اور طیر۔یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے، جن، انس اور طیر پیش ہوئے۔ان الفاظ کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے معترض نے اعتراض کیا ہے۔جن اور انس سے اعیان قوم اور ان کے متبعین مراد ہیں۔پہلے زمانوں میں بادشاہ مختلف سرداروں کو جاگیریں دیا کرتے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان سے ایک حصہ فوج کے اخراجات ادا کیے جائیں ان جاگیرداروں کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ ایک فوج مرتب کریں اور جب ملک کو دفاع کی ضرورت پڑے تو وہ فوج میدان عمل میں آجائے۔مغلوں کے دور میں پانچ ہزاری ہفت ہزاری امراء ہوتے تھے وہ اپنی اپنی فوج کے اخراجات بادشاہ کی عطا کردہ جاگیر سے ادا کرتے تھے۔

حضرت سلیمان کو سباء یمن کی طرف سے حملے کا خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے سرداران (جن) اور متبعین (انس) اور طیر کو جمع ہونے کا حکم نافذ کر دیا۔

جن اور انس پر مختصر بحث:

جِنٌ، جَنَّ سے مشتق ہے جن کے معنی ''ڈھانک لینے'' یا ''مخفی کر دیے گئے'' ہیں۔اس لیے جن کے معنی وہ مخلوق ہے جو نظر سے اوجھل ہو، عربی زبان میں اس کے وسیع معانی ہیں اور مختلف لوگوں پر بولا جاتا ہے امراء پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ وہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔عام لوگوں سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔پہاڑ اور جنگل کے باشندوں پر بھی یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔امراض کے جراثیم پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔کیونکہ وہ خوردبین سے ہی نظر آتے ہیں۔اسی طرح اس مخلوق کو بھی ''جن'' کہہ دیا جاتا ہے جو انسان کے اندرونی جذبات کو تحریک دیتے ہیں۔تبریزی نے شرح حماسہ میں لکھا ہے کہ اہل عرب ایسے شخص کو جو معاملات میں تیز اور زود رس ہو جن کہہ دیتے تھے۔چنانچہ اسی بناء پر فَمَا نَفَرتْ جِنِّي میں جن سے مراد وہ رفیق لیے گئے ہیں جو ''جن'' کی طرح تھے۔لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جس میں شاعر اپنی معشوقہ کو جِنّی کے نام سے خطاب کرتا ہے۔جہاں لسان العرب میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو جنیة کی طرح ہو۔اپنے حسن و جمال میں یا اپنی تلون مزاجی میں کیونکہ انسان جنوں سے عشق نہیں کرتا۔اشعار جاہلیت میں ہے: بِخَيلٍ عَلَيْهَا جِنَّةٌ عَبْقَرِيَّةٌ ایسے گھوڑوں پر کہ ان پر عبقری جن سوار تھے۔اور ایک میں ہے جن اذا فزعوا انس اذا امنوا۔جہاں باوجود جن اور انس کے مقابلہ کے جن سے مراد انسان ہی ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں ''جن'' ان قوی ہیکل لوگوں پر استعمال ہوا ہے جن سے عمارتیں بنوانے اور غوطہ زنی کا کام لیا گیا تھا۔اور تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ لفظ جن اس قسم کے لوگوں پر بولا جائے تو عربی لغت و محاورہ کے خلاف نہیں۔قرآن مجید میں جس

آیت میں ''جن اور انس'' اکٹھے آ جائیں تو اس سے مراد خواص اور عوام ہوتے ہیں اور ایک ہی جنس بنی آدم کی دو قسمیں ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جن وانس پیش ہوئے تو ان سے مراد اعیان قوم اور ان کے متبعین ہیں۔ اعیان کو صرف جاگیردار ہونے کی وجہ سے ہی ''جن'' نہیں کہا گیا بلکہ ان کی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے بھی جن کہا گیا ہے۔

طیر (پرندہ):

تیسرا لفظ طیر کا استعمال ہوا ہے۔ اس کے دو مطالب لیے جا سکتے ہیں ایک ''طیر'' بمعنی اسکورٹس (Excorts) کے ہیں۔ لفظ ''طیر'' تیزی کی طرف اشارہ کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے طار علیٰ متن وہ اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اڑ گیا یعنی بھاگ گیا۔

طرتُ الی کذا میں اس کی طرف اڑ کر (بہت تیزی کے ساتھ) گیا۔ طارت القوم قوم تیز تیز چلی۔ گویا ''طیر'' ''سراعا'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (القاموس)

اردو میں بھی بولتے ہیں ''میں وہاں سے اڑا''۔ یعنی وہاں سے جلدی سے چل دیا۔ پس ''طیر'' ان گھوڑ سواروں پر بولا جاتا ہے جو حکم ملتے ہی دوڑ پڑیں۔ فوج کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہر فوج کے ساتھ ایک گھڑ سوار فوج ہوتی ہے جو لشکر کے کوچ کے وقت آگے نکل جاتے ہیں اور لشکر کے لیے پانی مہیا کرتے ہیں آج کل کی اصطلاح میں اسکورٹس کہا جاتا ہے۔

آج کل اس فوجی عملے سے دشمن کے راز معلوم کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اور ان کے لیے مخصوص الفاظ اختراع کیے جاتے ہیں۔ جن کو یا تو اسکورٹس جانتے ہوتے ہیں یا بادشاہ (حکمران) جن تک مخفی پیغام پہنچانا ہوتا تھا سو ''منطق الطیر'' سے مراد وہ اختراع شدہ الفاظ ہیں جو اسکورٹ کو بتائے جاتے تھے۔ گویا حضرت سلیمان کا لشکر جن (اعیان)، (کمانڈر) انس (عام فوجی) اور طیر (اسکورٹس دشمن کے خفیہ راز معلوم کرنے والے) پر مشتمل تھا ''فَهُمْ يُوزَعُونَ'' میں یہ بتایا گیا ہے وہ لشکر بہت منظم اور منضبط تھا۔ پس جن، انس اور طیر تینوں کا تعلق بنی آدم سے تھا۔ یہ کوئی الگ الگ نوع نہیں تھے۔ بلکہ ایک ہی جنس (بنی آدم) کی تین مختلف قسمیں تھیں۔

طیر کا دوسرا مفہوم:

طیر کا ایک دوسرا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ طیر سے مراد وہ پرندے ہیں جن سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ اگلے زمانہ میں فوج کے لیے خبر رسانی کا ذریعہ پرندے ہی ہوتے تھے۔ تاریخ کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے ان پرندوں سے خبر رسانی کا کام لیا ہے۔ پرندہ جو پیغام لے کر جاتا تھا اور جو پیغام لاتا تھا وہی منطق طیر ہے۔ ان کوڈ الفاظ کو حضرت سلیمانؑ جانتے تھے۔

ہدہد:

لفظ ہدہد ہے جس پر معترضین اعتراض کرتے ہیں اور اس کو پرندوں میں شمار کرتے ہیں۔ سیاق وسباق سے یہ واضح ہوتا ہے ہدہد کسی شخص کا نام ہے جو محکمہ خبر رسانی کا انچارج تھا۔ اس کا فوج کی حاضری کے وقت موجود ہونا ضروری تھا۔ پہلے دور میں بھی اور موجودہ دور میں بھی جانوروں اور پرندوں کے نام پر لوگوں کے نام ہیں۔ مثلاً اسد، غضنفر، ولف، بھیڑیا، فاکس (لومڑی)، ''طوطا رام''، شیر باز۔ بائبل میں سلاطین بیسویں باب میں ایک شخص بن ہدد کا ذکر ہے اور ہدد ہدہد سے ملتا جلتا ہے۔ بلقیس کے والد کا نام ہدہد لکھا ہے۔ منتہی الارب اور لسان العرب میں ہے کہ هُدْهُدْ کو هداهد بھی لکھا جاتا ہے۔ پھر لکھا ہے هداهد اور هدو یمن کے قبیلے کا نام

ہے۔پس ہدہد حضرت سلیمان کے لشکر کے کسی افسر کا نام ہے۔اور وہ یمن میں ہی دشمن کے راز معلوم کرنے کے لیے گیا ہوا تھا اور اس نے دریافت کرنے پر ملکہ سبا کے تخت اور دیگر اہم امور کے متعلق حضرت سلیمان کو آگاہ کیا۔

وادی نمل:

وادی نمل جبرین وعسقلان کے درمیان ہے۔قتادہ اور مقاتل سے روایت ہے کہ وہ ارض شام میں ہے۔کعب کا قول ہے کہ وہ طائف میں ہے اور بعض کا قول ہے کہ وہ نواح یمن میں ہے۔وہ عرب کے نزدیک ایک مشہور جگہ ہے جس کا ذکر ان کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ وادی نمل چونٹیوں کی وادی نہیں بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے۔قاموس میں ہے اَلْاَبْرَقَہ مِنْ میاہ نملۃ یعنی ابرقہ نملہ کے پانیوں سے ہے۔جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نملہ کسی قوم کا نام ہے جس کے پانیوں کا یہاں ذکر ہے۔ابن عساکر نے حسن سے روایت کی ہے اس نملہ کا نام حرص تھا اور وہ قبیلہ بنو الشیصان سے تھی۔(ابن کثیر)۔عربی میں اسی طرح قوموں کے نام آتے ہیں مثلاً مازن (چیونٹی کا انڈا) لیکن ایک قوم کا نام ہے۔

معترض نے حضرت سلیمان کے لشکر کے بعض حصوں کے ناموں پر اعتراض کیا ہے۔وہ معترض کی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔حقیقت میں وہ لشکر کی تقسیم کے حصوں کے نام تھے۔جن،انس،طیر،ہدہد،ان اسماء کا تعلق مختلف اجناس سے نہیں بلکہ ایک ہی جنس (بنی آدم) کے نوع ہیں۔سب کا تعلق بنی آدم سے ہے۔ان ناموں میں ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی عظمت اور طاقت مضمر ہے۔

❁......❁......❁

خلق طیر، احیائے موتی

اعتراض:

ہندو معترضین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلق طیر اور احیائے موتی کو خلاف سنت الہیہ قرار دیا ہے۔ (ترک اسلام اعتراض 68,67) جیسا کہ عیسائی مشنریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلق طیر اور احیائے موتی کے معجزہ کی وجہ سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افضل قرار دیا ہے۔

جواب:

قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (آل عمران 49:3) ''وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشان لایا ہوں کہ میں بے شک تمہارے لیے گیلی مٹی سے پرند کی شکل یا سرشت کے مانند اندازہ کرتا ہوں۔ پھر اس کے اندر پھونکتا ہوں۔ پس وہ اللہ کے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے شب کور اور پھلبہری والے کو اچھا کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ اور جو تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھو اس کی خبر دیتا ہوں۔ یقیناً اس میں تمہارے لیے نشان ہے اگر تم مومن ہو۔''

اس آیت میں الفاظ اخلق، الطیر، الاکمه، الابرص، احی الموتی ہیں جو تشریح طلب ہیں۔ عربی زبان اور قرآن فہمی سے عدم واقفیت کی وجہ سے مذکورہ آیت کے رموز و معارف کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ اور معترض ہوئے ہیں۔

اَخْلُقُ:

خلق کے اصل معنی التقدیر المستقیم ہیں۔ یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے۔ اول فی ابداع شی من غیر اصل ولا احتداء یعنی ایک چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ کوئی نمونہ جیسے فرمایا: خلق السمٰوٰت و الارض (اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا) دوسری جگہ آتا ہے: بدیع السمٰوات والارض (آسمانوں اور زمین کو بنانے والا) اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے۔ خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے اور دوسرا ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ (اس نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ اور وہ ''خلق'' جو بمعنی ابداع ہے یعنی نیستی سے ہستی کرنا وہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ (مفردات امام راغب)

پس معلوم ہوا کہ لفظ خلق کا استعمال عربی زبان میں دونوں طرح پر ہے۔ نیستی سے ہستی کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز کے بنانے پر بھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو خالق کل شیءٍ بھی کہا ہے اس لیے وہی نیستی سے ہستی کرنے

والا ہے۔

مفردات میں آتا ہے: وَالْخَلْقُ لَایُسْتَعْمَلُ فِی کآفة الناس اِلا علی وجھیں احدُھما فِی معنی التقدیر ...... والثانی فی الکذب (مفردات امام راغب) اور کل لوگوں کے حق میں خلق صرف دو معنوں میں بولا جاتا ہے ایک اندازہ کرنے کے معنی میں اور دوسرا جھوٹ کے معنی میں۔ اندازہ کے معنی کی مثال ایک شاعر کا قول ہے: وَلَآنْتَ تَفْرِی مَاخَلَقْتَ وَبَعْضُ الْقَوْمَ یَخْلُقُ ثُمَّ لَایَفْرِی یعنی تو جوارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے۔ اور عمل میں لے آتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اسی طرح ضرب المثل ہے مَاخلقتُ اِلا فریتُ وما وعدتُ اِلاوَفَیْتُ یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں لا دکھایا میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کر دکھایا۔ جھوٹ کے معنی تخلقونَ اِفکًا قرآن مجید میں آیا ہے احسن الخالقین (المومنون 14:23) کے صحیح معنی احسن المقدرین ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں۔ یہی قرآن مجید کا فیصلہ ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ یعنی کیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (الرعد 16:13) کیا اللہ کے ساتھ انہوں نے شریک بنائے ہوئے ہیں کہ ان شریکوں نے پیدا کیا۔ مانند خدا کے پیدا کرنے کے پس پیدائش ان پر متشابہ ہوگئی۔ یعنی آپس میں مل جل گئی۔ پھر فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (النحل 16:20،21) اور جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اور وہ خود پیدا شدہ ہیں وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔

اس قسم کی آیات محکمات قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو خلق تسلیم کرنا شرک ہے۔ اس لیے آیت مذکورہ میں اَخْلُقُ لَكُمْ کے معنی یہ کرنے ''کہ میں پیدا کروں گا۔'' بالبداہت غلط ہیں۔ اس لیے خلق کے دوسرے معنی اندازہ کرنے کے ہی درست ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خالق طیر قرار دیا جائے تو اس رنگ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کی صفت خالقیت میں شریک ہو گئے۔ اس طرح وہ عیسائیوں کے دعوی کے مطابق خدا بھی ٹھہرے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ معجزہ خدا کے اذن سے دکھایا تو بھی غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا۔ جب صفت خالقیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو اس صفت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اذن دینا گویا اپنی صفت کو باطل قرار دینا ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ اَخْلُقُ کے معنی ''میں پیدا کروں گا'' صریحاً غلط ہیں۔

طیر:

یہ ظاہر و باہر ہے طیر (پرندہ) کے ظاہری لغوی معنی محکمات قرآنی کے خلاف ہیں۔ یہ ایک مسلمہ قرآن فہمی کا اصول ہے کہ جب قرآئن اور او رمحکمات ظاہر معنی لینے کے مانع اور خلاف ہو تو مجازی معنی لینا ضروری ہیں کیونکہ قرآن مجید میں عموماً یہی صورت ہے کہ وہ جسمانیات سے روحانیات کی طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً اندھوں اور بہروں کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔ زمین کا مردہ ہونے کا ذکر ہے تو اس سے مراد روحانی موت ہے۔ بارش کا ذکر ہے تو اس سے وحی الٰہی کا نزول ہے۔ جہاں تاریکی وظلمت کا ذکر ہے تو اس سے مراد جہالت ہے۔ روشنی کا ذکر ہے تو مراد نور اور ایمان ہے۔ کسی کو گدھا کہا ہے تو

اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جو کتب اس نے پڑھی ہیں ان سے فائدہ حاصل نہیں کرتا وہ اس پر محض بوجھ ہیں۔ کسی کو بندر کہا ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ بندروں کی طرح نقال ہے۔ گویا قرآن مجید استعارات اور تمثیلات سے بھرا پڑا ہے۔ یہی فصاحت و بلاغت ہے۔ یہی قرآن مجید کا حسن ہے۔ مذکورہ آیت میں لفظ ''طیر'' مجازی رنگ میں بیان ہوا ہے۔ جب طیر کا لفظ کسی نبی کے کلام میں استعمال ہو تو وہاں استعارہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پس مذکورہ آیت میں طیر سے مراد وہ لوگ ہیں جو زمین سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ نبی کی بعثت کی غرض ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے اندر تزکیہ نفس کر کے روحانیت پیدا کرے۔ ان کے اندر سے زمینی خواہشات کو ختم کرے۔ جو لوگ زمین کے کیڑے بنے رہتے ہیں قرآن نے ان کو اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ کہا ہے۔ یعنی وہ زمین سے لگ گیا۔ متاع دنیا میں منہمک ہو گیا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلق طیر سے مراد اپنی قوت قدسیہ سے روحانی آدمی پیدا کرنا ہے جن کی پرواز اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی۔

کسی نبی کا یہی معجزہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی مریضوں کو صحت یاب کر کے باخدا انسان بنا دیتے ہیں۔ یہی معجزہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ خلق طیر سے بڑھ کر دکھایا کہ وہ قوم جو فحاشی اور برائیوں میں گری ہوئی تھی اور کوئی ایسی بدی نہ تھی جس میں وہ مبتلا نہ ہوں اس قوم کو اپنی قوت قدسیہ سے بااخلاق اور باخدا بنا دیا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وہی لوگ ہیں جو آپ کی صحبت کی برکات سے فیض یاب ہو کر روحانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گئے۔ صرف چار مثال کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں تمام قوم اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ ہو گئی۔ اسی کا نام خلق طیر ہے۔ یہی کسی نبی کا کام ہوتا ہے۔ نبی شعبدہ بازی دکھانے نہیں آتا۔ وہ تو دنیا میں روحانی انقلاب پیدا کرنے آتا ہے۔ یہی کام حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ ان کی تمثیلی زبان کو غلط رنگ دے کر اعتراض کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انجیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تمثیلی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی تمثیلی زبان اختیار کی۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزوں کو اعلیٰ تمثیلی زبان میں بیان کیا جاتا۔

ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو مسیح نے کہا: ''اس لیے ان سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے۔'' (متی 12:13) حالانکہ یہ بھی تمثیل ہی ہے۔

پھر لکھا ہے ''یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا۔ تاکہ نبی نے جو کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لا کر کلام کروں گا۔'' (متی 35،34:13) پس اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کا کلام تمثیل میں بیان کیا ہے اور اسی میں حسن ہے۔

اکمہ و ابرص اور احیائے موتیٰ کی وضاحت:

جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نبی روحانی امراض کے علاج کے لیے آتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بھی دو روحانی بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ ''اکمہ وابرص''۔ اکمہ شبکوری کی بیماری ہے۔ یعنی دن کو دیکھنا لیکن رات کی تاریکی میں نہ دیکھ سکنا۔ روحانی رنگ میں

اکمہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو سکھ اور آرام کے دور میں تو حق کو پہچانتے ہیں جب مصائب کی تاریک رات آ جائے تو وہ حق کو نہیں پہچانتے۔ گو ان میں حق پہچاننے کی قوت موجود ہے لیکن مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نبی ان میں قوت اتنی مضبوط کر دیتا ہے کہ مصائب کے وقت بھی ایسی مضبوط چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاؤں ذرا بھر لغزش نہیں آتی۔

حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں وہ لوگ جو مصائب برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے حق سے منہ موڑ لیتے ہیں ان کی صحبت قدسیہ میں بیٹھ کر ایسے مضبوط ایمان والے ہو جائیں گے کہ ان مصائب اور تکالیف ان کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکیں گی۔ وہ ایمان کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہی نبی کا معجزہ ہوتا ہے وہ اپنے ماننے والوں کو استقلال کے کوہ گراں پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب کوئی شخص آپؐ پر ایمان لے آتا تو پھر ان کے دل سے کوئی مصیبت اور ترغیب ایمان کو نہیں نکال سکتی تھی۔ یہی نبیؐ کی صداقت ہے اور یہی نبی کا معجزہ۔

ابرص:

اس سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتی ہے جسے پھلبہری کہتے ہیں۔ روحانی لحاظ سے ابرص وہ بیماری ہے جن کے اعمال بظاہر اچھے معلوم ہوں لیکن درحقیقت وہ اچھے نہیں ہوتے۔ یعنی نیتوں میں فتور رہتا ہے اور ریاکاری سے کام کیا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں وہ لوگ جو محض دکھاوے کے طور پر روحانیت کا سفید لباس زیب تن کیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ریاکاری اور دکھاوے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ وہ لوگوں کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ تقویٰ سے کوسوں دور ہیں۔ جب وہ ان کی مجلس میں آئیں گے تو ان کی ریاکاری اور دکھاوے کی بیماری دور ہو جائے گی۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہو جائے گا۔ ابرص والے شخص کی سفیدی حقیقی سفیدی نہیں بلکہ یہ ایک بیماری ہے۔ ریاکار کو ابرص کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ریاکار ایک اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہے۔ دیکھنے والے کو وہ کام بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ خدا کی نظر میں وہ "بھلا کام" ریاکاری ہے۔

قرآن مجید میں دوسرے کئی مقامات پر اندھے پن، بہرے پن اور گونگے پن کو روحانی امراض قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (بقرہ 18:2) بہرے، گونگے، اندھے ہیں وہ نہیں لوٹتے۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (بقرہ 10:2) ان کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا۔ لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج 46:22) کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ ان آیات میں روحانی بیماریوں کا ذکر ہے۔ کفار کے کان، زبانیں، آنکھیں تندرست ہیں صرف وہ ان اعضا سے حق کی پہچان نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ان کی شنوائی، گویائی، بصارت ہوتے ہوئے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔ یہ ان کی روحانی بیماریاں ہیں۔ شنوائی ہوتے ہوئے حق کی بات نہیں سنتے۔ قوت گویائی ہوتے ہوئے حق کی بات نہیں کہتے۔ قوت بصارت ہوتے ہوئے نشانات نہیں دیکھتے۔ اس لیے حق اور صداقت کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ یہی روحانی امراض ہیں جن کی اصلاح کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: هُدًى وَّ شِفَآءٌ (حم 44:41) وہ ہدایت بھی ہے اور شفا بھی۔ ہدایت کے ساتھ شفا کا لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے روحانی بیماریوں کی شفا ہی مراد ہے نہ کہ جسمانی بیماریوں کی۔ پھر فرمایا شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یونس 57:10) یہ سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن امراض کی اصلاح کی تھی وہ جسمانی بیماریاں نہیں تھیں بلکہ روحانی بیماریاں تھیں۔

احیائے موتی:

اللہ تعالیٰ کا یہ ایک مسلمہ قانون اور سنت ہے کہ جو شخص مر جاتا ہے وہ دوبارہ اس دنیا میں نہیں آتا۔ ارشاد الٰہی ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (الزمر 42:39) یہاں اللہ تعالیٰ نے قبض روح کا قانون بیان فرمایا ہے کہ توفی نفس (قبض روح) دو وقتوں میں ہوتی ہے۔ موت کے وقت اور ایک نیند میں۔ نیند کی حالت میں بیداری کے وقت روح واپس آجاتی ہے جب کہ موت کی حالت میں روح واپس نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ اس کو روک رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قبض روح کی دو حالتیں بیان کردی ہیں، نیند کی حالت اور موت کی حالت، پھر یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ موت کی حالت میں روح واپس نہیں آتی۔ مردہ زندہ نہیں ہوتے۔ پھر اسی اصول کو اس آیت میں دوہرایا ہے ارشاد الٰہی ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (المومنون 23:99-100) یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک پر موت آجاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹا دے تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے اس دن تک ان کو اٹھایا جائے۔

اس آیت میں وہ سنت الٰہیہ بیان ہوئی ہے کہ انسان موت کے بعد دوبارہ اس دنیا میں نہیں آتا۔

اسی اصول کو ایک اور آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (الانبیاء 21:95) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کردیا ان کے لیے یہ قطعی سنت ہے کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جابر بن عبداللہ کے والد کو جو شہید ہوگئے تھے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ مانگتے ہو مانگو اور انہوں نے دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ سَبَقَ مِنِّيْ اَنَّهُمْ لَا يُرْجَعُوْنَ (نسائی، ابن ماجہ) میں پہلے ہی فیصلہ کرچکا ہوں کہ مردے لوٹ کر دنیا میں نہیں جائیں گے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے۔ الغرض قرآن مجید اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ مردہ دنیا میں نہیں آتا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احیائے موتی کی کیا نوعیت اور کیفیت ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ مردہ دنیا میں واپس نہیں آتا تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احیائے موتی کی ایک ہی نوعیت اور کیفیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے روحانی مردوں کو زندہ کرنا۔ یہی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں روحانی مردوں کا زندہ ہونا کئی جگہ آتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال 8:24) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کا حکم مانو جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کا نتیجہ زندگی ہے۔ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احیائے موتی کی کیفیت ہے۔ وہ اپنے فرمانبرداروں کو نئی زندگی دیں گے۔ یہی مردوں کا زندہ کرنا مراد ہے۔

خلاصہ:

مذکورہ آیت میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے وہ لوگ ہیں جن میں قوت روحانی ہے لیکن ان کی وہ قوت دبی ہوئی ہے۔

اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کی مخفی اور دبی ہوئی روحانی استعداد اور قوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں اجاگر ہو جاتی ہے۔ وہ روحانی پرواز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلق طیر۔ دوم وہ لوگ ہیں جو روحانی بینائی رکھتے ہیں لیکن جب مصائب کا دور آ جائے تو ان کی روحانی بینائی دب جاتی ہے۔ وہ اپنی روحانی بینائی سے کام نہیں لے پاتے۔ گویا مصائب کی تاریکیوں میں نور بصیرت سے کام نہیں لے سکتے۔ تو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فیضان سے ان میں وہ قوت پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ مصائب کے سامنے کوہ گراں بن جاتے ہیں۔ یہ ہے اکمہ (شبکوری) کا چنگا کرنا۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ریاکاری کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ بظاہر متقی اور درویش نظر آتے ہیں لیکن دل ان کے سیاہ ہیں وہ ریاکاری کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ وسلم کی صحبت ریاکاری کے مرض سے نجات دے گی۔

چوتھے وہ لوگ ہیں جو بالکل ہی روحانی طور پر مردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روحانی قوت سے ان کو دوبارہ زندگی دے گا۔

اس آیت میں روحانی امراض کا ذکر ہے جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دور کیا۔ اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ اسی غرض کے لیے ہی نبی آتے ہیں۔ اور یہ ان کی قوت قدسیہ کا اظہار ہے یہی معجزہ ان کی صداقت کی دلیل ہے۔

ضمنی بحث:

آیت میں چار قسم کے امراض کا ذکر کیا۔ آیت کے آخر میں آتا ہے: اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ۔ ان الفاظ کے بھی عجیب عجیب معانی کیے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں صرف یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں وہ ان کو حلال و حرام کی باتیں بتائیں گے۔ حلال روزی کمانے کے کیا اصول ہیں اور حرام روزی کمانے کے کیا اصول ہیں۔ کیونکہ حلال روزی بھی روحانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے حلال روزی کھانے اور ذخیرہ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اسلام نے حلّت و حرمت کی تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔

❀......❀......❀

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو کیوں پیدا کیا

سوال:

ہندو مناظرین نے خلق شیطان پر مختلف انداز میں اعتراضات کیے ہیں۔ایک یہ کہ خدا نے گویا شیطان کو پیدا کر کے اپنی کائنات میں اپنی طرف سے ڈاکو قزاق چھوڑ رکھا ہے۔گویا وہی لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب ہے۔دیانند نے ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہمہ دان نہیں اگر ہوتا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کرتا اور خدا میں کچھ قدرت بھی نہیں کیونکہ شیطان نے حکم نہ مانا خدا اس کا کچھ نہ کر سکا۔اور دیکھئے ایک کافر شیطان نے خدا کے چھکے چھڑوا دیے۔"(اعتراض 11)

جواب:لفظ"شیطان،ابلیس اور جن کی تشریح:

قرآن مجید میں اس سرکش غیر مرئی مخلوق کے لیے تین نام آتے ہیں:

شیطان،لفظ شیطان لغت عرب میں شطن ،شطون ،شیط سے مشتق ہیں۔جن کے معنی بالترتیب مذکور قصداً مخالفت کرنا،دور ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔جو انسان عمداً بدخواہشات کا پیرو رہتا ہے اور رحمت الٰہی سے دور ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اس لیے ایسی چیز جو انسان کو رحمت الٰہی سے دور کرنے کی باعث ہو اس کو شیطان کہتے ہیں۔صراح میں لکھا ہے کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالدَّوَابِ فَهُوَ شَيْطَانٌ یعنی جن،انسان اور چارپایوں میں سے جو سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

ابلیس،بلس سے مشتق ہے اور ابلاس اس حزن یعنی غم کو کہتے ہیں جو نہایت شدت ناامیدی سے پیدا ہو۔(مفردات امام راغب)پس ابلیس کو ابلیس اس شدت ناامیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔

جن،لفظ جَنَّ سے مشتق ہے جس کے معنی چھپا ہوا ڈھکا ہوا ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے:جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔جنین اس بچے کو کہتے ہیں جو رحم مادر میں ہو۔جنہ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو تلوار کے مقابل میں ڈھانپ لیتی ہے۔جنوں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل بیماری کی وجہ سے ڈھانپی جائے۔جنت وہ باغ جس کے درخت زمین کو ڈھانپ لیتے ہیں یا وہ بہشت جو انسان کی نظر سے اوجھل ہے۔

عربی زبان میں لفظ جن وسیع معنی میں مستعمل ہے۔حدیث میں جن کا لفظ باریک سے باریک جراثیم کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتے۔

شیطان کی پیدائش کی حقیقت:

اللہ تعالیٰ کا قدیم سے ضدین کا قانون چلا آتا ہے،دن کے مقابلہ پر رات،نور کے مقابلہ پر تاریکی پیدا کر رکھی ہے۔یہ ضدین انسانی حیات کے لیے ضروری ہیں،اگر یہ نہ ہوں تو انسان کی زندگی ہی ختم ہو جائے۔گویا انسان کی حیات کی ترقی کا دارومدار ہی

ضدین پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نورانی مخلوق کے مقابلہ میں ظلماتی مخلوق بنائی ہے۔ ضدین سے انسان کو ایک کی خوبی اور دوسرے کی برائی دکھادی ہے۔ نورانی مخلوق داعی الی الخیر ہے اور ظلماتی مخلوق داعی الی الشر ہے۔ داعی الی الخیر کا نام روح القدس (مَلک، فرشتہ) ہے اور داعی الی الشر کا نام ابلیس شیطان یا جن ہے۔ دونوں انسان کے قریب اور مصاحب ہیں۔ روح القدس (مَلک اور فرشتہ) انسان کو نیکی کے راستہ کی ہدایت کرتا ہے۔ جبکہ شیطان (ابلیس، جن) برائی کے راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ نہ روح القدس جبراً انسان سے نیکی کرواتا ہے اور نہ شیطان جبراً برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس بارہ میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو بھی چاہے راستہ اختیار کر لے۔ اسی کے اختیار پر ہی اس کو جزا وسزا دی جائے گی۔

قرآن مجید میں آتا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی، بدی کا الہام بذریعہ شیطان ہے جو بدخیالات دلوں میں ڈالتا ہے اور نیکی کے الہام کا ذریعہ روح القدس (مَلک فرشتہ) جو نیک اور پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ علت العلل ہے اس لیے یہ دونوں الہام اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیے ہیں۔

انسانی ترقی اور ہبوط:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو طرح کے جذبات دیئے ہیں سفلی اور ملکی یا اعلیٰ۔ انسان کی ترقی یا ہبوط کا ذریعہ یہی دونوں جذبات ہیں۔ انہی دونوں جذبات کا تعلق روح القدس اور شیطان سے ہے۔ روح القدس جب نیکی کی ترغیب دیتا ہے تو انسان اپنے اعلیٰ بروحانی جذبات سے کام لے کر اس نیکی کی ترغیب کو عملی جامہ پہناتا ہے اور روحانی مدارج طے کر جاتا ہے۔ اسی طرح شیطان (ابلیس) انسان کے سفلی جذبات میں بدی کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ اگر اس تحریک کو انسان عملی شکل دے گا تو وہ روحانی ہبوط کا ذریعہ ہوگا۔ اگر شیطانی تحریک کا مقابلہ کر کے نیکی کے راستہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ انعام واکرام کا موجب بن جاتا ہے۔ گویا انسان میں دو جذبات سفلی اور اعلیٰ پائے جانے کی وجہ سے روح القدس اور شیطان کا وجود ہونا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ شیطان کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا، گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انسان کو یہ زندگی ہی کیوں دی۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب بنا کر کیوں بھیجا۔

روح القدس اور شیطان کی تخلیق انسانی زندگی کے لیے لازم وملزوم ہے۔ انسان کی روحانی ترقی اور ہبوط انہی دو غیر مرئی ہستیوں سے ہے۔ اگر انسان نیک تحریکات پر عمل کرتا ہے تو ترقی کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور اگر بدتحریکات پر عمل پیرا ہوتا ہے تو تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کے راستہ پر چلانے کے لیے فرشتہ کی تحریک کے علاوہ انبیاء بھی پیغام ہدایت دے کر بھیجے ہیں۔ تاکہ انسانوں کو خدا کی مرضی سے آگاہ کریں۔ اس کے ساتھ انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا ہے تاکہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بدی تحریک کرنے والا پیدا کیا ہے تو اس کے ساتھ نیک تحریک دل میں ڈالنے والا فرشتہ پیدا کیا۔ راہِ ہدایت دکھانے والا نبی بھیجا اور بدی اور نیکی میں تمیز کرنے والی عقل سے بھی نوازا ہے۔ تاکہ نیکی اور صداقت کی قیمت بڑھے۔ انسان کا شیطان کا مقابلہ کر کے نیکی کے راستہ پر گامزن ہونا ہی انسان کا کمال ہے۔ انسان کی پیدائش کی غرض ہی عبودیت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی۔

اگر شیطان کا کوئی وجود نہ ہو تو پھر عبودیت کا ہے کی۔ حقیقی عبودیت اسی وقت ظاہر ہوگی جب انسان کے سامنے دو راستے ہوں

ایک رستہ بدی کا اور دوسرا رستہ نیکی کا۔ جب انسان بدی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہی عبودیت کا تاج پہنتا ہے۔ وہ شخص روحانی مدارج طے کرتا ہے۔ اگر شیطان کا وجود نہ ہوتا تو دنیا میں نہ آدم پیدا ہوتا نہ نوح پیدا ہوتا نہ ابراہیم پیدا ہوتا نہ کرشن پیدا ہوتا نہ رام چندر جی پیدا ہوتا نہ بدھ پیدا ہوتا نہ کنفیوشس پیدا ہوتا نہ داؤد پیدا ہوتا نہ سلیمان پیدا ہوتا نہ موسیٰ پیدا ہوتا نہ عیسیٰ پیدا ہوتا اور نہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے۔ ان لوگوں نے اپنے شیطان پر غلبہ پایا۔ اور پھر لوگوں کو شیطان پر غلبہ پانے کے گر بتائے۔ ان گروں پر عمل کر کے انسان نے روحانی اور مادی زندگی میں ترقی کی۔ ملک اور شیطان صرف انسان کی روحانی زندگی کی ترقی اور تنزل کا باعث نہیں بلکہ یہ دونوں غیر مرئی ہستیاں انسان کی مادی زندگی کے عروج و زوال کا بھی باعث ہیں۔ کسی امتحان میں پڑے بغیر کوئی انسان انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے روح القدس اور شیطان پیدا کر کے انسان کا امتحان لیا ہے۔ اسی امتحان کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى o وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى o ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى o (النجم 53:39۔41) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اسے پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔

دوسری جگہ فرمایا: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (الانبیاء 21:94) تو جو کوئی اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہو گی اور ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔ پس برائیوں سے بچنا اور نیکی کے راستہ پر گامزن ہونا ہی انسان کی حقیقی سعی ہے۔ اور یہی سعی اللہ کے نزدیک قابل قدر ہے اور اسی سعی پر ہی اس کے انعام و اکرام کا دارومدار ہے۔

پس شیطان اور روح القدس کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری تھا تاکہ انسان کا امتحان ہو سکے۔ اس امتحان میں ہی انسان کی روحانی اور مادی ترقی یا تنزل مضمر ہے۔ اسی امتحان میں ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اس وقت ہی اجاگر ہوں گی جب انسان کے سامنے دو راستے ہوں ایک بدی کا ایک نیکی کا۔ جب انسان بدی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پس انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی پوری نہیں ہو سکتی تھی اگر شیطان کی تخلیق نہ کی ہوتی۔ پس شیطان کی پیدائش انسان کی پیدائش کی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھی۔

سوال کے دوسرے جزو کا جواب:

خدا ہمہ دان نہیں اگر ہوتا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کرتا۔ اور خدا میں کچھ قدرت بھی نہیں کیونکہ شیطان نے خدا کا حکم ہی نہ مانا اور خدا اس کا کچھ نہ کر سکا۔ اور دیکھئے ایک کافر شیطان نے خدا کے چھکے چھڑوا دیے۔

یہ اعتراض معترض کا شیطان کی پیدائش کے فلسفہ اور حکمت کو نہ جاننے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ کی حکومت میں فساد کا موجب نہیں۔ بلکہ دنیا کی روحانی اور مادی ترقی کا سبب ہے۔ جیسا کہ متذکرہ الصدر بحث میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔

ابلیس (شیطان) کا انکار سجدہ:

ابلیس کے انکار سجدہ کی وضاحت کرنے سے قبل ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنے کی حکمت بیان کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے

مرحلہ پر آدم (انسان) کو اشیاء کے ناموں کی تعلیم دی۔ یعنی اس میں استعداد علمی رکھ دی۔ یہ انسان کے کمال کا پہلا مرتبہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ملائکہ کو آدم (انسان) کی فرمانبرداری (سجدہ) کا حکم دیا۔ ملائکہ چونکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں اس لیے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد آدم (انسان) کی سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجاثیہ 13:45) جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمہارے لیے مسخر ہے۔

پس تعلیم اشیاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایسی استعدادیں رکھ دی ہیں جن سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے۔ امام بیضاوی نے یہی معنی کیے ہیں: او التذليل والانقياد بالسعي في تحصيل ماينوط به معاشهم ويتم به كمالهم یعنی یا مراد اس سے فرشتوں کا جھک جانا اور فرمانبردار رہنا ہے۔ بذریعہ کوشش کے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن سے ان کی معاش کا تعلق ہے۔ جن سے ان کا کمال پورا ہوتا ہے۔ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آدم سے مراد بنی آدم ہے۔

پس ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں تکمیل نفس اور تسخیر کائنات کے لیے جو استعدادیں رکھ دی ہوئی ہیں ان کو اجاگر کرنے میں معاون بنیں۔

ابلیس (شیطان) کے انکار سجدہ سے مراد یہ ہے کہ وہ تکمیل نفس اور تسخیر کائنات میں حارج ہو۔ اگر انسان کی تکمیل نفس کے لیے ہی ہستیاں ہوں اور اس کے راستہ میں کوئی روک حائل نہ ہو تو اس میں انسان کا کیا کمال ہے۔ انسان کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب اس کے سامنے اچھائی اور برائی کے دو راستے ہوں۔ پھر انسان اپنے نفس پر قابو پا کر سچائی کے راستہ پر گامزن ہو۔ تب وہ اللہ کے انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کی تکمیل کے لیے ملائکہ پیدا کیے ہیں۔ اس کے دل میں نیکی اور سیدھے راستہ کی تحریک پیدا کریں اور اس کے ساتھ شیطان کو بھی پیدا کر دیا ہے کہ وہ اس کو نیکی کے راستہ سے بہکا دے۔ ملائکہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو راہِ مستقیم پر چلانے کے لیے انبیاء کو بھی اپنے احکام دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ انسان کو حق کا راستہ دکھائیں اس کے ساتھ عقل سلیم بھی دی ہے تاکہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ اب انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جونسا چاہے راستہ اختیار کرے۔ یہاں انسان کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ اگر وہ ملائکہ، انبیاء اور عقل سلیم کی راہنمائی کے مطابق عمل کرے گا تو انعام و اکرام کا وارث ہوگا۔ اگر وہ شیطان کے بہکانے پر راہ مستقیم سے ہٹے گا تو وہ اللہ کے غضب کا سبب بنے گا۔ یہ انسان کی پیدائش کا تیسرا مرتبہ ہے۔ انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ آیا وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت اختیار کرتا ہے یا کہ نہیں۔ عبودیت اختیار کرنے سے جنت اور اللہ کے احکام کی نافرمانی سے دوزخ ملے گی۔ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر اور قادر مطلق ہستی ہے۔ معترض نے قصہ آدم سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے کاموں کو بھی خوب جانتا ہے اور شیطان کے کاموں سے بھی بخوبی واقف ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا تعلق انسان کے مَلَکی (اعلیٰ) جذبات اور سفلی بہیمہ جذبات سے ہے۔ یہ انسان کا امتحان ہے کہ وہ کن جذبات سے کام لیتا ہے۔ قصہ آدم انسان کی عظمت اور اس کی پیدائش کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتا ہے۔

دوم اس قصہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ جو قوم اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ علمی استعداد کو

بروئے کار لائے گی وہی قوم دوسری اقوام کی مسجود بنے گی۔ اس اصول کی تصدیق تاریخ عالم کر رہی ہے کہ دنیا میں وہی قوم بام عروج تک پہنچی ہے جس نے علم کے میدان میں برتری حاصل کی ہے۔ یہی وہ فلسفہ قصہ آدم ہے جس کو معترض سمجھ نہیں سکا۔ قرآن مجید میں جو قصے درج ہیں ان میں بنی نوع انسان کے لیے نصائح اور معارف ہیں۔ جن پر چل کر انسان فرد واحد اور اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں۔

الزامی جواب:

قرآن مجید میں شیطان کا لفظ دو ہستیوں کے لیے استعمال ہوا ہے: شیاطین الجن والانس (ایک خفیہ دوسری انس (انسان)۔ یہی دو ہستیاں انسانوں کی گمراہی کا باعث ہیں۔ یجروید ادھیائے 30 میں لکھا ہے۔ پرماتما نے مختلف لوگوں کو مختلف دھرموں پیشوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ وید کے لیے برہمن، بدکاری کے لیے فاحشہ عورت، کشتری حکومت کے لیے، ویش تجارت کے لیے، شودر خدمت کے لیے۔ وید کی رو سے فاحشہ عورت کا دھرم بدکاری پھیلانا ہے۔ بدکاری کا پھیلانا ہی انسانوں کی گمراہی کا موجب ہے۔

اس کے علاوہ سوامی جی کے نزدیک تمام سناتن دھرمی ہندو گمراہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فاحشہ عورت اور گمراہ کرنے والے لوگ کیوں پیدا کیے۔ کیا اللہ تعالیٰ میں بدکاری اور گمراہی روکنے کی طاقت نہیں یا وہ روکنا نہیں چاہتا۔ جو جواب آریہ مذکورہ سوالوں کا دیں گے وہی جواب ہماری طرف سے خفیہ شیطان کے پیدا کرنے کے متعلق سمجھ لیں۔

❁……❁……❁

خدااور شیطان کا جھگڑا (قصہءآدم زبان حال سے ہے)

اعتراض:

خدا اور شیطان کا جھگڑا دھیان دے کر سنو! چڑ اسی کے مانند ایک فرشتہ بھی خدا سے نہ دبا اور نہ ہی خدا اس کی روح کو پاک کرے گا۔ پھر ایسے باغی کو جو خلق خدا کو گنہگار بنا کر غدر کرنے والا ہے خدا نے چھوڑ دیا۔ خدا کی یہ سخت غلطی ہے۔ شیطان تو سب کو بہکانے والا ہے گویا شیطان کا بھی شیطان خدا ہے۔ شیطان صریحاً کہتا ہے تو نے مجھے گمراہ کیا۔ اس سے خدا میں پاکیزگی بھی نہیں پائی جاتی اور جب برائیوں کا مخزن اور معادن خدا ہوا تو ایسا خدا مسلمانوں ہی کو مبارک رہے۔ دوسرے نیکوکار عقلمندوں کو ایسے خدا کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کا خدا تو فرشتوں سے آدمیوں سے بات چیت کرنے سے مجسم، کم علم بے انصاف ثابت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عقلمند دین اسلام کو پسند نہیں کرتے۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں، اعتراض 69)

اِسی اعتراض کو ''ترک اسلام'' کے مصنف دھرم پال نے ان الفاظ میں کیا ہے ''گمراہ کنندہ تو خود خدا ہے پھر نبیوں کو ہدایت کے لیے اور کتابوں کو نازل کرنا لغو ہے۔ اور شیطان کو خواہ مخواہ بدنام کرنا ہے۔ ثبوت کے لیے دیکھو یہ آیت وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (بنی اسرائیل)۔ (ترک اسلام مصنفہ دھرم پال (سابق عبدالغفور، اعتراض 10)

جواب:

1۔ شیطان کی پیدائش کی غرض وغایت بیان کی جا چکی ہے۔

دوم۔ خدا اور شیطان کے جھگڑے کا ذکر کیا ہے۔ قصہ خلق آدم قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیات 30۔38 میں بیان ہوا۔ اس کے علاوہ قصہ خلق آدم وملائکہ وابلیس قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ ایک دوسری جگہ پر آتا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔

یہ وہ آیت ہے جس کی بناء سوامی دیانند جی نے خدا اور شیطان کا جھگڑا قرار دیا ہے۔

آدم اور شیطان کا قصہ زبان حال سے:

اس آیت یا دیگر قصہ آدم والی آیات میں خدا اور شیطان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کو زبان حال سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ساری نسل انسانی مخاطب ہے۔

معترض کو لفظ ''قُلْنَا'' سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ عربی زبان میں قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے۔ یعنی زبان سے لفظ ادا کرنا۔ اور جو دل میں تصور کر لیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کو بیان کیا جائے اس پر بھی ''قول'' استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ (المجادلہ 8:58) ''اور وہ اپنے دلوں میں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کیوں ہمیں اس پر عذاب دیتا۔'' اعتقاد پر بھی لفظ ''قول'' کا استعمال کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی حالت پر جو کسی بات پر دلالت کرے اسے بھی ''قول''

کہہ دیتے ہیں۔ قالت السماء جادت و انسکبت بادل نے کہا کیا مینہ برسا۔ امتلا الحوض فقال قطنی حوض جب پانی سے بھر گیا تو اس نے کہا اب بس کرو۔ قالت لہ الطیر تقدم راشداً پرندوں نے اسے کہا اقبال مندی سے آگے بڑھو۔ ابن اثیر کہتے ہیں قول تمام افعال پر بولا جاتا ہے اور جہاں زبان سے کلام نہ ہو اس پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ قال بیدہ یعنی پکڑ لیا۔ قال برجلہ۔ چلا گیا۔ قالت لہ العینان یعنی آنکھوں نے اشارہ کیا۔ قال بالماء علی یدہ پانی ہاتھ پر ڈالا۔ قال ثوبہ کپڑا اٹھا لیا۔

لفظ ''قول'' سے یہ مراد لینا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے بالمشافہ گفتگو کی اور شیطان کا اللہ سے جھگڑا ہو گیا۔ سراسر غلط اور عربی زبان سے لاعلمی کا اظہار ہے۔ پھر قرآن مجید سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے مکالمہ و مخاطبہ سے وہی لوگ شرف اندوز ہوتے ہیں جو خدا کی صفات میں کامل طور پر رنگین ہوتے ہیں۔ شیطان جیسی پلید و ناپاک ذات سے اللہ تعالیٰ کا کلام کہاں۔ سارے قرآن مجید کلّم تکلیماً کا کوئی صیغہ شیطان کے کلام کے بارہ میں مذکور نہیں۔ لہٰذا قرآنی آیات سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کچہری میں فرشتوں اور شیطان سے بالمشافہہ گفتگو کی وہ بالبداہت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمثیلی رنگ میں زبان حال سے جو دنیا میں ہو رہا ہے بیان کیا ہے اور قول کا لفظ اس حالت پر استعمال ہوا ہے۔

قصہ آدم کا سادہ الفاظ میں مفہوم:

قصہ آدم میں تین کرداروں کا ذکر ہے آدم (بنی آدم) ملائکہ اور شیطان۔ اللہ تعالیٰ نے آدم میں اس کے عروج اور ہبوط کے لیے دو قوتیں (ملکی قوت اور سفلی (بہیمیہ) قوت) ودیعت کر رکھی ہیں۔ ان دونوں قوتوں کی تحریک کے لیے دو خارجی ہستیاں ملک (فرشتہ)، جمع ملائکہ اور شیطان (ابلیس) پیدا کیے ہیں۔ ملک، ملکی قوت (جذبات) کو تحریک کرتا ہے تاکہ انسان ترقی کے راستہ پر گامزن ہو اور شیطان، سفلی (بہیمیہ) قوت (جذبات) کو تحریک کرتا ہے تاکہ انسان تنزل کا راستہ اختیار کرے۔ ملک بھی نیکی پر چلانے کے لیے انسان پر جبر نہیں کرتا اور نہ شیطان برائی پر جبر سے کام لیتا ہے۔ انسان کا یہ اختیار ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہی امتحان اور یہی آزمائش اس کے نفس کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اگر انسان شیطان مردود کی تحریک کو رد کر کے ملک (فرشتہ) کی تحریک پر عمل کرتا ہے تو انسان خدا سے انعام و اکرام پاتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اگر شیطانی راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ وقود النار کا مستحق بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی یا بدی کے راستہ پر گامزن ہونے کے لیے ملائکہ اور شیطان ہی پیدا نہیں کیے بلکہ اللہ کی مرضی سے آگاہ کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام بھی بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو راہ ہدایت پر گامزن کریں۔ علاوہ بریں انسان کو عقل سلیم بھی دی ہے تاکہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ قصہ آدم میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر کسی انسان سے بدی کا ارتکاب ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر گر جائے اور توبہ و استغفار کرے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ و معاف کر دے گا۔ قرآنی قصہ آدم انسان کی عظمت پر دلالت کرتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کا حقیقی خلیفہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کو معترض نہیں سمجھ سکا۔

❀.....❀.....❀

گمراہ کنندہ تو خود خدا ہے

اعتراض:

ایک معترض (دھرم پال سابق عبدالغفور) نے قرآن آیت وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَلَهٗ وَلِيًّا سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ ہی گمراہ کنندہ ہے۔ (ترک اسلام، اعتراض 10)

جواب:

یہاں بھی معترض نے قرآن مجید کے طرز بیان اور عربی سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔

اضلال جس سے یُضلل نکلا ہے نتیجہ ہے ضلال کا۔ ضلال پیدا ہوتا ہے اُن انسانی طاقتوں سے جو انسان کے تابع ہیں۔ قرآن مجید نے اس مضمون کو مختلف پیرایوں میں خوب صاف کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرہ 26:2) (وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھہراتا)

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (ابراہیم 27:14) اللہ ظالموں پر گمراہی کا حکم لگاتا ہے۔

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ (مومن: 34) اللہ گمراہ ٹھہراتا ہے اس شخص کو جو حد سے نکلنے والا متردد ہوتا ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں کہ اضلال دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ اضلال نتیجہ ہو گمراہ ہو جانے کا مثلاً اگر کسی کا اونٹ گم ہو جائے تو وہ کہے گا اضللتُ البعیر، اب اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اونٹ گمراہ کر دیا بلکہ یہ معنی ہوں گے کہ میرا اونٹ گمراہ ہو گیا۔ یعنی گم ہو گیا۔ اسی طرح کسی پر گمراہ کا حکم لگایا جائے اس کے متعلق کہا جائے کہ وہ گمراہ ہو گیا تو بھی اضللتہ کہہ دیں گے۔ جیسے اس شعر میں فمازال شربی الراحی حتی...... اضلّنی صدیقی و ساء نی بعض ذالك یعنی میں شراب پیتا رہا یہاں تک کہ میرے دوست نے مجھے گمراہ قرار دیا۔ حالانکہ لفظ اضلّ استعمال کیا ہے۔ مگر مراد یہ نہیں گمراہ کر دیا بلکہ گمراہ کہا۔ دوسرا یہ کہ اضلال کا نتیجہ گمراہی ہو۔ یعنی ایک شخص دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جائے۔ مثلاً باطل کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ اضلال پہلے معنی میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے یا دوسری معنی میں۔ دوسرے معنی میں منسوب کرنے سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے سامنے باطل باتوں کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اور یہ معنی بالبداہت غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کو اچھے پیرایوں میں بیان کرتا ہے اور ان کی طرف بلاتا ہے۔ پس لازماً پہلے معنی ہی لیا جائے گا اور مراد صرف یہ ہوگی اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ پا کر گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان پر گمراہی کا حکم لگا دیتا ہے۔ یعنی ان کی گمراہی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا گمراہ ہونے کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی قومًا فاضلھم یعنی نبی کریم ایک قوم کے پاس آئے اور ان کو گمراہ پایا۔ یہ معنی نہیں کہ ان کو گمراہ کیا۔

پس آیت مذکورہ کے معنی یہ نہیں ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ کیا۔ بلکہ یہ معنی ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ان پر گمراہی کا حکم لگایا۔ لفظ فاسقین اسی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے گمراہی کا حکم لگایا ہے وہ فاسق یعنی اللہ کی حدود اور احکام کو توڑنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ اضلال کے معنی ابطال اور اہلاک کے بھی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ (محمد 1:47) جو لوگ منکر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اللہ نے ان کے اعمال باطل کر دیے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (سجدہ 10:32) وہ کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں نابود ہو جائیں گے کیا ہمیں نئی پیدائش ملے گی۔

پس جس آیت کی بناء پر معترضین نے اعتراض کیا ہے اس کے معنی یہ ہوں گے۔ اور جس کو وہ ہلاک کرتا ہے تو اس کا کوئی اور والی وراہ نما نہیں پائے گا۔

متذکرہ الصدر بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے اضل کے معنی گمراہ ٹھہرانا،، برباد، ہلاک کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ موقع ومحل کی مناسبت سے معنی کیے جائیں گے۔

مثال کے طور پر کسی ملزم کو کسی جج کی عدالت میں پیش کیا جائے۔ جج شہادتوں کی بناء پر اس ملزم پر فرد جرم عائد کر دیتا ہے۔ پھر اس کو سزا دے کر جیل میں بھیج دیتا ہے۔ تو وہ ملزم اپنے کردہ جرم کی وجہ سے جیل میں بھیجا گیا ہے نہ کہ جج نے اسے بلا وجہ بھیج دیا ہے۔ جج نے تو صرف اس کو مجرم پایا ہے۔ سزا دے دی ہے۔

اللہ تعالیٰ عادل اور منصف اعلیٰ ہے، وہ کسی کے گناہوں کی وجہ سے ہی مجرم ٹھہراتا ہے اور اس پر فرد جرم عائد کرتا ہے۔ خود کسی کو گناہ پر آمادہ نہیں کرتا۔

معترض نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب کو یونہی اعتراض کا حصہ بنا کر بزعم خویش لغو قرار دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اپنی صفت رحمانیت کے تحت انسان کے سکھ اور آرام کے لیے بے شمار اشیاء پیدا کی ہیں۔ اور ظاہری اور باطنی استعدادیں اور قوتیں دی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عائلی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور روحانی زندگی کو خوشنما بنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا۔ تاکہ ان کی ہدایت پر عمل کر کے انسان بہتر ثمرات حاصل کرے۔ دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ انسان کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہے۔ اسی طرح انسان کی راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو احکام دے کر بھیجا ہے۔ یہ بھی انسان کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر احسان عظیم ہے۔ جس کو معترض لغو قرار دے رہا ہے۔

❀......❀......❀

اللہ کا دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگانا

اعتراض:

اگر خدا نے ہی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے اور اس لیے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا بھی قصور نہیں یہ قصور بھی خدا ہی کا ہے۔ ایسی صورت میں انہیں آرام و تکلیف گناہ و ثواب نہیں ہوسکتا۔ پھر ان کو سزا جزا کیوں ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے گناہ و ثواب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں، اعتراض 5) نیز یہ اعتراض صرف سوامی دیانند جی نے ہی نہیں کیا بلکہ دھرم پال نے اپنی کتاب ''ترک اسلام'' میں ان الفاظ میں کیا ہے ''خدا نے دلوں پر مہر لگا دی اور کانوں پر پردے ڈال دیے تو انبیاء کا بھیجنا حماقت ہے خدا خود دوزخ میں جاوے۔ (اعتراض نمبر 20)

جواب:

یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت کی بناء پر کیا گیا ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ 7:2)۔ ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

دلوں پر مہر سے مراد:

امام راغب نے مفردات میں دلوں پر ختم یا مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی طرح پر حق و صداقت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تو اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھے سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے۔ گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں: یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (الانعام 25:6) میں یا جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً (مائدہ 13:5) میں استعارہ ہے۔

خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے:

قرآن مجید کا یہ طرز بیان ہے کسی ایک جگہ اشارہ ہے تو اس کی وضاحت کسی دوسری جگہ پر کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی آیت کی وضاحت ان آیات میں کر دی ہے: كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (مومن 35:40) اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (مطففین 14:83) ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عملوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء 155:4) اور ان کے یہ کہنے سے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مہر کا لگنا انسانوں کے اعمال کا

نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ایک قانون ہے کہ جن قویٰ سے کام نہ لیا جائے وہ قویٰ بتدریج اور آہستہ آہستہ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان سے بالکل کام نہ لیا جائے تو وہ معطل اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ ان پر یہ استعارہ صادق آتا ہے کہ ان قویٰ پر مہر لگ گئی ہے۔ ہر گناہ کرنے والا یہ دیکھ لے جب وہ کوئی پہلی برائی کرتا ہے تو اس کے ملکی قویٰ مضطرب ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے وہ ہر روز برائی کرتا چلا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اضطراب اور حیا جو پہلے دن اس بدکار کو لاحق تھا، ختم ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت مجازی طور پر بولا جاتا ہے کہ مہر لگ گئی ہے۔ یہ اس بدکار کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ عام محاورہ ہے کہ جب کوئی ناصح کسی کو نصیحت کرے اور وہ بالکل توجہ نہ دے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کی عقل پر پردہ پڑھ گیا ہے۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گیا ہے۔ اس کے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اس کی سمجھ پر تالے لگ گئے ہیں۔ کیا ان مجازوں سے حقیقت مراد ہوتی ہے۔ یہ مجازات ہیں۔ یہ مجاز اس وقت استعمال ہوتا ہے جب انسان اپنے قویٰ کو معطل کر دیتا ہے۔

دلوں اور کانوں پر مہر لگنے سے مراد یہ ہے کہ ان سے غور و فکر کی عادت ختم ہو گئی ہے۔ ہدایت کے سورج کی روشنی ان کے سامنے ہے لیکن وہ روشنی سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ ظلمت اور گمراہیوں کی وادی میں بھٹکنا پسند کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کا قصور نہیں۔ خدا نے ان کو دل دیا تھا کہ غور و فکر سے کام لیں۔ کان دیے تھے کہ حق بات سنیں۔ آنکھیں دی تھیں کہ سچائی کی نشانیاں دیکھیں مگر انہوں نے اللہ کے عطا کردہ قویٰ سے کام نہ لیا تو ان پر مہریں لگ گئیں اور پردے پڑ گئے۔ یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

یجروید میں بھی اللہ تعالیٰ کی حمایت اور عنایت سے محروم ہونے کو موت کہا گیا ہے۔ ''جو پرمیشور علم وغیرہ عطا کرنے والا اور جس کے ظل حمایت و پناہ و عنایت سے محروم ہونا ہی موت یعنی متواتر جینے مرنے کے چکر میں پڑنا ہے۔'' (ادھیائے 25 منتر 13)

اس منتر میں بھی وہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں حد سے گزر جاتا ہے اور اللہ کی پناہ سے محروم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نافرمانیوں کی حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کو قرآن مجید نے موت بھی کہا ہے۔ یجروید میں مہر ثبت کرنے کی جگہ موت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ اسی مفہوم کو سوامی جی نے ستیارتھ پرکاش میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ الفاظ الگ الگ ہیں لیکن مفہوم ایک ہی ہے۔ سوامی جی بودھوں کی بے دینی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے کس درجہ اپنی اودیا (جہالت) کی ترقی کی ہے جس کی نظیر سوائے ان کے دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ یقین تو یہی ہے کہ وید اور ایشور سے مخالفت کرنے کا ان کو یہی نتیجہ ملا ہے۔'' (سملاس 12 نمبر 127)

قرآن مجید کی سورہ بقرہ آیت 7 میں دلوں، کانوں پر مہر ثبت سے مراد جہالت کی انتہا ہے۔ مہر ثبت کرنے کا محاورہ مجازی رنگ میں ہے جس سے مراد صرف خدا سے دوری ہے۔ اسی مفہوم کو سوامی جی نے ستیارتھ پرکاش اور یجروید میں بندوں کی گمراہی اور خدا سے دوری کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

❁......❁......❁

اللہ تعالیٰ کا مرض کو بڑھانا

اعتراض:

بھلا بلاقصور اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی اور رحم نہ آیا؟ بیچاروں کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ کیا یہ شیطان سے بڑھ کر شیطنت کا کام نہیں؟ کسی کے دل پر مہر لگانا، کسی کی بیماری بڑھانا خدا کا کام نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بیماری کا بڑھنا اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 6)

جواب:

یہ اعتراض فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (بقرہ 10:2) پر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ مرض دوطرح پر استعمال ہوا ہے جسمانی مرض جیسے قرآن مجید میں آتا ہے لَا عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ (النور 61:24) یعنی مریض پر کوئی تنگی نہیں۔ دوسرے روحانی امراض یعنی رذائل اخلاق پر مثلاً نفاق، جہالت، بخل، جبن وغیرہ۔ مذکورہ آیت میں منافقین کا ذکر ہے۔ وہ بیماری نفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بیماری کا بڑھانا اس رنگ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے رہا ہے۔ مسلمانوں کی اس ترقی کو دیکھ کر منافقوں کے نفاق کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ ان کے دل تو یہ چاہتے تھے کہ اسلام تباہ و برباد ہو جائے۔ تباہی اور بربادی کے منصوبے بھی گھڑے اور منافقوں کے منصوبے دھرے کے دھرے ہی رہ گئے اور مسلمان کامیاب و کامران ہوتے ہی چلے گئے۔ پس مسلمانوں کی کامیابی اور شان و شوکت ان کے دلوں کی بیماری بڑھ جانے کا موجب ہے۔ چونکہ اسلام کی ترقی کے اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے تھے۔ قرآنی محاورہ کی رو سے مرض کا بڑھانا اللہ کی طرف سے منسوب کیا گیا ہے۔ دوم مرض کے بڑھنے کی وجہ آیت کے آخر میں بھی بیان کر دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے: بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ یعنی ان کی بیماری کی وجہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

اگر سوامی جی ویدوں کو غور سے پڑھ لیتے تو اس قرآنی طرز بیان کو وہاں بھی پا سکتے تھے۔ چنانچہ رگ وید اشٹک 1، ادھیائے 3 اور رگ 18 منتر 3 میں ہے: ''میں بدکار ظالموں کو کبھی آشیرباد (نیک دعا) نہیں دیتا۔'' یعنی ان کو ہدایت اور برکت سے نہیں نوازتا۔ اس منتر میں اشیرباد کا نہ دینا خدا کی طرف منسوب ہے۔ ساتھ لفظ بدکار ظالم ہے۔ یعنی یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ بدکار ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ہدایت نہ دینے کی وجہ ان کی بدکاری اور ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے لیے ہدایت چاہتا ہے اسی وجہ سے اس نے سلسلہ انبیاء جاری کیا اور انبیاء علیہم السلام کو احکام دیے۔ تاکہ لوگ ان پر عمل کر کے راہ ہدایت پائیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ چاہے تو وہ اللہ کے بتائے ہوئے راہ ہدایت پر گامزن ہو چاہے گمراہی کا راستہ اختیار کرے۔

سوامی جی نے قرآنی طرز بیان کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے حالانکہ منافقوں کی بیماری کا بڑھانا ان کی تکذیب ہے جیسا کہ

جج کی عدالت میں کسی مجرم کو سزا دی گئی تو وہ سزا اس کے جرم کی وجہ سے دی گئی ہے۔ وہ سزا جج کی ہی طرف منسوب ہوتی ہے کہ فلاں جج نے اس مجرم کو یہ سزا دی ہے۔ یہ عام محاورہ ہے۔

اعتراض:

دھرم پال نے اسی رنگ میں اپنی کتاب ترک اسلام میں اعتراض کیا ہے ''خدا پاکیزگی پسند ہے پھر ناپاک کو پاک کرنا نہ چاہا۔ ناپاکی اور گمراہی بڑھاتا ہے۔'' (اعتراض 11)

جواب:

تارک اسلام نے سورہ مائدہ کی آیت 41: لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ اور سورۃ توبہ آیت 125 زَادَتْهُمْ رِجْسًا پر اعتراض کیا ہے۔ اصولی طور پر اس کا وہی جواب ہے جس کا اوپر تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے۔ کافروں اور منافقوں کے دلوں کو پاک نہ کرنا اور ان کی ناپاکی کو بڑھانا ان کے اپنے اعمال سیہ کی وجہ سے تھا۔ ناپاکی اور گندگی کے بڑھانے کے اسباب خود ان کے ہاتھوں سے جمع کیے ہوئے تھے۔ ان کے اعمال سیہ کی وجہ سے اللہ کا غضب بھڑکا اور ان کی عدم تطہیر اور ناپاکی پر فتویٰ لگا دیا۔

❀......❀......❀

آدم کے بہشت اور درخت پر اعتراض

اعتراض:

دیکھئے خدا کی کم علمی ابھی بہشت میں رہنے کی دعا دی اور ابھی کہا کہ نکلو اگر خدا مستقبل کے فیصلے کو جانتا ہوتا تو دعا ہی کیوں دیتا؟ اور خدا شیطان کو سزا نہ دینے سے کم ہمت بھی معلوم ہوتا ہے وہ درخت کس کے لیے پیدا کیا تھا کیا اپنے لیے یا دوسرے کے لیے؟ اگر دوسرے کے لیے تو کیوں آدم کو روکا۔ ایسی باتیں نہ خدا کی اور نہ کلام اللہ کی ہو سکتی ہیں۔ حضرت آدم خدا سے کتنی باتیں سیکھ آئے تھے۔ اور وہ زمین پر کس طرح آئے۔ کیا وہ بہشت پہاڑ پر ہے۔ یا آسمان پر؟ وہاں سے کیسے اُتر آئے۔ پرندوں کی مانند اڑ کر یا پتھر کی طرح گر کر۔ جب حضرت آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے معلوم ہوتا ہے بہشت میں بھی مٹی ہوگی۔ اور جتنے وہاں فرشتے وغیرہ ہیں وہ بھی مٹی کے ہوں گے۔ کیونکہ مٹی کے بغیر جسم کے اعضاء نہیں بن سکتے اور خاکی جسم ہونے کی وجہ سے مرنا بھی ضرور لازم آئے گا۔ پھر بتائیے وہ موت کے بعد کہاں جائیں گے؟ اگر کہو کہ وہاں موت نہیں تو ماننا پڑے گا کہ وہ پیدائش بھی نہیں۔ ایسی صورت میں قرآن کی یہ بات کہ بیویاں ہمیشہ جنت میں رہتی ہیں غلط ہو جائے گی۔ کیونکہ انہیں بھی مرنا ہوگا اور اس طرح جو بہشت میں جائیں گے وہ بھی آخر کار مریں گے۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب، اعتراض 12)

ترک اسلام کے مصنف دھرم پال نے ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے ''آدم کو مع اس کی بی بی کے بہشت میں رکھا مگر ایک درخت سے منع کیا اس کا نام کیوں نہ بتایا پھر بائبل دیکھنی پڑتی ہے۔'' (اعتراض 24)

یہ اعتراض مختلف پیرائیوں میں کیا گیا ہے۔ ایک پیرایہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے جنت سے نکال دیا تو وہ زمین پر چلے آئے۔ وہ جنت کہاں ہے جہاں سے ان کو نکالا گیا۔ دوسرے یہ کہ نبی تو معصوم ہوتے ہیں ان سے یہ گناہ کیسے ہو گیا۔

جواب:

یہ اعتراض قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (35) ''اور ہم نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا باغ میں رہو۔ اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

پہلے اصولی طور پر اس آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتا ہوں۔ جس کی ناسمجھی کی وجہ سے معترض نے اعتراض کیا ہے۔ پھر معترض کے اعتراض کے مختلف اجزاء کا جواب دوں گا۔ معترض نے اعتراض کو کئی اجزاء میں تقسیم کر دیا ہے۔ اعتراض کے جزو دو اہم ہیں ایک جزو جنت کون سی ہے۔ دوسرا جزو درخت کون سا ہے۔

آدم کی جنت:

جنت سے مراد وہ جنت لینا جو بعد الموت اعمال صالحہ کے نتیجہ میں خدا کے فضل سے ملتی ہے غلط ہے۔ کیونکہ اس جنت کے متعلق

قرآن مجید میں آتا ہے: وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (الحجر 48:15) ''اور وہ اس سے (جنت) نہیں نکالے جائیں گے۔'' جب کہ آدم کو جنت سے نکلنا پڑا۔ معلوم ہوا وہ جنت کوئی اور جنت ہے۔ یہ جنت اس دنیا کی زندگی کی جنت ہے۔ یہاں اس جنت کو اس رنگ میں بیان کیا گیا ہے کہ تم اس سے جہاں چاہو بافراغت کھاؤ اور سورہ طٰہٰ 20:118، 119 میں اس جنت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ ''تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے۔ اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے۔'' پس جسمانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو یوں جنت دی کہ اس دنیا میں اس کی تمام ضروریات کا سامان پیدا کر دیا۔ یہاں صرف چار ضروریات کا ذکر کیا ہے۔ بھوک اور پیاس کا دور ہونا۔ لباس کا مہیا ہونا اور مکان کا ملنا۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ میں انسان کے آرام کے لیے زمین و آسمان کی ہر چیز مسخر کر دی ہے۔ اب مفہوم واضح ہے کہ ایک طرف کائنات میں انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر چیز پیدا کر دی ہے۔ دوم اس میں وہ استعدادیں اور طاقتیں بھی رکھ دیں جن کو بروئے کار لا کر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانا ہی اس کے آرام اور راحت کا سبب ہے اور یہی اس کی جنت ہے۔

روحانی جنت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف تسخیر کائنات کے لیے ہی پیدا نہیں کیا کہ وہ کھائے پیئے اور آرام کی زندگی بسر کرے۔ بلکہ اس سے بھی ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ہے احکام الٰہی کی تابعداری اور اسی کا نام عبودیت ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جن و انس کو اپنی عبودیت کے لیے پیدا کیا ہے۔'' اسی عبودیت کے نتیجہ میں سکون روحانی کی جنت ملتی ہے۔ یہی وہ جنت ہے جس میں ہر ایک انسان فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ اس طمانیت کی حالت کو جنت، خود قرآن مجید نے کہا ہے ارشاد الٰہی ہے: يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝ (الفجر: 27-30) اے اطمینان یافتہ نفس اپنے رب کی طرف لوٹ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ بس میرے بندوں میں داخل ہو۔ اور میری جنت میں داخل ہو۔

ہر انسان حالت معصومیت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہی اس کی جنت ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ جنت سے نکل جاتا ہے۔

پس معترض کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جنت اس دنیا میں ہی ہے ایک جسمانی جنت ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز پیدا کر رکھی ہے۔ انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ دوسری روحانی جنت ہے۔ اس جنت سے اخراج کی وجہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہی انسان کی بے سکونی کا باعث ہے۔ یہ جنت سے اخراج ہے۔ یہ وہ عظیم فلسفہ ہے جو قرآن مجید میں قصہ آدم میں بیان کیا گیا ہے جس کی نظیر کسی دوسری کتاب سماوی میں نہیں پائی جاتی۔

اہم نکتہ:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے جہاں آدم کا ذکر ہے وہاں بنی آدم مراد ہے۔ اس ثبوت کے لیے سورہ اعراف کی اس آیت کی طرف توجہ کیجئے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (الاعراف 11:7) ''اور بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا اور پھر تمہاری شکلیں بنائیں پھر فرشتوں کو حکم دیا اس آدم کی فرمانبرداری کرو۔''

اس آیت کریمہ میں بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے کہا کہ انہیں پیدا کیا ہے پھر ملائکہ کو یہ حکم دیا ہے کہ آدم کی تابعداری کرے۔
اس آیت کریمہ میں جو آدم کو فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے وہاں مراد تمام بنی نوع انسان ہیں۔ کیونکہ آیت کا آغاز بنی نوع انسان کے خطاب سے کیا ہے کہ ہم نے تم کو (بنی آدم) کو پیدا کیا۔ اس کے بعد ذکر کیا ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ قرآن مجید کا یہ طریقہ بیان ہے کہ اس میں واحد (نوع) سے مراد جنس (تمام افراد) بھی لیا جاتا ہے۔ مذکورہ آیت میں جس پر معترض نے اعتراض کیا ہے فرد (آدم) سے مراد جنس (بنی آدم) ہے گویا ہر ایک ابن آدم آدم ہے اور وہی مسجود ملائکہ ہیں۔

شجر سے مراد:

مفسرین نے مختلف نباتات اور درختوں (گیہوں، حنظل، کھجور، کافور، انجیر) کے نام بزعم خویش بیان کیے ہیں۔ لیکن یہ وہ درخت ہیں جن کا پھل اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی شریعت میں حلال ٹھہرایا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ان درختوں کا پھل آدم کے لیے تو حرام ہو اور ان کی نسل کے لیے حلال اور جائز۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کلمہ خبیثہ (بدی) کو شجرہ خبیثہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ (ابراہیم 26:14) ''بُرے کلمہ کی مثال بُرے درخت کی مانند ہے۔'' اور کلمہ طیبہ (نیکی) کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی ہے: كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم 24:14) ''کلمہ طیبہ (نیکی) کی مثال پاکیزہ درخت کی سی ہے۔''

شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ انسان بدی سے ہی راندہ درگاہ الٰہی اور لعنتی بنتا ہے۔ اس لیے ہر نبی نے بدی سے روکا ہے۔ بدی ہی انسان کے سکون کو چھینتی ہے۔ اور دل میں ایک اضطراب پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدی کو درخت سے تشبیہ دے کر اس کے قریب تک نہ پھٹکنے کا حکم دیا ہے۔ بدی کو ہی بنی اسرائیل کی آیت 60 میں الشجرۃ الملعونہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ بدی ہی انسان کے تنزل کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اسی چیز سے روکنا تھا جو تنزل اور لعنت کا باعث ہو اور وہ چیز بدی ہی ہے۔ جس کے نہ کرنے کا حکم ہر شریعت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت اس بات کا یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہو اور نافرمانی (بدی) سے انحراف کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی تعلیم دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں مبعوث ہوئے جن پر انسان عمل کر کے اللہ تعالیٰ کا حقیقی جانشین بن سکتا ہے۔ اسی طرح ان مقدس ہستیوں نے ان نواہی سے روکا جن کے ارتکاب سے انسان تخت خلافت سے محروم ہو کر قرین شیطان بن جاتا ہے۔ پس لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے مراد وہ نواہی اور برائیاں ہیں جن کے ارتکاب سے انسان تخت خلافت سے معزول ہوتا ہے۔ اس آیت میں نیابت الٰہی کا ذکر ہے۔
نیابت الٰہی کا یہی تقاضا ہے کہ اوامر پر عمل کیا جائے اور نواہی سے بچا جائے۔ پس مذکورہ آیت میں شجر سے مراد بدی کا درخت ہے۔ قرآن نے بھی بدی کو درخت سے تشبیہ دی ہے۔ شیطان بھی ابیٰ اور استکبار (حکم عدولی) سے لعنتی بنا تھا۔ اسی ابیٰ اور استکبار سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو روکا ہے لہٰذا ابیٰ اور استکبار (حکم عدولی) ہی شجر ممنوعہ ہے۔

اعتراض کی جزئیات کا جواب:

1۔ اللہ تعالیٰ نے بہشت میں رہائش کی دعا نہیں دی بلکہ حکم اور اجازت دی کہ اس بہشت میں رہو۔ آیت کریمہ میں دعا کا کہیں مفہوم ہی ظاہر نہیں ہوتا۔

2۔ ''خدا شیطان کو سزا نہ دینے سے کم ہمت بھی معلوم ہوتا ہے'' اس کا جواب یہ ہے کہ جب شیطان حکم عدولی سے راندہ درگاہ

الٰہی ہو گیا تو اس کی سزا تو مل گئی۔

3۔درخت کس نے پیدا کیا۔اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔یہ بدی کا درخت تھا۔جس کے کھانے سے آدم (بنی آدم) کو روکا گیا۔اسی بدی کے درخت کے قریب نہ جانے کی تعلیم دینے کے لیے رام چندر جی، کرشن جی مہاراج ہندوستان میں آئے تھے۔ ہندوؤں کو اسی درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا۔

4۔''حضرت آدم خدا سے کتنی باتیں سیکھ کر آئے تھے۔'' اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت میں بتا دیا ہے (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) یعنی سب نام سکھا دیے۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے۔گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ایک طرف چیزوں کے اندر خواص رکھ دینا اور دوسری طرف انسان کے اندر علمی استعداد رکھ دی کہ وہ ان کو معلوم کرے۔یہ انسان کو علم دے دینا ہے۔دنیا میں جو علوم وفنون ہیں وہ دراصل ''عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا'' کا نتیجہ ہیں۔

5۔وہ زمین پر کس طرح آئے۔کیا وہ بہشت پہاڑ پر ہے یا آسمان پر۔بہشت کی وضاحت کی جا چکی ہے۔آدم کہیں اوپر سے نہیں آئے۔وہ اسی دنیا کا رہائشی تھا۔جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے۔قرآنی طرز بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آدم سے مراد بنی آدم ہے۔اللہ تعالیٰ کا خطاب ان سے ہے۔قرآن مجید کے الفاظ میں آسمان سے اترنے گرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

6۔جب حضرت آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تو معلوم ہوتا ہے بہشت میں بھی مٹی ہوگی.........

سوامی جی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسان (آدم) جس جوہر تخمین سے پیدا ہوتا ہے وہ زمین سے پیدا شدہ خوراک کا ہی جز ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ آدم مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔یہ نہایت ہی خوبصورت استعارہ ہے جس کو سوامی جی سمجھ نہیں پائے۔یہ ایک بیالوجیکل سائنس کا مسئلہ ہے۔ہر ایک محقق اس بات پر متفق ہے کہ انسان کی پیدائش کی اصل مٹی ہے۔یہ گویا قرآن مجید کا کمال ہے کہ پیدائش کے لیے سلسلہ کو صرف لفظ ''تراب'' سے بیان کر دیا ہے۔''خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ'' (فاطر) تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

جب انسان کی پیدائش ہی اس عالم فانی میں ہوئی تو بہشت میں مٹی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا جب آدم کی پیدائش بہشت میں ہو،قرآن مجید میں کہیں یہ ذکر نہیں آتا کہ آدم بہشت میں پیدا ہوا۔

7۔''خاکی جسم ہونے کی وجہ سے مرنا بھی ضرور لازم آئے گا وہ موت کے بعد کہاں جائیں گے.........''

اسلامی نقطہ نگاہ سے اخروی زندگی، دنیاوی زندگی کا اثر اور ظل ہے۔انسانی زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔جو پہلی زندگی کا تسلسل ہے۔صرف انسان کا خاکی جسم فنا ہوتا ہے اور روح کو انسان کے اس دنیا کے اعمال (اچھے یا بُرے) کے مطابق جسم عنایت کیا جاتا ہے۔اگر اس کے اعمال صالحہ ہیں۔تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے اور اگر اعمال بُرے ہیں تو اس کو دوزخ میں جانا ہوگا۔بہشت اور دوزخ انسان کے اپنے اعمال کے اظلال اور آثار ہیں قرآن مجید میں آتا ہے: جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الواقعہ 24:56) یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔گویا نعماء جنت اور نار جہنم لوگوں کے اعمال کی جزاء ہیں ان کے پاکیزہ اور سیہ اعمال نعماء جنت اور نار جہنم میں متمثل ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی رو سے بہشت اور دوزخ کی ابتداء اس دنیا سے ہو جاتی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ یعنی جو اپنے رب سے خائف ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔

اور دوزخیوں کے متعلق آتا ہے وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا جو شخص اس دنیا میں (روحانی) اندھا ہے اور آخرت میں بھی (روحانی) اندھا ہوگا۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ بہشت اور دوزخ کی بنیاد اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ کی روشنی میں اس دنیا میں پڑ جاتی ہے گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار ہیں۔ بہشت انسان کے اس دنیا کے ایمان اور عمل کا نتیجہ اور ظل ہے اور دوزخ انسان کے اعمال سیئہ کا ظل اور نتیجہ گویا اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ متشکل ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

8۔ ''اگر کہو کہ وہاں موت نہیں تو ماننا پڑے گا کہ وہاں پیدائش بھی نہیں۔'' یہ اعتراض غلط مفروضہ پر کیا گیا ہے۔ اسلام کے نزدیک بہشت میں نہ موت ہے اور نہ پیدائش۔ بہشت اور دوزخ محض دنیاوی اعمال کے اظلال ہیں جیسا کہ متذکرۃ الصدر بحث میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔

❁......❁......❁

”خدا نے آدم سے اس کی بی بی پیدا کی۔“

(ترک اسلام مصنف دھرم پال اعتراض 23)

جواب:

یہ اعتراض قرآن مجید کی اس آیت پر کیا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء 4:1) ”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے جوڑا پیدا کیا۔“

نفس واحدۃ سے مراد:

عموماً نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم ابوالبشر لیا جاتا ہے۔ پھر اس سے جوڑا پیدا کیا یعنی بیوی حوا۔ بیوی حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا۔ یہ تصور بائبل اور صحیح بخاری کی حدیث سے مترشح کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔ یہاں نفس واحدہ اور خلق منها زوجها کی وضاحت کرنا درکار ہے۔ دوسری جگہ جہاں یہی لفظ استعمال ہوتے ہیں: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف 7:189) ”وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ تاکہ وہ اس سے آرام حاصل کرے۔“ یہاں شخص مراد نہیں ہے بلکہ جنس کا ذکر لیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)۔ امام رازیؒ نے قفال سے اس کی مثل قول نقل کیا ہے۔ هذه القصه علی تمثیل ضرب المثل یعنی ہر انسان کو خطاب ہے کہ اسے ایک ہی انسان سے یعنی اس کے والد سے پیدا کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں خطاب عرب سے ہے مراد صرف ان کا مورث اعلیٰ ہے پس یہی دو معنی لیے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انسان ایک اصل کی شاخیں ہیں۔ ایک ہی جنس سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس جنس سے عورتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس لیے پیدائش کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ سب ایک ہی کنبہ ہے۔ کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کرنی چاہیے۔ دراصل اس آیت میں حقوق انسانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بالخصوص عورتوں اور یتامیٰ کے حقوق کی طرف معاشرہ میں ان ہی کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔

اس آیت میں مرد اور عورت کا ہم جنس ہونے کا ذکر ہے۔ نفس واحدہ سے حضرت آدم بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔ بنی نوع انسان کی اصل ایک ہی ہے اور پیدائشی لحاظ سے سب برابر ہیں۔

اسلام نے اس آیت میں بنی آدم میں کمال درجہ کی مساوات اور برابری کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ معترض نے اسی اعلیٰ تعلیم کو محل اعتراض ٹھہرا کر اپنی نادانی اور ناسمجھی کا ثبوت دیا ہے۔

حوا کا آدم سے پیدا ہونا:

خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا سے یہ سمجھا گیا کہ حوا کو آدم سے پیدا کیا گیا۔ یہ فکر بائبل سے لیا گیا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے: "آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا۔" (پیدائش 2:21، 22)

بعضوں نے غلط فہمی سے بخاری کی حدیث سے بھی یہ فکر اخذ کیا ہے اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ پہلے خلق منھا زوجھا کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔ القرآن یفسر بعضہ بعضاً کے اصول کے مطابق اس آیت کی وضاحت دوسری آیات سے کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً (الروم 30:21) اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے۔ تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

یہاں مردوں کے لیے ان کے نفسوں سے بیبیاں پیدا کرنے کا ذکر ہے پس صرف حوا ہی حضرت آدم کے نفس سے پیدا نہیں ہوئیں۔ بلکہ سب کے لیے ازواج ان کے نفسوں سے پیدا ہوتی ہیں اور مراد اس جنس سے پیدا کرنا ہے تاکہ باہم محبت اور رحم پیدا ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (النحل 16:72) اس آیت میں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہارے نفوس سے پیدا کی گئی ہیں۔ یہاں یہ ہرگز مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مرد سے عورت کے پیدا کرنے کی حکمت اور فلسفہ بھی بتا دیا کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرو۔

حدیث کی وضاحت:

یہ خیال کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے، سراسر باطل اور غلط اخذ کیا گیا ہے۔ بخاری میں کتاب النکاح میں ایک حدیث ہے اَلْمَرْاَۃُ کَالضِّلَعِ (باب المداراۃ) عورت پسلی کی طرح ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے استوصوا بالنساء خیراً فانھن خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ (باب 81 الوصاۃ بالنساء) عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو۔ کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ ان دونوں احادیث میں حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر نہیں بلکہ عموماً عورتوں کا ذکر ہے۔ ایک حدیث دوسری حدیث کی وضاحت کر رہی ہے۔ خلق من ضلع سے مراد المراۃ کالضلع ہے۔ عورت پسلی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عورت پسلی کی طرح ہے۔ یعنی اس میں ٹیڑھا پن (اعوجاج) ہے۔ ایسی مثالیں قرآن مجید میں بھی ہیں: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء 21:37) یعنی انسان میں جلد بازی پائی جاتی ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم 30:54) یعنی انسانوں میں ضعف پایا جاتا ہے۔

پس مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں میں اعوجاج (ٹیڑھا پن) پایا جاتا ہے، یہ عورت کے طبعی میلان کا اظہار ہے۔ چنانچہ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ کے بعد آتا ہے: فان ذھبت تقیمہ کسرتہ اگر تو اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ بیان یہ کیا گیا ہے کہ عورت کے طبعی میلان کی درستگی زبردستی کرنے کی کوشش کی جائے تو بگاڑ اور فساد پیدا ہوگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ہی عمدہ حکمت اور دانائی کے ساتھ مرد اور عورت میں معاشرت کا طریقہ بیان کیا ہے۔ عائلی زندگی کے خراب ہونے کی وجہ ہی اس نصیحت پر عمل نہ کرنا ہے۔

❁.......❁.......❁

اللہ تعالیٰ نے شرک کرایا

اعتراض:

''اللہ تعالیٰ نے شرک کرایا آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔'' (ترک اسلام مصنف دھرم پال سوال 18)

جواب:

یہ اعتراض آیت: ''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ '' (بقرہ 34:20)۔ (جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے نہ کی) پر ہے۔

سجدہ کے معنی فرمانبرداری کے ہیں۔ جو قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (حجر:17) اور اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (نحل:14) اور اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب، خلیفہ کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نائب (خلیفہ، رسول، نبی) کی فرمانبرداری حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ کیونکہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء5) ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔'' سورہ بقرہ کی آیت 34 میں لفظ سجدہ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید جیسا شرک اور بت پرستی کا مخالف کوئی دوسرا الہامی کلام نہیں اور شرک کی جڑ کاٹنے والا اسلام کے سوا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حم سجدہ:26) سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء:5) ''اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا کہ اس سے شرک کیا جائے اس کے علاوہ (دوسرے گناہوں کو) جیسے چاہے معاف کر دیتا ہے۔'' وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢبَعِيْدًا (نساء:5) جس نے اللہ سے شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں چلا گیا یعنی سخت بہک گیا۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (مائدہ:6) ''یہ یقینی بات ہے کہ جو اللہ سے شرک کرے اللہ جنت کو اس پر حرام کر دیتا ہے۔ اور اس کا ٹھکانہ آگ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (نساء:5) ''جس نے اللہ سے شرک کیا اس نے بڑی بدی کی بات کی۔'' وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (احقاف:26) ''اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتا ہے۔''

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (بنی اسرائیل:15) ''اور تو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ ٹھہرا۔ ورنہ تو ذلیل اور راندہ ہو کر جہنم میں گرایا جائے گا۔''

یہ ہیں چند نمونہ کی آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے سختی سے شرک کی ممانعت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے ہی حکم کی خلاف ورزی ممتنع محال ہے۔ معترض نے عربی اور قرآنی بیان سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ سجدہ فرمانبرداری کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک شاعر کے اس قول میں **قلنا له اسجد لليلى فاسجدا** جہاں اونٹ کے سر جھکانے پر اسجد کا لفظ مستعمل ہے۔

ملائکہ کے سجدہ سے مراد:

قصہ آدم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی عظمت فضیلت اور کمال کا اظہار کیا ہے۔ آدم کی پہلی فضیلت اور کمال تعلیم اسماء ہے۔ یعنی اس میں استعداد علمی کا رکھنا۔ دوسرا کمال یہ ہے کہ ملائکہ کو فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے۔ ملائکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں۔ اس لیے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد آدم کی سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اسی حکمرانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ 13:45) یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسی استعدادیں رکھ دی ہیں جن سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے۔ یہ وہ حکمت اور فلسفہ ہے جس کو معترض نہیں سمجھ سکا۔ اپنی لاعلمی کی وجہ سے آیت کو مورد اعتراض ٹھہرایا ہے۔

یہی اعتراض مولف تحقیہ نے کیا ہے کہ قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم پرستی، کعبہ پرستی، آگ پرستی، رسول پرستی سکھائی ہے۔

اس کا جواب وہی ہے جو ''ترک اسلام'' کے اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ قصہ آدم سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہادی اسلام نے ملائکہ کو آدم کے سجدہ کا حکم دیا۔ بت پرستی اور بتوں کو تو قرآن مجید نے رجس فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے فَاجْتَنِبُوا مِنَ الْاَوْثَانِ (حجر 17) پھر اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں۔ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (بقرہ) ''میرے گھر (بیت اللہ) کو بت پرستی اور بتوں سے پاک کرو۔''

پھر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح کیا تو سب سے پہلے بیت اللہ کو 360 بتوں سے پاک کیا اور اس کے ساتھ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بیعت لیتے وقت مبائع سے یہ عہدہ لیا جاتا تھا کہ وہ شرک نہیں کریں گے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ناطق ہے کہ دنیا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی بت شکن نہیں ہوا۔ آپ ؐ کی طرف بت پرستی کی تعلیم کا الزام لگانا حقائق اور صداقت سے آنکھ چرانا ہے۔ اور یہ محض تعصب کا نتیجہ ہے۔

❁......❁......❁

کعبہ پرستی
(خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے پر اعتراض)

اعتراض:

کیا یہ کم بت پرستی ہے کہ مسلمان قبلہ کو پوجتے ہیں۔ اگر قبلہ کو خدا نہیں سمجھتے تو بت پرست بھی اپنے بتوں کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ ان کے سامنے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر تم بت شکن ہو، تو تم نے بڑے بت یعنی مسجد قبلہ کو کیوں نہ توڑا۔ جب تمہیں قرآن میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے ویسا ہی پُران میں ہے۔ بت پرستی کے لحاظ سے تم میں اور پرانوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ تم بڑے بت پرست ہو۔ اور وہ چھوٹے بت پرست ہیں۔ تمہاری تو اس آدمی کی سی حالت ہے جو اپنے گھر سے بلی کو نکالنے لگے اور اس کے گھر میں اونٹ گھس جائے۔ محمد صاحب نے چھوٹے چھوٹے بتوں کو مسلمانوں کے گھروں سے نکالا۔ لیکن پہاڑ کی مانند مکے کا بڑا بت اُن کے مذہب میں داخل کر دیا، ہاں! جیسے ہم وید کے پیرو ہیں ویسے ہی تم بھی ہو جاؤ تو بت پرستی وغیرہ برائیوں سے بچ سکو گے۔ تم جب تک اپنی بت پرستی کو دُور نہ کر دو تب تک تمہیں دوسرے چھوٹے چھوٹے بت پرستوں کی تردید سے شرمسار ہو کر باز رہنا چاہیے اور اپنے آپ کو بت پرستی سے باز رکھ کر پاک کرنا چاہیے۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 30)

نیز دھرم پال مصنف ''ترکِ اسلام'' نے بھی اپنی تصنیف میں اسی الزام کو دہرایا ہے۔

جواب:

یہ اعتراض فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ پر ہے۔ ایک اعتراض کے جواب میں یہ بات اس سے پہلے قرآنی آیات سے بالصراحت کی جا چکی ہے کہ اسلام دین توحید ہے۔ قرآن مجید کا سب سے اہم موضوع ہی توحید ہے۔ توحید کے ذکر میں ہی شرک کی ہر قسم کی نفی اور تردید کی ہے۔ اور اہل قرآن اور دنیا کے ہر شخص کو مخاطب ہو کر یہ کہہ دیا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء:5) اللہ معاف نہیں کرتا کہ اس سے شرک کیا جائے۔ اس کے سوا (ہر قسم کے گناہ) کو معاف کرتا ہے۔

پھر فرمایا وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (نساء:5) جس نے اللہ سے شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں چلا گیا یعنی سخت بہک گیا۔ پھر فرمایا وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (احقاف:26) ''اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتا ہے۔''

شرک کی ہر قسم کی تردید کے ساتھ قرآن مجید توحید اور اس کی حکمت پر دلائل قاطعہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کی وجہ ہی ایک پوری سورۃ اخلاص قرآن میں ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o (کہہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ وہ کسی کا بیٹا ہے

اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ۔)

قرآن مجید میں توحید کا بدلائل اثبات اور شرک کا بدلائل رد ہونے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو شرک قرار دینا پرلے درجے کی ناسمجھی اور جہالت ہے۔

اول۔ جب کوئی مسلمان قبلہ رو ہو کر نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ ایک لفظ بھی کعبہ کو مخاطب کر کے نہیں کہتا بلکہ وہ یہ کہتا ہے وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض میں نے اپنی توجہ اس ہستی کی طرف کی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

دوم۔ استقبال کعبہ سے صرف اتنی مراد ہے کہ کعبہ کی طرف منہ ہو۔ بت پرستی کا مطلب بتوں کی پوجا ہے۔ صرف منہ کرنے سے بت پرستی نہیں ہو جاتی۔ اس کا فلسفہ کیا ہے اس کی بعد میں وضاحت کی جائے گی۔

سوم۔ نماز ادا کرتے وقت صرف نماز کی نیت کی جاتی ہے۔ کعبہ کی طرف منہ کرنے کی کوئی نیت لازم نہیں چہ جا کہ کعبہ کی عبادت کی جائے۔ صرف اللہ کی عبادت کی نیت شرط لازم ہے۔

سوم۔ اسلام کے نزدیک مستحق عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے ارشاد الٰہی ہے: وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ○ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ○ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ○ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ○ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ (الجن 72:18-23) ''اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔ اور جب اللہ کا بندہ اسے پکارتا ہوا اٹھا تو قریب تھا تو اس پر ٹوٹ پڑتے کہہ میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں۔ اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ کہہ میں تمہارے ضرر اور نفع کا اختیار نہیں رکھتا۔ کہہ کوئی مجھے خدائی عذاب سے پناہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ میرے لیے اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ ہے۔ میرا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔''

عبادت اور فرمانبرداری کی اصل وجہ امید و بیم ہے اسی واسطے بت پرست بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان سے نفع کی امید اور ضرر کا ڈر ہے۔ مسلمانوں کو کعبہ کی نسبت اس قسم کا ہرگز اعتقاد نہیں۔ ان کے نزدیک نفع و نقصان کی مالک صرف اللہ کی ہی ذات ہے۔ اس لیے وہ اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

سوم۔ مسلمان کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں۔ بیت اللہ (اللہ کا گھر) کہنے سے ہی کعبہ پرستی کا اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ فتح کیا تو اللہ کے گھر کو بتوں سے پاک کیا۔

چہارم۔ کعبہ کی دیواروں اور عمارت کا نمازی کے مقابل ہونا بالکل شرط نہیں اگر کعبہ کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں جیسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے وقت از سر نو کعبہ کی تعمیر کے وقت اتفاق ہوا تھا تو نماز ادا کی جاتی تھی۔ اگر کعبہ کی دیواریں معبود و مسجود ہوتیں تو ضرور تھا کہ اتنے عرصہ کے لیے نماز موقوف رہتی۔

پنجم۔ ابتداء نماز سے نماز کے آخر تک نماز میں تعظیم کعبہ کا ایک لفظ بھی نہیں۔ نماز اللہ اکبر کے لفظ سے شروع ہوتی ہے اور رحمۃ اللہ کے لفظ پر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا اللہ کے نام سے ہی شروع اور اسی کے نام پر ختم ہوتی ہے۔ معترض کے اعتراض میں کعبہ پرستی کا تصور کیسے آ گیا۔ لہٰذا نماز میں صرف اللہ کی عبادت ہوتی ہے کعبہ کی نہیں۔

الزامی جواب:

سوامی دیانند جی نے 33 دیوتاؤں کو مع 33 ان کی بیویوں کے اور ایشور کو 34 واں دیوتا کہہ کر شریک گردانا ہے۔ روح و مادہ، اکاش اور زمانہ کو خدا کے برابر ازلی ابدی اور لازوال غیر متغیر مان کر خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح آگ، پانی، دریا، پہاڑ، زمین، سورج اور چاند وغیرہ کو معبود قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ سانپوں کو بھی معبود قرار دیا ہے۔

کعبہ (بیت اللہ) کا بنیادی مقصد:

بیت اللہ کی پرستش کی نفی اس کی تعمیر کا مقصد ہی کر دیتا ہے۔ جب ہم تاریخی لحاظ سے کعبہ کی تعمیر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ وہ تھا بطور توحید کامل کی نشانی قرار دینا۔ اسی لیے اس تاریخی ''کوٹھے'' کا نام ہی بیت اللہ رکھا گیا ہے یعنی اللہ کا گھر۔ جب یہ ''کوٹھا'' اللہ کا گھر ہے تو پھر اس کی پرستش کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (بقرہ 2:127) ''جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج 22:26-27) ''اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر۔'' طَهِّرْ کا لفظ واضح کر رہا ہے کہ اس گھر کو ظاہری اور باطنی نجس (شرک کی پلیدگی) سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ جب یہ گھر صرف اللہ تعالیٰ کی توحید کی نشانی کے طور پر بنایا گیا ہے تو پھر یہ کیونکر جائے شرک قرار دی جا سکتا ہے۔ پھر اس گھر کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کر رہے ہیں۔ جو سب سے بڑھ کر بت پرستی کے دشمن ہیں۔ اسی ''جرم'' کی وجہ سے بت پرستوں کی عداوت کی آگ کا سامنا کرنا پڑا۔ بحکم خداوندی گھر کو چھوڑا۔ پھر خدا کے حکم سے پرانے اللہ کے گھر کو از سر نو تعمیر کیا۔ لہٰذا تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ۔ یہ گھر اللہ کا گھر ہے۔ تو اللہ کے گھر کو جائے شرک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا کام یہ کیا بیت اللہ آئے تو تمام بتوں کو بیت اللہ سے اکھاڑ پھینکا۔ پھر ساتھ کہتے جاتے تھے جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ زَهُوْقًا یعنی حق (توحید) آیا باطل (شرک) بھاگ گیا۔ باطل (شرک) نے بھاگنا ہی تھا۔ اسلام پر یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بت پرستی کا الزام لگانا تاریخی حقائق اور اسلامی تعلیم سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

حجر اسود کی حقیقت:

حجر اسود کو بوسہ دینے کو بھی پرستش قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حجر اسود جس زمانہ سے کعبہ کا وجود علم میں آیا ہے اسی زمانہ سے حجر اسود بھی وہاں موجود ہے۔ حجر اسود بیت اللہ کے زمانے کا ایک پتھر ہے۔ حجر اسود ایک بن گھڑا پتھر ہے۔ چونکہ عرب میں گھڑے ہوئے پتھروں کی عبادت ہوتی تھی اس واسطے بیت اللہ کے کونے میں بن گھڑا پتھر رکھا گیا۔ تا کہ اس کی پرستش کا خیال دل میں نہ آئے۔ یہ پتھر تصویری زبان کی علامت ہے۔ ہر زمانہ میں تصویری زبان کا معمول رہا ہے۔ سکندر اور دارا کے قصے میں تصویری زبان کی گفتگو مشہور ہے۔ عیسائی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں یسوع کے بارہ پتھر بارہ حواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہودی قربانی کو مسیح کی پھانسی کی تصویری علامت بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ختنہ کو بھی عیسیٰ کے قتل کا نشان کہتے ہیں۔ اسی طرح پولا ہلانا جس کی نسبت احبار 23 باب 10 میں حکم ہے مسیح کا جی اٹھنا مراد لیتے ہیں۔

لہٰذا حجر اسود کی شکل میں یہ تصویری زبان حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کر رہی ہے "وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا" (زبور 23:118) جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا۔ وہی کونے کا سرا ہوا۔" (متی 42:21) پیشگوئیوں میں اس پتھر سے مراد حضرت اسماعیل تھے۔ جن کو بنی اسرائیل نے رد کیا۔ اور اس کے کونے کا سرا ہونے میں اشارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ جو ساری دنیا کے لیے نبی ہوئے۔ پیشگوئی کے یہ الفاظ جو کوئی اس پر گرے گا چور چور ہوگا جس پر یہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ ظاہر کرتے ہیں کہ اس پتھر سے مراد کوئی عظیم ہستی ہے جو اس کی مخالفت میں اٹھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اور جس کی مخالفت میں وہ خود ہتھیار اٹھائے گا، وہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی جنگیں ان الفاظ کی صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔

بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا فلسفہ:

جیسا کہ پہلے کعبہ پرستی کے اعتراض کو رد کیا جا چکا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیت اللہ کو عبادت کے لیے قبلہ کیوں مقرر کیا گیا۔ اول بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا مقصد صرف مسلمانوں میں اتحاد، یگانگت پیدا کرنا مقصود تھا۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عرب وہ قوم تھی جو ریت کے ذروں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ ان کو وحدت کی لڑی میں منسلک کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ عبادت کے لیے کوئی جہت مقرر کی جاتی تاکہ ان میں وحدت کی روح پھونکی جا سکے۔ چنانچہ بیت اللہ کو اس مقصد کے لیے حصول کے لیے نماز کا قبلہ مقرر کیا گیا اور اسی سمت نے ہی مسلمانوں میں وحدت پیدا کر دی۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ کو کیوں سمت قرار دیا۔ یہ ایک واضح بات ہے بیت اللہ توحید کا پہلا گھر ہے۔ جہاں سے توحید کی آواز بلند کی گئی ہے۔ توحید کے سب سے پہلے مرکز کی عظمت اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ اس کو عبادت کی سمت قرار دیا جائے۔ تیسری بات یہ تھی کہ عرب اسی گھر کو واجب الاحترام سمجھتے تھے۔ چہارم بیت اللہ کو عبادت کے لیے قبلہ قرار دینا پہلی کتب سماوی میں بھی مذکور ہے۔

❁......❁......❁

جب خدا ہر طرف ہے تو قبلہ کی طرف ہی منہ کیوں

اعتراض:

اگر یہ سچ ہے تو مسلمان قبلہ کی طرح منہ کیوں کرتے ہیں؟ اگر کہو کہ ہم کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے تو یہ بھی حکم ہے کہ جدھر چاہو منہ کرو۔ ان دونوں باتوں میں سے کونسی سچی اور کونسی جھوٹی ہے؟ اور اللہ کا منہ تو سب طرف ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ایک منہ ایک ہی طرف رہے گا۔ ہر طرف کس طرح ہو سکتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 26)

جواب:

نکتہ چینی قرآن مجید کی آیت: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ 115:2) (پس جدھر تم متوجہ ہو گے ادھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی) پر کی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آیت کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے متعلق نہیں ہے۔ اس وجہ سے اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ کفار تمہیں بیت اللہ سے روکتے ہیں۔ اللہ کی ذات تو ہر طرف موجود ہے۔ سب سے اہم بات صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل وابستگی رکھی جائے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے کامل وابستگی رکھتا ہے وہ بھی چاروں اطراف کا مالک ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کی فتوحات کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ جن مساجد سے مسلمانوں کو روکا جا رہا ہے صرف اسی پر غلبہ نہیں رہے گا بلکہ جس طرف بھی منہ کریں گے کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ یہ کامیابی صرف اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی وجہ سے اللہ کی توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو اس بات سے بھی انتباہ کیا گیا ہے جو قوم یا شخص خدا سے منہ موڑ لیتا ہے وہ اللہ کی توجہ کا مستحق نہیں رہتا۔ تاریخ اس پیشگوئی کی صداقت ظاہر کرتی ہے کہ مسلمان کس کسمپرسی اور ناتوانی کی حالت سے اٹھے۔ صرف اللہ کی توجہ کے مستحق ہونے کی وجہ سے وہ دنیا کی غالب اور طاقتور قوم بن گئے۔ الغرض معترض اس پیغام کو ہی نہیں سمجھ سکا جو اس آیت میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا وہ پیغام دنیا کی ہر قوم کو ہے کہ ترقی اور کامیابی کا راز اللہ تعالیٰ سے وابستگی میں مضمر ہے۔

الزامی جواب:

متذکرۃ الصدر آیت میں تو اس جہت پرستی کا رد کیا گیا ہے جس کی تعلیم ویدوں نے دی ہے۔ ایک وید میں لکھا ہے:

''مشرق کا مالک اگنی دیوتا ہے۔ جنوب کا اندر دیوتا ہے۔ مغرب کا ورن دیوتا مختار ہے۔ شمال کا مختار چاند ہے۔ نیچے کا وشنو دیوتا اور اوپر کا مالک برہسپتی ہے۔ (اتھر وید 3:27:1 تا 6)

قرآن مجید میں جہات عالم کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو ہی قرار دیا گیا ہے اور وید مختلف سمتوں کو مختلف دیوتاں میں تقسیم کرتا ہے۔

قاری یہ خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ آیا وید اللہ تعالیٰ کی توحید کا سبق دے رہا ہے یا قرآن مجید۔

یجرو وید میں ہے: ''سب طرف آنکھوں والا اور سب طرف منہ والا، سب طرف بازوؤں والا اور سب طرف پاؤں والا۔'' (19:17) اتھرو وید میں ہے: ''جو سب لوگوں کا ہے اور سب طرف منہ والا ہے جو سب طرف ہاتھوں والا ہے اور سب طرف ہتھیلیوں والا ہے۔'' (26:2:13)

❁......❁......❁

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر اعتراض

اعتراض:

شیکسپیر کے ناٹک، مکالے کے مضامین اور لڑکوں کی اونٹ پٹانگ، کوّے، چیل، بندر، چڑیوں کی بولیاں بے نظیری میں قرآن کی طرح خدا کا کلام ہیں۔ (ترک اسلام مصنف دھرم پال)

سوامی دیانند جی اسی اعتراض کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''بھلا یہ کوئی بات ہے کہ قرآن کی سورتوں سی اور سورت نہ بن سکے۔ اکبر بادشاہ کے وقت مولوی فیضی نے ایک بے نقط قرآن نہیں بنالیا تھا۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 8) یہی اعتراض سلمان رُشدی کی کتاب سے مترشح ہوتا ہے۔

جواب:

یہ اعتراض قرآن مجید کی آیت: فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (اس کا مانند کوئی مثل بنا کر لاؤ) پر کیا ہے۔

قرآن کے اعجاز کے مختلف پہلوؤں پر ''قرآن مجید خدا کا کلام نہیں'' کے جواب میں بحث کی جا چکی ہے۔ قارئین اس بحث کو اپنی نظر میں رکھیں۔ یہاں بھی اسی جواب کو مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں مختصراً دہرایا جا رہا ہے۔

1۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کسی چیز کی مثل کوئی نہیں بنا سکتا۔ مکھی معمولی سی چیز ہے۔ ابھی تک کوئی سائنس دان اس کی مانند کوئی نہیں بنا سکا۔ شہد ہے، دودھ ہے۔ آج کل لیبارٹریوں میں تجزیہ کر کے اس کے اجزاء تو معلوم کر لیے گئے ہیں لیکن باوجود اجزاء کا علم ہو جانے کے سائنس دان شہد اور دودھ کی مثل نہیں بنا سکے۔ نقلی تو بنائے جا سکتے ہیں اور بنائے گئے ہیں لیکن وہ اصل کا مقام نہیں پا سکے۔ اصل، اصل ہے اور نقل، نقل ہی ہے۔ اسی اصول کے تحت قرآن مجید نے یہ تحدی (Challenge) سے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی مانند ایک سورۃ بنا لاؤ۔ لیکن نزولِ قرآن کے وقت کوئی قادر الکلام عرب اس کی مانند نہ لا سکا اور وہ دعویٰ اب بھی موجود ہے۔ اب بھی غیر مسلم ادبا موجود ہیں۔ کوئی ادیب بھی قرآن کی مانند علوم و معارف سے بھری ہوئی کتاب نہیں بنا سکتا۔

شیکسپیر، مکالے، لڑکے، کوّے، چیلوں، بندروں، چڑیوں نے بھی کبھی بے مثل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

2۔ قرآن مجید کے اعجاز کے لاتعداد اور پہلو ہیں جن کا احاطہ کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ کتاب اللہ نے کسی بھی کسی ایک پہلو کو پیش نہیں کیا کہ اس کی مانند بنا لو بلکہ عام دعویٰ بے نظیری کا کیا ہے۔ آخر قرآن مجید میں عربی کے حروف و الفاظ ہیں جن سے قرآن بنا ہے۔ آج تک ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوا جس نے عربی کے حروف و الفاظ میں کوئی کتاب تالیف کی ہو۔ پھر اس نے یہ دعویٰ کر دیا ہو کہ یہ ہے قرآن مجید کی مثل کتاب۔ آج تک تاریخ میں ایک شخص بھی نہیں گزرا جس نے قرآن کی مانند کوئی کتاب تالیف کرنے کا دعویٰ کیا ہو۔ یہی اعجاز ہے۔ قرآن مجید کی مثل کسی کا کوئی کتاب تالیف کر کے

پیش نہ کر سکتا۔ اگر کوئی کرتا تو پھر یہ بات متنازع بن سکتی تھی کہ قرآن مجید کی مثل وہ کتاب ہے یا کہ نہیں۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ کوئی جھوٹا دعویٰ لے کر بھی کھڑا نہیں ہوا۔ یہ ہے قرآن مجید کو خدائی تائید ہ کتنا بڑا دعویٰ ہے کہ کوئی مثل پیش ہی نہیں کر سکے گا۔ کسی کا پیش نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید ایک بے مثل کتاب ہے۔ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

3۔ قرآن مجید صرف زبان کے لحاظ سے اعجاز نہیں بلکہ ہدایت کامل ہونے کے لحاظ سے اعجاز ہے۔ انسانی ہدایت کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو قرآن مجید میں نہ پایا جاتا ہو۔ قرآن مجید پر مبنی علوم وفنون پر لکھی جانے والی کتب لاتعداد ہیں جن کا احاطہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن مجید ہر انسان کی ہدایت کا ہر قسم کا سامان اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

4۔ قرآن مجید اس لحاظ سے بھی بے مثل ہے کہ پہلی کتاب سماوی میں دعاوی ہیں مگر وہ دلائل سے ساکت ہیں۔ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے دعاوی کو دلائل قاطعہ سے ثابت کرتی ہے۔ اگر خدا کی ہستی کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے ساتھ دلائل بھی دیے ہیں۔ اگر قرآن مجید نے لا ریب فیہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی دلائل بھی پیش کر دیے ہیں۔ یہ وہ اعجاز ہے جو کسی کتاب میں موجود نہیں۔

5۔ قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا ہوا ہے۔ غیب کی خبر صرف مستقبل سے ہی تعلق نہیں رکھتی بلکہ ماضی سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ پھر جس ماحول میں پلے تھے ان کو ماضی کا کوئی علم نہیں تھا۔ قرآن مجید اٹھا کر دیکھ لو کہ کس خوبصورتی کے ساتھ ماضی کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ مستقبل کی غیبی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ بے کسی کی حالت میں کامیابی وکامرانی کی خبر دی تھی۔ آخر تیرہ سال بعد کامیابیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایسی ایسی غیب کی خبروں کی اطلاع دی جن کی صداقت دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثلاً فرعون کی لاش کے متعلق یہ خبر دینا کہ وہ محفوظ ہے۔ کیا نزول قرآن مجید کے وقت اس قسم کی کوئی خبر دے سکتا تھا۔ پھر یہ خبر دینا کہ مکہ مکرم ومعظم ہی رہے گا کوئی غیر مسلم اس پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح مدینہ طیبہ دجال کے فتن سے محفوظ ومصئون رہے گا۔ ذرا تاریخ پر نظر ڈالیے تمام اسلامی بلاد دشمنوں (کفار) کا نشانہ بنے۔ زیر ہوئے۔ کفار نے حکومت کی۔ لیکن مکہ اور مدینہ کفار کے تاراج سے اب تک محفوظ ہیں۔ محفوظ رہیں گے۔ کوئی غیر مسلم ان شہروں پر نہ قابض ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے کہ کتنی بڑی غیبی خبر ہے۔ اب یہ کہنا کہ قرآن بے مثل نہیں۔ محض تعصب اور اندھا پن ہے۔

6۔ قرآن مجید صرف لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہی اپنے اندر نہیں لیے ہوئے بلکہ پہلی کتب کا جامع بھی ہے۔ اس کے ساتھ شریعت کے تمام پہلوؤں کو بھی مکمل کر دیا ہے۔ پہلی کتب شریعت کے لحاظ سے نامکمل تھیں۔ قرآن مجید نے اس نقص کو دور کر دیا ہے۔ قرآن میں آتا ہے: "فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ"

7۔ دیانند نے فیضی کی تفسیر بے نقط کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے موصوف نے اس تفسیر کو پڑھنا تو کجا دیکھا تک نہیں۔ مہارشی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فیضی نے قرآن مجید کے مقابلہ میں کتاب نہیں لکھی بلکہ اس نے تو اسلام کی خدمت کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ بلکہ یوں کہیے قرآن مجید کے سامنے سرنگوں ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس معجزہ کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس آیت پر لکھتا ہے:

فاتوا بسورۃ: امصل سور لااوساطها واطوالها من مثله عدل ماارسل مدلو لا واداء احکاماً و حکما وعلوماً

او معاده محمد صلعم: وَلَنْ تفعلوا ماهوموهومكم سرملاً العلو حال السور و سوموملولها وهو كلام لامحل له۔ کہ قرآن مجید کی کسی سورۃ کے دلائل اداء بیان پُر حکمت احکام اور علوم کی مثل کبھی بھی نہ لاسکو گے۔ کیونکہ یہ سورتیں نہایت اعلیٰ کلام اور بلند مضامین رکھتی ہیں اور یہ ایسا دعویٰ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اس تفسیر کا نام سواطع الالہام اس لیے رکھا گیا ہے السواطع اللوامع لعلوم كلام الله العلام۔ واسرارد الصوالح الكرام۔ کہ اس کے اندر علم کل اللہ تعالیٰ کے کلام مجید اور اس کے اسرار وغوامض کے روشن دلائل بیان کیے گئے ہیں۔

یہ ہے سوامی دیانند صاحب کی بے علمی کہ اس نے فیضی صاحب کی تفسیر کو قرآن مجید کے مقابلہ کی کتاب قرار دیا ہے۔ جب کہ فیضی صاحب، قرآن مجید کو بے مثل کتاب قرار دے رہا ہے۔

❀......❀......❀

زمین وآسمان کا بنانا، انسانی پیدائش، استوی علی العرش، خدا زمین وآسمان پر کرسی نشین ہے سونٹے کا سانپ بننا، عصا مارنے پر پتھر میں سے چشمے پھوٹنا، موسیٰ نے لاٹھی مار کر سمندر پھاڑ دیا، عیسیٰ آسمان پر اُڑ گئے، خدا بڑا مکار ہے، حضرت صالح کی اونٹنی پر اعتراض، جبرائیل خدا سے نازل ہوتا ہے۔ محمد عربی براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر اور خدا سے باتوں کے لیے گئے،

بہشت کی نعماء پر اعتراض (دودھ، شہد کی نہریں حور وغلمان وغیرہ)

اعتراض:

چھ دن میں آسمان وزمین بنائے، ماں باپ سے انسانی نطفہ کی پیدائش، پھر آدم ومسیح کی پیدائش، سونٹے کا سانپ، پتھر سے اونٹنی، خدا مکار، فریبی۔ (ان باتوں پر اعتراض کیا)۔ (ترک اسلام مصنف دھرم پال)

(یہ اعتراض قرآن مجید کی آیت لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ''اگر (قرآن مجید) غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔''

ستیارتھ پرکاش کے مصنف نے ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے:

''آسمان یعنی آکاش پیدائش نہیں ہے بلکہ ازلی ہے۔ آسمان کی پیدائش لکھنے سے قرآن کا مصنف اپنے آپ کو علم طبعی یعنی سائنس سے بالکل ناواقف ظاہر کرتا ہے کیا خدا کو دنیا پیدا کرتے وقت چھ دن لگ گئے۔ پھر بتایئے خدائی کُــن کہنا اور دنیا کا پیدا ہونا کہاں گیا؟ پھر خدا کا عرش پر قرار پکڑنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ حاضر وناظر نہیں۔ اگر خدا کام کرنے کی تدبیر کرتا ہے (سوچتا ہے) تو خدا اور انسان میں کیا فرق رہا۔ اور اس کی ہمہ دانی کہاں گئی؟ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو نہ جاننے والے جنگلی لوگوں نے قرآن کو بنایا ہے۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (یونس:3) پر اعتراض کیا گیا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش باب چودھواں اعتراض نمبر 88)

جواب:

دونوں اعتراضات مختلف جزئیات پر مشتمل ہیں لہٰذا ہر جزو پر الگ الگ بحث کی جائے گی۔

آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد:

یہ اعتراض معترض نے اپنی کم علمی کی وجہ سے یوم کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا ہے۔ اس لیے لفظ ''یوم'' کی وضاحت کرتا ہوں۔

یوم سے عموماً مراد وہ وقت ہے جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدت ہوتی ہے۔ خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت زیادہ۔ (مفردات امام راغب)۔ چنانچہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (الرحمٰن 29:55) میں یوم سے مراد ایک آن اور لمحہ ہے۔ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج 4:70) میں ایک یوم پچاس ہزار سال کا فرمایا۔ گویا عربی زبان

میں یوم کا لفظ قلیل سے قلیل وقت کے لیے بھی اور لمبے سے لمبے عرصہ کے بھی استعمال ہوتا ہے۔

وہ یوم جس کو ہم دن کہتے ہیں جو طلوع آفتاب اور غروب سے تعلق رکھتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ظہور میں آیا۔ پس آسمانوں اور زمین کی خلق کے ذکر میں کبھی بھی مراد چوبیس گھنٹے کا دن رات نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے عام معنی وقت ہی مراد ہیں جو تمام حد بندیوں سے آزاد ہے۔

آسمان اور زمین کی پیدائش:

اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ربّ ہے۔ سورہ فاتحہ میں پہلی صفت ہی رب العالمین بیان کی گئی ہے یعنی وہ ہستی جو ہر چیز کو تدریجاً درجہ کمال تک پہنچانے والی ہے۔ لہٰذا زمین کی پیدائش تدریجاً اپنے کمال تک پہنچی ہے۔ دیکھئے سورۃ مومنوں کے پہلے رکوع میں انسان کی پیدائش کے چھ مراتب بیان کیے ہیں۔ نطفہ، علقہ، مضغہ، مضغہ سے ہڈیوں کا پیدا ہونا پھر سارے اعضا کا ٹھیک ہو کر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھ جانا۔ پھر اس میں زندگی پیدا ہونا۔ اس کے مقابل پر اسی سورہ میں روحانی خلق کے چھ ہی مراتب بیان کیے ہیں۔ دور حاضر میں سائنس نے بھی زمین کی موجودہ حالت تک پہنچنے میں چھ مراتب بیان کیے ہیں۔ ایک وہ حالت جب یہ انگارے کی صورت میں تھی۔ دوسری وہ حالت جب وہ انگارہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوا۔ اور پانی وغیرہ الگ ہوئے۔ تیسری حالت جب زمین کا قشر بہت موٹا ہو گیا۔ پہاڑ وجود میں آگئے۔ چوتھی حالت جب نباتات بنیں۔ پانچویں حالت جب حیوانات پیدا ہوئے۔ چھٹی وہ حالت جب اشرف مخلوقات انسان بنا۔ اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کی پیدائش میں چھ مراتب نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں بھی چھ مرتبے بیان کیے گئے ہیں۔

پس مذکورہ آیت جس پر اعتراض کیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کو موجودہ حالت تک پہنچنے میں چھ مراتب میں سے گزرنا پڑا۔ پھر یوم سے مراد چوبیس گھنٹے کا دن مراد نہیں بلکہ قرآن مجید میں یوم سے مراد پچاس ہزار سال بھی ہے۔ لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ زمین کو چھ مراتب میں سے گزرنے پر کتنا وقت لگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر کمال چھ مراتب طے کرنے کے بعد کامل ہوا ہے۔ دیکھئے دور حاضر میں ماہرین تعلیم نے علم کو کمال تک پہنچانے کے لیے چھ نصابوں (مراتب) میں تقسیم کیا ہے۔ پرائمری، مڈل، انٹرنس، ایف اے، بی اے، ایم اے۔ ستیارتھ پرکاش کے مصنف نے خود، ص 290 پر انسان کو حسب ذیل مراتب سے گزارا ہے۔ پرکرتی سے آکاش، آکاش کے بعد وایو، وایو کے بعد اگنی، اگنی کے بعد جل، جل کے بعد پرتھوی، پرتھوی سے نباتات۔ نباتات سے اناج، اناج سے نطفہ، نطفہ سے انسان۔

کن فیکون کا مفہوم:

ہر وہ شخص خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو وہ خدا کے متعلق یہ ایمان رکھتا ہے کہ وہ ذات 1۔ علیم و خبیر ہے۔ 2۔ وہ اپنے ارادے کا مالک ہے۔ جب وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ 3۔ تو اس چیز کے ہو جانے کا حکم (کن) دیتا ہے۔ 4۔ وہ چیز حسب منشاء الٰہی ہو جاتی ہے یا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ (یہی خدا کے افعال ہیں)۔ 5۔ یہ تمام باتیں خدا کے ہی سنن (قانون) کے تابع ہوتی ہیں۔ 6۔ اللہ تعالیٰ نظام عالم کو ایک قانون کے تحت چلانے کی وجہ سے اپنے سنن کے خلاف کام نہیں کرتا۔ اور اللہ ان سنن کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ سنن اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں۔ 7۔ معجزات اللہ تعالیٰ کے سنن کے تحت ہوتے ہیں۔ وہ سنن الٰہیہ کے خلاف نہیں ہوتے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَإِذَآ أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا پس وہ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی چیز کے وجود کو چاہتا ہے اسی طرح وہ چیز ظہور میں آ جاتی ہے یعنی وہ چیز خدا کے منشا اور ارادہ کے مطابق ظہور میں آتی ہے۔

پس كُنْ فَيَكُوْنُ چھ دن میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ فائے ترتیبی کبھی اتصال زمانی کے لیے استعمال ہوتی ہے اور کبھی محض تعقیب کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ فَيَكُوْنُ سے مراد یہ ہرگز نہیں کے جس چیز کے کرنے کا حکم صادر ہوا ہے وہ بلا وقفہ اس وقت ظہور میں آ جائے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق ظہور میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کے پیدا ہونے کا حکم دیتا ہے تو وہ شخص اسی وقت بلا وقفہ پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ مختلف مراحل سے گزر کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو پھر حسب منشا الٰہی ظہور میں آنا شروع ہو گئے۔ لہٰذا معترض نے ایک تو اللہ تعالیٰ کے قانون سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اور دوسرے ''فیکون'' میں ''ف'' کو اتصال زمانی سمجھ کر اعتراض کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ''کن'' کا تعلق بعد الموت ہوا کرتا ہے۔ تمام قرآن مجید میں مرنے کے بعد پھر ''جی اٹھنے پر كُنْ'' فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ (انعام 73:6) وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو (حکمت کے ساتھ) پیدا کیا۔ جب کہے گا ''کن'' ہو جا تو پھر ہونے والی چیزیں ہو پڑیں گی۔

مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ [۳۹] اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (نحل 16:38-40)

اور پکی قسمیں کھا چکے ہیں کہ اللہ مردوں کو زندہ نہ کرے گا۔ ہاں ایسا نہیں بلکہ (مردوں کو) زندہ کرنا وعدہ سچ ہے۔ لیکن اکثر لوگ بے خبر ہیں۔ تو واضح کر دے ان کے لیے وہ جس میں اختلاف کرتے ہیں اور کافر یہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ بے شک ہماری بات کسی چیز کے پیدا کرنے میں یوں ہے کہ جب ہم اس کے کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِيْمٌ (یٰسین 78:36) اس کے کلمہ بعد ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسین 82:36) گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ یہ اس کی بات ہے کہ جب وہ (اللہ) ارادہ کرتا ہے کسی شے کا تو فرماتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (المومن 68:40) وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پس وہ اپنا حکم جاری کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کن فیکون کا تعلق بعد الموت سے ہے۔

❀......❀......❀

(ب) استویٰ علی العرش

اعتراض:

بھلا جو چھ دن میں دنیا کو بنا دے اور عرش پر جا بیٹھے وہ قادر مطلق حاضر و ناظر کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا تمہارا خدا بہرہ ہے جو پکارنے سے سنتا ہے؟ یہ سب باتیں خدا کی نہیں۔ پس قرآن بھی کلام اللہ نہیں ہوسکتا۔ اگر چھ دن میں جہان کو بنا کر ساتویں دن عرش پر آرام کیا تو خدا تھک بھی گیا ہوگا۔ بتایئے وہ اب تک سوتا ہے یا جاگتا ہے۔ اگر جاگتا ہے تو اب بھی کچھ کام کرتا ہے یا نکما بیٹھا سیر سپاٹا اور عیش کرتا رہتا ہے۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض نمبر 70)

دھرم پال ان الفاظ میں اعتراض کرتا ہے "خدا زمین و آسمان پر کرسی نشین ہے۔ گویا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ 2۔ عرش پر ہے۔ 3۔ اس کو آٹھ فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے۔ (ترک اسلام اعتراض 1) اس سوال میں دھرم پال نے آٹھ سوال کیے ہیں۔ یہاں صرف عرش کے متعلق اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔

جواب:

یہ اعتراض: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (الاعراف 54:7) یعنی (تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا) پر کیا گیا ہے۔

یہ آیت قرآن مجید کے مشکلات اور متشابہات میں شامل ہے۔ معترضین نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں قرآنی روح کو بالائے طاق رکھ کر اللہ تعالیٰ کے جسم کے ہونے کا اعتراف کرلیا ہے۔

1۔ بعض مفسرین نے استویٰ علی العرش سے مراد نفاذ امر لیا ہے۔ کیونکہ استوی کے بعد علیٰ آیا ہے جو غلبہ اور استیلا پر دلالت کرتا ہے۔ امام راغب نے استوی علی العرش سے مراد غلبہ، سلطان اور مملکت کیا ہے۔ اسی طرح شیخ اکبر ابن العربی نے بھی فتوحات مکیہ میں عرش کے معنی بادشاہی اور ملک کیے ہیں۔

لہٰذا استویٰ علی العرش کے معنی نفاذ امر ہے۔ اس کی تائید خود قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورۃ یونس میں آیا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔

یہاں استویٰ علی العرش کی وضاحت خود يُدَبِّرُ الْاَمْرَ سے فرما دی۔ یعنی تدبیر امور کرتا ہے۔ پس استوی علی العرش کے معنی ہیں نفذ احکامہ علی الخلق یعنی مخلوق پر احکام جاری کیے۔ پس استوی علی العرش استیلا علی ملک اور تدبیر امر کے لیے مجاز ہے۔ (الاشارة الی الایجاز فی بعض انواع اعجاز صفحہ 110 مطبوعہ قسطنطنیہ) اگر استوی علی العرش پر تشبیہی اور تنزیہی صفات کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہی صفت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ذو العرش المجید گویا اللہ تعالیٰ کے کمال علو کو عرش کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی تشبیہی صفات کا اظہار (کائنات کی تخلیق کے بعد پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے

لیے مقام تنزہ و تجرد کی طرف رخ کیا۔ جو وراء اور الوراء تنزہ اور تقدس کا مقام ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس کو عرش کہا گیا ہے۔ جس کی کنۂ تک رسائی انسانی عقل سے ماوری ہے۔ ''استوی علی العرش'' کی دوسری توجیہہ کی رو سے یہ ایک تنزیہی صفت ہے۔
دونوں تاویلات عربی زبان اور قرآن مجید کی روح کے مطابق یہ دونوں تاویلات اللہ تعالیٰ صفت کمالیہ کو ظاہر کرتی ہیں۔
پس استوی علی العرش کا مفہوم یہ ہے کہ کل کائنات سے بلحاظ شان اور عظمت بلندی پر ہے۔ نہ بلحاظ مکان اور دوری۔

ویدانت کے عقیدہ کا رد:

قرآن مجید کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ مذاہب عالم کے غلط عقائد کا رد کرتا ہے۔ جو ان میں کسی مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کو دور کرتا ہے۔ اس آیت میں ویدانت کے اس عقیدہ کی تردید ہے۔ کہ ایشور نے خود ہی ہر شکل میں حلول کیا ہے یا اشیاء کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہر چیز در حقیقت خدا ہے۔ جیسا کہ یجر وید میں لکھا ہے: ''تین چوتھائی ایشور کا اوپر مقیم ہوا ہے۔ ایک چوتھائی اس کا اس دنیا میں پھر پھر پیدا ہوتا ہے۔

خدا کے مختلف حصوں اور جوڑوں سے مخلوق یا کائنات کا پیدا ہونا یجر وید کے پرش سوکت میں لکھا ہے، مثلاً:
''اس کا منہ برہمن بازو چھتری اس کی جانگھیں ویش اور پاؤں سے شودر پیدا ہوا ہے۔ من سے چاند آنکھوں سے سورج اور کانوں سے فضا پیدا ہوئی۔ اس کی ناف سے ہوا، سر سے سورج اور پاؤں سے زمین پیدا ہوئی۔ (یجر وید ادھیاء 31 منتر 4، 11، 13)
اس کی تشریح کرشن جی مہاراج یہ کرتے ہیں ''مے ایک انشین استھو جگت'' (گیتا 42:10) میرے ایک حصہ سے عالم کا قیام ہے۔

اور منو کہتا ہے: ''اس نے اپنے جسم سے مختلف اقسام کی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔'' (منو 8:1)
الغرض قرآن مجید نے ویدوں کے اس نظریہ کا رد کیا ہے کہ مخلوق اور کائنات اللہ تعالیٰ کے مختلف حصوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ فیصلہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ پھر تدبیر امر کے لیے مقام تقدس و منزہ کی طرف رخ کیا۔ یہ وہ مقام اعلیٰ ہے جو انسانی عقل سے ماوراء ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کی عقل کی حدود سے وراء الوراء ہے اسی طرح یہ مقام بھی انسانی عقل کے احاطہ سے باہر ہے۔ صرف انسان کو سمجھانے کے لیے استعارہ کے طور پر لفظ عرش استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مراد عظمت، جبروت اور بلندی ہے۔ اور کائنات اور مخلوقات اللہ تعالیٰ کے جبروت، عظمت مقام علو کا مظہر اتم ہیں۔
قرآن مجید کا یہ طرز بیان ہے فصاحت و بلاغت کا حصہ بھی ہے کہ مشکل ترین امور کو استعارات اور تشبیہات سے آسان ترین کر دیا ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عرش کو چار اور قیامت میں آٹھ فرشتوں کے اٹھانے کی حقیقت:

ہر زبان میں استعارات اور کنایات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ زبان کا حق ہیں۔ جتنے استعارات اور کنایات عمدہ انداز میں کسی نثری عبارت میں بیان کیے جائیں گے وہ عبارت اتنی ہی فصاحت و بلاغت کی بلندیوں کو چھوئے گی۔
عربی اُم الالسنہ ہے۔ اس کے الفاظ میں بہت ہی وسعت ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آخری کلام عربی زبان میں نازل فرمایا۔ جو اپنے اندر معجزاتی رنگ لیے ہوئے ہے جس طرح لفظ عرش اللہ تعالیٰ کے جبروت اور مقام علو کے لیے استعارہ ہے۔ اسی طرح چار فرشتوں کا عرش اٹھانا بھی ایک استعارہ ہے۔ کائنات، رب، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین چار صفات الٰہیہ کی مظہر ہیں۔ خدا کا کوئی

فعل ان چار صفات سے باہر نہیں اور یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کی پوری صورت کو دکھلاتی ہیں۔ اس لیے ان صفات کو ام الصفات کہا گیا ہے۔ ان صفات پر چار ملائکہ موکل ہیں جو دنیا میں ان صفات کی جلوہ نمائی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کی جلوہ نمائی چار فرشتوں کے ذریعے ہو رہی ہے اس لیے کنایہ کے طور پر ان کو حاملین عرش کہا گیا ہے۔

یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کے نہاں درنہاں وجود پر شاہد ناطق ہیں اور یہی چار صفات عالم آخرت میں دو چند ہو جائیں گی۔ یعنی ان کا ظہور دو چند ہو جائے گا۔ تو کنایہ کی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ آخرت میں بجائے چار کے آٹھ فرشتے اٹھائیں گے۔

ج۔ اسلام کا خدا نہ تھکتا ہے اور نہ سوتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْىَ بِخَلْقِهِنَّ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ۔ (البقرۃ) نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند وہ زمین کی حفاظت سے تھکتا نہیں اور وہ بہت بلند مرتبہ اور بڑی عظمت والا ہے۔

قرآن مجید نے معترض کے اعتراض کو واضح الفاظ میں رد کر دیا ہے کہ اسلام کا خدا نہ تھکتا ہے اور نہ اس کو نیند آتی ہے۔ وہ ان نقائص سے مبرا اور پاک ہے۔ اسلام کا خدا مہیمن یعنی ہر چیز کا محافظ ہے۔

الزامی جواب:

آریوں، یہودی اور عیسائیوں کا رب کام کر کے تھک جاتا ہے پھر اس کو آرام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور سو جاتا ہے۔

جیسا کہ آریوں کا خیال ہے کہ آج کل خدا کا دن (برہمن دِوس) ہے اور اس دنیا کی پرلے (قیامت) کے بعد برہم راتری خدا کی رات شروع ہوگی۔ اور وہ چار ارب 32 کروڑ برس تک سوتا رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ وہ جاگنے کی نسبت تین گنا زیادہ سوتا ہے اور کل عالم ویران اور سنسان رہے گا۔ (دیکھو سوامی جی کی رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا میں وید اور دنیا کی پیدائش کا زمانہ) برہم دن میں یا اپنے بیداری کے عالم میں جب کام کرتا کرتا پرماتما تھک جاتا ہے تو برہمن راتری (خدا کی رات) میں آرام کرتا سوتا خراٹے لیتا اور گہری نیند کا عیش لوٹتا ہے۔

منو میں لکھا ہے: ''وہ خیال سے بالا دنیا کو پیدا کرنے والا پرماتما مجھ کو اور دنیا کو پیدا کر کے دنیا کی ہستی کو فنا میں ملا کر اپنے آپ میں سو گیا۔'' (ادھیاء اشلوک 51) ''جب وہ پرماتما جاگتا ہے تب وہ اس دنیا کو پیدا کرنے کی خواہش کرتا ہے جب وہ سو جاتا ہے تب یہ تمام جگت فنا ہو جاتا ہے۔'' (ادھیاء اشلوک 52) جس وقت پرماتما اپنے کام کاج کو چھوڑ کر سویا ہوتا ہے۔ اس وقت کام کرنے والے تمام جان دار بھی اپنے اپنے کرموں سے الگ ہو جاتے ہیں اور من بھی دیگر حواس کے ساتھ اپنے کام سے رک جاتا ہے۔ جب تمام کائنات اس پرماتما میں پرلے (قیامت) کو پراپت ہوتی (پاتی) ہے تب پرماتما بھی دنیا سے الگ ہو کر میٹھی نیند سوتا ہے۔ (ایضاً اشلوک 53، 54)

خروج میں لکھا ہے ''چھ دن میں خدائے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اور تازہ دم ہوا۔'' (خروج 17:31)

(د) خدا زمین و آسمان پر کرسی نشین ہے:

جواب:

آیت وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض پر اعتراض کیا گیا ہے۔ معترض نے کرسی کوئی مادی چیز سمجھ رکھی ہے اس وجہ سے اعتراض کر دیا ہے۔ یہ بھی کم علمی اور جہالت کا ثبوت ہے لفظ کرسی کے معنی علم کے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے یہی معنی کیے ہیں۔ (تفسیر بیضاوی 255:2)

ابن جریر کے نزدیک کرسی کا اصل مفہوم علم ہے جس صحیفہ میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو۔ اس کو کراسیة کہا جاتا ہے۔ اس وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے۔ زمخشری نے قطرب سے ایک ضرب المثل بیان کی ہے۔ خیر ھذا الحیوان الاناسی و خیر الاناسی کراسی (تاج العروس) حیوانوں میں سب سے بہترین انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء۔
پس مذکورہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام بلندیوں اور زمین پر محیط ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت علیم وخبیر کی وضاحت کی گئی ہے۔ جو کوئی بھی کسی مذہب کا ماننے والا ہے وہ اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ دوم اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے کی وضاحت خوبصورت الفاظ اور محاورہ کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہی قرآن مجید کا اعجاز ہے۔

ح۔ سونٹے (عصا) کا سانپ بننا:

(ترک اسلام، سوال نمبر 48)

اس اعتراض کو سوامی دیانند نے ان الفاظ میں دہرایا ہے "پس ایک دفعہ اپنا عصا ڈال دیا اور وہ صریح اژدھا بن گیا۔ اس تحریر سے خدا اور دونوں کا بے علم ہونا ثابت ہو گیا۔ کیونکہ دیکھی سنی بات سے کوئی سمجھ دار منکر ہو کر ایسے معجزوں میں یقین نہیں کر سکتا۔ یہ معجزہ کیا ہوا اندر جال کا تماشا ہو گیا۔ (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب اعتراض 72)

جواب:

یہ قرآن کی آیت: فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (الاعراف 107:7) پر کیا گیا ہے۔
معترضین نے عصا کے ظاہری معنی سونٹا لے کر اپنی کم علمی اور عربی سے عدم واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ائمہ لغت نے عصا کے معنی اجتماع اور ائتلاف کیے ہیں یعنی اکٹھا ہونا (لسان العرب) بلکہ اصمعی کہتے ہیں کہ عصا کے معنی سونٹا اس لیے آتے ہیں کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے اس لیے عصا کے معنی جماعت اور عصوت کے ہیں۔ (میں نے جمع کیا) لغت میں آئے ہیں۔ خوارج کے متعلق آتا ہے۔ شقوا عصا المسلمین یعنی انہوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ایسا ہی ایاك و قتیل العصا کے معنی ہیں جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے والوں سے بچو۔ پس عصا کے معنی جماعت اور سونٹا دونوں ہیں۔
پس مذکورہ آیت اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین فرعون پر غالب آ جائیں گے۔ یہی ایک عظیم الشان معجزہ ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے غلبہ کی پیشگوئی کرنا یہی معجزہ تھا۔ پھر یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ فرعون حضرت موسیٰ اور ان کے پیروکاروں کی آنکھوں کے سامنے غرق ہوا۔

عصا کی حقیقت بائبل میں:

بائبل میں بھی عصا کا لفظ طاقت، غلبہ کے معنی ہیں استعمال ہوا ہے۔یسعیاہ 31:30 میں ہے:''ہاں خداوند کی آواز ہی سے اسور تباہ ہو جائے گا وہ اسے لٹھ سے مارے گا'' انہی معنوں میں عصا کا لفظ سموئیل دوم 14:7 ایوب 34:9 میں ہے نہ صرف بائبل بلکہ سنسکرت کے مذہبی ادب میں بھی ڈنڈا اور ڈنڈ سزا اور حکومت کا مترادف ہے۔مہابھارت میں ہے:''جب لوگ سوتے ہیں تو حکومت کا عصا ان کی حفاظت کرتا ہے۔'' نیز شتپتھ برہمن 32:1:2:3 میں بھی عصا سزا کا مترادف ہے۔خدا کی طاقت کے معنوں میں بھی عصا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔زبور 9:2 مکاشفات 27:2 میں ہے۔وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا۔چنانچہ اسی بناء پر یہود کی تفسیر تورات میں عصا کے سانپ بن جانے کی تعبیریوں کی ہے:

The meaning of this miracle seems to be pharaoh's own power shall become an instrument of Punishment, and his enslaved enemy shall triumph.

یعنی فرعون کی اپنی طاقت ہی اس کی سزا کا موجب بن جائے گی اور اس کا غلام دشمن فاتح ہو جائے گا۔

اس قسم کے معجزے کشفی ہوتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کشف میں یہ بتا دیا کہ فرعون کی طاقت اور لاؤ لشکر سے مت خوف کھائیے۔تم ہی غالب رہو گے۔آیت مذکور میں غلبہ کو بہترین تمثیل ''عصا کی شکل میں'' بیان کیا گیا ہے۔یہی قرآنی اعجاز ہے۔جس کو معترض سمجھ نہیں پایا۔

ایک اہم نکتہ:

جب نبی پر جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتا ہے تو اس وقت نبی کی حالت بدل جاتی ہے۔نبی ہی کشفی حالت میں جبرائیل سے وحی حاصل کرتا ہے جیسا کہ احادیث شریف میں ہے کہ رسول کریم صلعم صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوتے۔دفعتاً حالت کشف میں چلے جاتے۔حضرت جبرائیل وحی لے کر آتے۔صرف رسول کریم ہی جبرائیل کو دیکھتے۔بعض اوقات ایسا ہوتا کہ الٰہی تصرف سے کوئی صحابی بھی اس کشفی حالت میں شامل ہو جاتا اور جبرائیل کا مشاہدہ کر لیتا۔حضرت موسیٰ پر پہلی وحی کے وقت آپ اکیلے ہی شریک تھے۔جب بحکم خداوندی بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے فرعون کے دربار میں جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دینے کے لیے بات کرتے ہیں تو پھر وحی (عصا) نازل ہوتی ہے۔اس وقت فرعون بھی تصرف الٰہی سے شریک ہو جاتا ہے۔جس میں اس کی اپنی تباہی کا پیغام تھا۔نبی کا یہی اعجاز ہوتا ہے۔جن معترضین نے اعتراض کیا ہے دراصل وہ معجزہ اور حقیقت وحی سے بالکل نابلد ہیں۔وحی کی حقیقت سے متعلق پہلے بحث گزر چکی ہے اور معجزہ کی حقیقت اسی سوال کے جواب کے آخر میں بیان کروں گا۔

عصا کے اژدھا بن جانے کی حکمت یہ بتاتی ہے کہ فرعون کے تاج میں اژدھا کا نشان تھا جو اس کی طاقت اور غلبہ کا اظہار تھا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے عصا کو کشف میں اژدھا بنا کر یہ بتایا کہ فرعون کے مقابل تم ہی غالب رہو گے۔اور اس کی طاقت ختم ہو جائے گی۔

آیات کی تشریح:

مزید وضاحت کے لیے ان آیات کی تشریح کی جاتی ہے جن کی وجہ سے معترضین نے غلطی کھائی ہے۔

حقیقت صرف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے یہ حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دینے کا کہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور فرعون کی خدائی کے مقابل پر ہستی باری تعالیٰ پر دلائل دیے۔ انہی دلائل کو قرآن مجید میں آیات کہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (طٰہٰ 56:20) ''اور ہم نے اسے اپنے سب کے سب نشان دکھائے مگر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔'' انہی دلائل کو فرعون نے سحر کہا ہے۔ دلائل اور بیان کا سحر ہونا اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا (بیان (زبردست دلائل) جادو ہی ہوتا ہے) سے ظاہر ہے، جب فرعون دلائل کے سامنے عاجز ہو گیا تو تب ساحروں (حکماء) کو بلوایا تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کا رد کریں۔ مناظرے کا دن مقرر کر دیا گیا۔ حکماء اکٹھے ہوئے۔ حکماء نے ہستی باری تعالیٰ کے خلاف دلائل دیے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے بودے دلائل کو تائید ایزدی سے رد کر دیا۔ جن سے حکماء (ساحر) کے دل اتنے متاثر ہوئے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے قرآن مجید ساحروں کے حبال اور عصی کا ذکر آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ 66:21) کہا بلکہ تم ڈالو تو ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو سے اسے ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔

سورہ الشعراء (44:26) میں بھی حبالھم و عصیھم (ان کی رسایں اور ان کو سونٹیاں) آیا ہے۔ حبل ہر ایک ذریعہ کو کہا جاتا ہے اس سے مراد صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ جو ان سے بن پڑا۔ اور عصا کا استعمال مجازاً ہوا ہے۔ جیسا کہ عربی محاورہ میں ہے قشرت لہ العصا لفظی معنی ہیں میں نے اس کے لیے سونٹے کا چھلکا اتار مراد یہ ہے کہ جو کچھ مرے دل میں تھا زبان سے ظاہر کر دیا اور تاج العروس میں عصا کے معنی اللسان یعنی زبان بھی دئے ہیں مراد صرف یہ ہے کہ ساحروں (حکماء) نے باطل کی حمایت میں جھوٹی تقریریں کیں۔ جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے براہین ساطعہ نے باطل کر دیا۔

دوسری تشریح:

ساحروں کی رسیاں سانپ نہیں بنی تھی بلکہ شعبدہ بازی تھی قرآن مجید میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ ساحروں کے سونٹے اور رسیاں سانپ بن گئی تھیں قرآن مجید میں یہ آتا ہے ان کی رسیاں اور سونٹیاں ان کے واہموں اور تخیلات میں چلتے نظر آئے ساحروں نے لوگوں کی آنکھوں کو دھوکے میں ڈالا۔ یہ محض دھوکا ہی تھی حقیقت نہیں تھی یہ آج کل بھی شعبدہ باز کر لیتے ہیں۔ اگر الفاظ کے ظاہری معنی مراد لیے جائیں" تو صرف یہ مراد ہوگا کہ ساحر شعبدہ باز تھے۔ اور لوگوں کے تخلیات میں رسیاں اور سونٹیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی تھیں حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ 66:20) ان کے جادو سے اسے ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔ خواہ معانی مجازی رنگ میں لیں خواہ ظاہری رنگ میں دونوں لحاظ سے معترض کے اعتراض میں کوئی وزن نہیں۔

اعتراض: عصا مارنے پر پتھر میں سے چشمے پھوٹنا

ایک پتھر کے ٹکڑے پر عصا مارنے سے بارہ جھرنوں کا نکلنا بالکل ناممکن ہے۔ ہاں اس پتھر کو پولا (اندر سے کھوکھلا) کر کے اس میں پانی بھر کر بارہ سوراخ کرنے سے ایسا ممکن ہے۔ اور کسی طرح نہیں (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب۔ اعتراض 23)

جواب:

یہ اعتراض آیت وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (البقرہ 60:2) پر ہے۔

ضرب کے معنی:

ایک چیز کے دوسرے پر مارنے کو کہتے ہیں اور ضرب فی الارض کے معنی ہیں زمین میں چلنا۔ (مفردات امام راغب) تاج العروس میں ضرب بمعنی ذھب لکھا ہے یعنی چلا گیا۔ اسی لیے ضرب الغائط کے معنی ہیں قضائے حاجت کے لیے چلا اور ضرب کے معنی مارنا بھی آتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عصا پر لغوی بحث گزر چکی ہے۔ عصا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہوسکتے ہیں اس لیے **اضرب بعصاك الحجر** کے معنی تین طرح ہوسکتے ہیں (1) اپنا سونٹا چٹان پر مارو۔ (2) اپنے سونٹے سے چٹان پر چلے جاؤ۔ (3) اپنی جماعت کے ساتھ چٹان پر چلے جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی بتا دیا ہوگا کہ فلاں پتھر پر سونٹا مارو وہاں سے چشمے پھوٹ پڑیں گے۔ چشمے پہاڑوں کے پتھروں سے ہی نکلتے ہیں یہی وجہ ہے الحجر پر ال۔ یعنی خاص پتھر، کسی پتھر کے پھٹنے سے چشمہ کا نکل آنا کوئی ایسی بات نہیں جو ناممکن ہو۔

دوسرے معنی یہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ اپنی جماعت کو فلاں پہاڑ پر لے جاؤ وہاں سے بارہ چشمے مل جائیں گے۔ ایلیم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے ہیں۔ (خروج 15:25-27) اور آج تک یہ عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں (بائبل ڈکشنری مطبوعہ اکسفورڈ پریس)

تیسرے معنی یہ بھی آسکتے ہیں۔ اپنے سونٹے کے ساتھ چٹان (الحجر) پر چلے جاؤ وہاں بارہ چشمے مل جائیں گے۔

ان تینوں معانی پر کونسی اعتراض کی بات ہے۔ محض عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے اعتراض کر دیا ہے۔

اعتراض: موسیٰ نے لاٹھی مار کر سمندر کو پھاڑ دیا

موسیٰ نے لاٹھی مار کر سمندر کو پھاڑ دیا اور فرعون معہ لشکر کے غرق ہوگیا۔ اور موسیٰ کی قوم بچ گئی۔ ترک اسلام مصنفہ دھرم پال سوال نمبر 69)

جواب:

قرآن مجید کی اس آیت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ **فَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰىٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ** (الشعراء 26:63) سو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے عصا سے سمندر کو مار پس وہ پھٹ گیا۔ اور ہر ایک فریق ایک بڑے تودہ کی طرح ہے۔

ضرب اور عصا کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں اعتراض کا جواب واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے اطلاع دے دی کہ اپنی جماعت کو سمندر کی طرف لے جائیں۔ (اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ اپنی جماعت کو سمندر کی طرف لے جائیں) سمندروں میں جوار بھاٹا آتا رہتا ہے۔ یہی ایک اعجاز ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر پر پہنچے تو پانی ہٹا ہوا تھا اور حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ اس رستے سے سمندر پار کر گئے۔ جب فرعون تعاقب میں سمندر پر پہنچا تو جونہی جوش غضب میں سمندر میں اترا تو پانی چڑھ گیا۔ اور وہ غرق ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سمندر سے پار ہو جانا اور فرعون کا غرق ہونا ایک معجزہ ہی ہے۔

اس مفہوم کی تائید قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے ارشاد الٰہی ہے **فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا** (طٰہٰ 20:77) پھر انہیں سمندر میں خشک رستہ پر جلد لے جا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (بقرہ:2:50) اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا پس ہم نے تمہیں بچالیا۔ اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔

اس آیت کریمہ میں سوٹا مارنے کا ذکر نہیں صرف فَرَقْنَا کا لفظ استعمال کر دیا ہے یعنی پھاڑ دیا۔ یہ واضح ہے سمندر کا پھٹنا جوار بھاٹے (مدر جزر) کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

قرآنی آیات سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اعجازی رنگ میں سمندر پار کرا دیا جب وہی سمندر خدا کے دشمن کے لیے باعث ہلاکت بن گیا۔

اعتراض: عیسیٰ آسمان پر اُڑ گئے (ترک اسلام سوال نمبر 17)

جواب:

قرآن مجید میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اُڑ گئے۔ بلکہ صرف یہ الفاظ ہیں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (النساء:4:159) بلکہ اس کو اپنی طرف اٹھایا۔ جب بندہ کے لیے لفظ رفع استعمال ہو۔ تو اس سے مراد درجات کا رفع ہوتا ہے۔ خصوصاً جب رفع اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع روحانی رفع ہے نہ کہ جسمانی قرآن مجید میں حضرت ادریس کے متعلق آیا ہے۔ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم:58) یعنی ہم نے حضرت ادریس علیہ السلام کا رفع بلند مکان پر کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... دَرَجٰتٍ (المجادلہ:12) حدیث میں بھی رفع سے مراد روحانی رفع مراد لیا گیا ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ وَاِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ (کنز العمال جلد 2 ص 25) جب بندہ فروتنی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ساتویں آسمان پر رفع کر لیتا ہے۔

عرب لغت بھی رفع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ صحاح جوہری جلد 1 ص 594 اَلرَّفْعُ تَقْرِيْبُكَ الشَّيْءَ رفع سے مراد کسی چیز کو قریب کرنا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں اُڑ کر آسمان پر نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ذی حیات کے لیے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے اس قاعدہ کلیہ سے کوئی مستثنیٰ نہیں ارشاد الٰہی ہے۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (المرسلت 77:26) کیا ہم نے زمین کو سمیٹ لینے والی نہیں بنایا (کیا) زندوں کو اور (کیا) مردوں کو۔

اس آیت سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمین کو ایسا بنایا گیا ہے کہ تمام چیزیں اس کی طرف کھچی رہتی اور اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ یہ اس کی کشش ثقل کی طرف اشارہ ہے۔

کوئی ذی حیات اس زمین کو چھوڑ کر کہیں اوپر نہیں جا سکتا۔ یہیں رہے گا۔ یہیں مرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی قاعدہ کو حضرت رسول کریم ﷺ کے ایک نمونہ سے اور واضح کر دیا۔ جب کفار مکہ نے آپ سے سوال کیا کہ تو آسمان پر چڑھ جا تو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ارشاد کیا کہ یوں جواب دو۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل:17:93) کہہ میرا رب پاک ہے میں صرف ایک بشر رسول ہوں۔

یعنی اللہ تعالیٰ کفار کے لغو سوال کے جواب میں بزبان رسول فرماتا ہے۔ کہ وہ پاک ہے کہ اپنے ہی قاعدہ کلیہ کو توڑے کسی بشر رسول کا آسمان پر بجسم عنصری جانا سنن الٰہیہ کے خلاف ہے۔

(حضرت عیسیٰ کے رفع کے بارے میں مسلمانوں کا اختلاف ہے۔ میں نے وہ موقف اختیار کیا ہے جن کے نزدیک حضرت عیسیٰ کا

رفع جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔)

اعتراض: خدا بڑا مکار ہے۔(نعوذ باللہ)

خدا کو معمولی آدمی تصور کر کے اس میں منجملہ چند صفات حسنہ کے وہ تمام صفات بھی بھرے ہوئے دکھائے گئے ہیں جو کسی ادنی سے آدمی میں پائے جاتے ہیں۔مثلاً

مکار فریبی، مکاروں کا مکار، فریبیوں کا فریبی اس کا ثبوت ہے و مکروا و مکر اللّٰہ واللّٰہ خیر الماکرین (دھرم پال ترک اسلام اعتراض 1)

لفظ"مکر" کی لغوی تشریح:

مفردات امام راغب نے لکھا ہے (المکرُ) صرف الغیر عما یقصده بحیلة یعنی مخالف کے مقاصد کو تدبیر سے روک دینا مکر ہے۔ابن الاخیر جس نے لغت قرآن وحدیث پر کتاب لکھی ہے لکھتا ہے۔

(مکر اللہ) ایقاع بلائه باعدائه دون اولیائه "مکر اللہ" کے معنی ہیں اللہ کے دشمنوں پر عذاب ڈالنا اور اولیاء کو ان عذابوں سے بچانا۔

لسان العرب میں یہ معنی لکھے ہیں المکرُ احتیال فی خفیة یعنی مخفی تدابیر کو مکر کہتے ہیں۔امام راغب نے مکر کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک مکر محمود ہے جس سے نیک کام کا قصد کرنا مقصود ہے۔چنانچہ انہی معنی میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ دوسری قسم مکر مذموم ہے یعنی بُرے فعل کا ارادہ کرنا یہی معنی ہیں اس آیت کے فَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّءُ مذکورہ معانی کو سامنے رکھ کر ان آیات کا ترجمہ کیا جائے تو اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (ال عمران:54:3)(کافروں نے) بھی تدبیر کی۔اور اللہ نے بھی تدبیر کی۔اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھا ہے۔یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر موت دے کر لعنتی بنانا چاہتے تھے۔یہ یہود کا "مکر" مذموم تھا۔ان کے مقابل پر اللہ تعالیٰ ان کے بدعزائم کے برعکس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیبی موت سے بچا کر اعلیٰ روحانی مقام دینا چاہتا تھا۔یہ مکر محمود تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہود کے مکر سیئہ کو اپنے مکر محمودہ کے ساتھ باطل کر دیا۔یعنی صلیبی موت سے بچا لیا۔

رسول کریم ﷺ کو بھی معجزانہ رنگ میں دشمنوں کی گرفت سے بچانے کے موقع پر لفظ "مکر" استعمال کیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (الانفال 30:8)

اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے۔تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی حق کے دشمنوں کے "مکر سئ" اور اللہ تعالیٰ کے "مکر محمودہ" کا ذکر ہوا ہے دشمن رسول کریم ﷺ کو قید کرنے یا قتل کرنے یا شہر مکہ سے باہر نکال دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔جب کہ اللہ تعالیٰ اعجازی رنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں سے بچا کر لے جانے کی تدبیر کر رہا تھا۔اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو بچانے کے لیے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

لفظ "مکر" کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا نام مکار رکھنا محض لاعلمی یا شرارت ہے۔بسا اوقات ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں آتا

ہے۔تو دوسرے معنی اختیار کر لیتا ہے۔اردو زبان میں لفظ ''مکر'' عربی زبان سے آیا ہے۔اور زبان میں یہ لفظ بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان میں انہی بُرے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔صریحاً غلطی ہے قرآنی مجید میں ایک جگہ لفظ ''مکر'' کے ساتھ لفظ خیر استعمال کیا ہے۔جیسے ارشاد الٰہی وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ اگر عربی زبان میں لفظ ''مکر'' بُرے معنی میں مستعمل ہوتا تو اس کے ساتھ لفظ ''خیر'' نہ لگایا جاتا۔کیونکہ جو فعل فی نفسہ بُرا ہو اس کے ساتھ خیر کا لفظ نہیں لگ سکتا۔نہ ہی اس کے ساتھ ذم کا لفظ لگانے کی ضرورت ہے گویا لفظ ''مکر'' عربی زبان میں احتیال فی خفیۃ (مخفی تدابیر) میں استعمال ہوتا ہے اب وہ تدبیر بُری بھی ہوسکتی ہے اور اچھی بھی۔چونکہ کفار کی تدبیر مذمومہ تھی۔اس لیے اس کے ساتھ ''السَّـيِّئُ'' کا لفظ لگا دیا۔لہٰذا قرآنی لفظ ''مکر'' کو اردو کے لفظ ''مکر'' کے بُرے مفہوم میں مستعمل نہیں سمجھنا چاہیے۔

جب قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ سے بھرا ہوا نظر آتا ہے قرآن مجید کا آغاز ہی عالمی ربوبیت (رب العالمین) رحمان رحیم، مالک یوم الدین سے شروع ہوتا ہے اور صفات حسنہ کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (الناس) پھر قرآن مجید میں آتا ہے لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اللہ تعالیٰ کے ہی صفات حسنہ ہیں) کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کے ساتھ صفت ذم بیان کردی جائے۔اعتراض محض معترض کی کم علمی کور باطنی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔

حضرت صالح کی اونٹنی بطور ایک نشان

اعتراض: معتقد بنانے کو خاص اونٹنی پیدا کی (ترک اسلام سوال 57)

یہی اعتراض دیانندان الفاظ میں کرتا ہے ''کیا لڑکپن کی باتیں ہیں! کیا زمین و آسمان بھی باتیں سن سکتے ہیں؟ خوب! اگر خدا کی اونٹنی بھی ہے تو اونٹ بھی ضرور ہوگا۔اور ہاتھی گھوڑے اور گدھے وغیرہ بھی ضرور ہوں گے۔اور خدا کا اونٹنی کو کھانے کے لیے زمین پر چھوڑ دینا اچھی بات ہے۔کیا خدا اونٹنی پر چڑھتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو خدا کے گھر میں نوابوں کی سی کرّ وفر ہوگی۔(ستیارتھ پرکاش اعتراض نمبر 91)

جواب:

قرآن مجید میں آتا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (الاعراف:73:7) یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے نشان ہے سو اس کو چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرے اور اس کو کوئی دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں دردناک عذاب پکڑے گا۔

اسی طرح سورہ ہود (64:24) اور سورہ شعراء (157,156,155,154:26) میں حضرت صالح کی اونٹنی کا ذکر بطور ایک نشانی الٰہی ذکر ہے۔

اس نشانی الٰہی کی حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی شخص اس اونٹنی کو مارے گا۔وہ تباہ و برباد ہوجائے گا۔اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی پر قرآن مجید میں کئی عقلی اور نقلی دلائل دیے ہیں۔انہی دلائل میں سے ایک دلیل بیت اللہ بھی ہے۔کہ جو شخص اس گھر کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔وہ تباہ و برباد ہوجائے گا۔خدا کی ہستی پر اب تک یہ ایک دلیل قاطعہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کی اونٹنی کو حضرت صالح کی قوم کے لیے خدا کی ہستی اور حضرت صالح کے من جانب اللہ مبعوث ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔سورہ شعراء میں یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت صالح

کی قوم نے خود نشان طلب کیا تھا۔ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (الشعراء 154:26) سو کوئی نشان لے آ۔ اگر تو سچوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حسب سنن الٰہیہ حضرت صالح کی قوم کو یہ نشان دیا کہ حضرت صالح کی اونٹنی کو قوم کے دیگر جانوروں کے ساتھ چرنے پھرنے دیا جائے اگر کسی نے اس اونٹنی کو مارا تو اس کی ہلاکت کا باعث بن جائے گی۔ درحقیقت اونٹنی کی نسبت حضرت صالح کی طرف تھی۔ حضرت صالح اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ اور وہ اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کے ساتھ دشمنی اللہ کے ساتھ دشمنی ہے۔ اس لیے اونٹنی کو مارنے کا سبب تمام قوم عذاب الٰہی کا موجب بن گئی۔ اس نشان میں یہ اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے کو تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے۔

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنا دراصل حضرت صالح کو مارنے کی تمہید تھی۔ اس کے بعد حضرت صالح کو مارنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا ارشاد الٰہی ہے۔ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (النمل 49:27) انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھاؤ کہ ضرور ہم اس پر اور اس کے اہل پر رات کے وقت حملہ کریں گے۔ پھر ہم اس کے ولی کو کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔

حضرت صالح کی قوم نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی کوئی پرواہ نہ کی اور حضرت صالح کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق قوم پر عذاب نازل کیا۔ اس تاریخی قصے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول کریم ﷺ کو یہ بتایا ہے کہ حضرت صالح کی قوم کے نو بڑے اپنی سرکشی اور حق کو جھٹلانے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے تھے اسی طرح آپؐ کے نو دشمن ابوجہل مطعم بن عدی، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف، نضر بن الحرث، عقبہ بن ابی معیط، اور ابولہب مارے جائیں گے۔ یہی وہ نو اشخاص تھے جنہوں نے دارالندوہ میں رسول کریم ﷺ کو مارنے کی سازش کی تھی۔ آٹھ تو جنگ بدر میں مارے گئے جب کہ ابولہب جنگ بدر سے شکست فاش کے صدمہ سے ہی اس فانی دنیا سے خائب و خاسر چلا گیا۔

گویا حضرت صالح کی اونٹنی قوم صالح کے لیے ایک نشان تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق اونٹنی کو نشان قرار دیا۔ جب سرکش لوگوں نے اونٹنی کو مار دیا تو ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ (النمل 51:27) کہ ہم نے انہیں اور ان کی قوم سب کو تباہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اپنی سنت کے مطابق لوگوں کی ہدایت کے لیے نشان دیئے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کو اونٹنی کا نشان دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت کسی چیز کو بھی نشان ٹھہرا سکتا ہے۔ نشان کا مقصد محض لوگوں کو ہدایت دینا ہوتا ہے۔

دوم: اونٹنی اس وجہ سے بھی نشان ٹھہرا گیا۔ کسی جانور کو چراگاہ میں چرنے پھرنے کے لیے چھوڑ دینا عرب کی رسومات میں شامل تھا۔ میدانی نے امثال میں لکھا ہے۔ کہ حیرہ کے بادشاہ کسریٰ نے اپنی قوت سلطنت کا دبدبہ عربوں پر بہت بٹھایا ہوا تھا۔ اس کو مہر ط الحجر کہتے تھے۔ اس نے شدید قحط کے زمانہ میں ایک دنبہ پالا پوسا پھر اس کے گلے میں چھری اور چقماق باندھ دیا۔ اور جنگل میں چھوڑ دیا اور کہا کون ہے جو اسے ذبح کر سکتا ہے۔ عربوں میں کوئی بھی اس سے تعرض نہیں کر سکتا تھا۔ آخر بنو یشکر قوم تک جا پہنچا اور علیا بن ارقم کی نظر اس پر پڑی اور وہ بول اٹھا میں اس دنبہ کو کھالوں گا۔ اس کی قوم کے لوگوں نے اس کو بہت منع کیا اور ملامت کی۔ لیکن علیا اپنے ارادہ پر قائم رہا۔ تب انہوں نے اس بات کو اپنے سردار تک پہنچایا۔ اس نے یہ فقرہ کہا جواب تک کہاوت کے طور پر مشہور ہے۔ انك لاتعدم الضان ولكن تعدم النفع۔ لوگوں نے علیا کو بہت روکا۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر دنبہ کو ذبح کر کے کھا گیا اور بادشاہ کے پاس چلا گیا۔ اور کہا کہ میں نے ایک بدی کی ہے اور

بڑی بدی کی ہے۔لیکن آپ کا عفو اس سے بھی بڑھ کر ہے اپنا سارا ماجرا کہہ سنایا۔تب بادشاہ نے کہا اب میں تجھے قتل کردوں گا تب علیا نے وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

وان یدالجبار لیست بعصقة

لکن سماء تمطر الوبل والدیم

ہندوستان میں بھی بیل بطور سانڈ چھوڑ دینے کی سکھ قوم میں رسم تھا۔سکھ اچھی نسل کا ایک بیل چھوڑ دیتے تھے۔وہ چرتا پھرتا کوئی بھی اس کو اپنی زمین میں چرنے سے نہیں روکتا تھا۔اگر کوئی اس کو مارتا تو لڑائی جھگڑے تک نوبت آجاتی تھی۔

مختلف ملکوں میں جانور کو چرنے کے لیے چھوڑ دینا ایک رسم تھا۔وہی رسم حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس رسم کے تحت حضرت صالح علیہ السلام کو اونٹنی کا ایک نشان دے دیا۔اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

الزامی جواب:

اتھروید میں ایک پورا سوکت ''برہم گولی'' (خدا کی یا برہمن کی گائے) ہے اس میں لکھا ہے برہمن کی گائے چھین لینے یا اس کو کھا جانے سے راجا اس کے خاندان اس کے ملک اور اس کے لشکروں پر کیا مصائب آتے ہیں گویا وید میں برہمن کی گائے کو خدا کی گائے قرار دیا گیا ہے جو دنیا جہاں کی مصیبتیں دنیا پر لاتی ہے دیکھو اتھروید کانڈ 5 سوکت 18 اور 19 کانڈ 12 اور سوکت 5، جن میں ایک سو سے زائد منتروں میں اس گائے کی کرامتوں اور معجزوں کا ذکر ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ خدا اونٹنی پر چڑھتا تھا یہ محض افترا ہے جس کا قرآن مجید میں کوئی اشارہ تک نہیں۔

اعتراض: جبرائیل خدا سے نازل ہوتا ہے (ترک اسلام اعتراض 17)

جواب:

اللہ تعالیٰ حاکم اعلیٰ ہے۔دنیا کو ایک نظام کے تحت چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو وسائط اور ذرائع بنا رکھا ہے۔گویا فرشتے حاکم اعلیٰ کے کارندے ہیں۔دنیا میں جو مظاہرے قدرت کام کرتے نظر آرہے ہیں دراصل ان کے پیچھے انہی وسائط (کاندروں) کا ہاتھ ہے۔جو خدا کے حکم سے کام کرتے ہیں۔جبرائیل بھی انہی فرشتوں میں سے ایک ہے یا کارندوں میں سے ایک ہے جو لوگ اللہ کی رضا کی راہ پر چلتے ہیں اس کے احکام کے کاربند رہتے ہیں۔ہر آن خدا کی خوشنودی کے طالب رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس فرشتہ (جبرئیل) کی معرفت مکالمہ مخاطبہ کرتا ہے۔انبیا علیھم السلام کو یہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام پہنچاتا تھا۔جن پر چل کر انسان کامیاب زندگی گزارتا ہے۔اور یہی فرشتہ دنیا میں دینی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی تہذیب وتمدن کا ذریعہ ہے۔کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں کی راہنمائی بحکم ایزدی یہی کرتا ہے جس پر معترض اعتراض کررہا ہے۔

الزامی جواب:

دیانند سرسوتی کا بھی یہی مذہب تھا کہ وہ مظاہر قدرت ہیں وید بھومکا صفحہ 43 پر لکھتے ہیں۔اس کے علاوہ (خدا کے) اور جس قدر دیوتا بتائے گئے ہیں یا آگے بیان کیے جائیں گے وہ سب اسی ایک آتما کے (پرمیشور) پرتی انگ (مظاہر اجزا قدرت) ہیں کیونکہ وہ اس کے ایک ایک انگ (قدرت کی جزو) کو ظاہر کرتے ہیں۔

اعتراض: محمد عربی براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر اور خدا سے باتوں کے لیے گئے (ترک سلام سوال نمبر 17)

جواب:

معترض نے یہ اعتراض رسول کریمﷺ کے معراج پر کیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث سے واقعہ معراج مسلمہ ہے۔ یہ ایک مکاشفہ ہے۔ جیسا کہ بخاری میں معراج کی حالت کو بین النوم والیقظان یعنی مکاشفہ کی حالت بیان کیا ہے۔ رسول کریمﷺ کی زندگی میں صرف ایک ہی مکاشفہ رونپذیر نہیں ہوا بلکہ احادیث میں کئی واقعات کا ذکر ہے۔ جیسا کہ حدیث کسوف میں ذکر ہے کہ رسول کریمﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہاں سب کچھ دکھایا گیا ہے یہاں تک کہ دوزخ اور جنت بھی۔ اس طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ تہجد کے لیے اٹھے نماز پڑھی تب ناگہاں اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک دن رسول مقبولﷺ ایک قبرستان سے گزر رہے تھے فرمایا کہ ان دو قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔ عذاب کسی کبیرہ گناہ کی پاداش میں نہیں ہے ایک پیشاب کی چھینٹوں کی پروا نہیں کرتا تھا دوسرا اس وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلی کھایا کرتا تھا۔ ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف سے ایک آدمی مارا گیا۔ صحابہ کرام نے فرمایا کہ وہ شہید ہوا ہے رسول کریمﷺ نے فرمایا نہیں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مال غنیمت میں ایک چادر چوری کی تھی۔
(کتاب الجنائز)

احادیث میں ایسے امور کا ذکر ہے کہ جس کو عالم بیداری میں آپؐ کی روحانی آنکھ نے نورانی جسم کا لبادہ اوڑھ کر مشاہدہ کیا اور ان ظاہری آنکھوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ معراج کی بھی یہی کیفیت ہے اس وقت رویت وسماعت کے تمام دنیاوی قوانین منسوخ کر کے قیود و زمانی کی تمام فرضی بیڑیاں کاٹ کر رسول کریمﷺ کی روح مقدسہ کو ایک ایسا نورانی جسم دیا گیا۔ جس کے ساتھ تمام روحانی مدارج طے کرتے ہوئے حریم خلوت گاہ قدس میں جا پہنچے۔ اور قاب قوسین سے بھی نزدیک تر ہو گئے۔ اور اسرار علوم حاصل کر کے واپس اسی دنیا میں آ گئے۔

مکاشفات کا وقوع ہونا سنن الٰہیہ میں سے ہے۔ رسول کریمﷺ کی بعثت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ رسول کریمﷺ کی بعثت کے بعد بھی اولیاء کرام کو ہوئے ہیں اور تا قیامت ہوتے رہیں گے۔ یہ خدا سے محبت کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفہ محبت ہے۔ معترض کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ کرشن جی مہاراج اور رام چندر جی کو بھی مکاشفے ہوئے ہوں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معراج فقط ایک خواب ہی نہیں بلکہ حقیقی معراج تو رسول کریمﷺ کی فطرت میں موجود تھا۔ اسی کا اظہار مکاشفہ کی شکل میں ہوا۔ صرف ایک دفعہ نہیں ہوا کئی بار ہوا۔ معراج کا مکاشفہ دیگر معراجوں کی نسبت بہت اعلیٰ تھا۔ جس کی نظیر روحانی دنیا میں نہیں ملتی۔ اور نہ ملے گی۔ جتنی کسی شخص کی اندرونی حالت اللہ تعالیٰ کی صفات میں رنگین ہوگی۔ اتنا ہی اعلیٰ معراج نصیب ہوگا۔ رسول کریمﷺ اللہ تعالیٰ کے مظہر اتم تھے اس لیے سنن الٰہیہ کے تحت جو معراج رسول کریمﷺ کو نصیب ہوا۔ وہ سب انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے معراجوں سے افضل اور اعلیٰ تھا۔

فائدہ:

معراج میں ایک لطیف جسم ہوتا ہے جو اس جسم کثیف سے الطف اور قوی، قوی تر ہوتا ہے۔ وہی الطف جسم روح مقدسہ کو دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ روح روحانی سفر طے کرتی ہے۔

تحقیقی جواب:

علم الرویاء کی معتبر کتاب تعطیر الانام میں لکھا ہے جو کوئی دیکھے کہ براق پر سوار ہوا وہ مراتب عالیہ پر پہنچے گا اور اس کو سفر میں عزت ملے گی۔ جہاں سے گیا وہاں باعزت واپس ہوگا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ کہ آپؐ مکہ سے نکلے۔ پھر کس شان کے ساتھ فاتحانہ رنگ میں دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ بامراد اور منصور مکہ میں داخل ہوئے۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

پھر اس کتاب میں رقم ہے جو دیکھے کہ وہ پہلے آسمان پر گیا اس کی عمر بہت بڑی نہ ہوگی اور جو دوسرے آسمان پر جائے وہ عالم و حکیم ہو۔ اور جو تیسرے پر جائے اس کی عزت و اقبال زیادہ ہو۔ اور چوتھے پر جائے وہ بادشاہوں کی نظروں میں معزز ہو اور جو پانچویں پر جائے اس کو جزع و فزع اور مشکلات کے پیش آئیں جو چھٹے پر پہنچے اس کو سعادت و جاہ حاصل ہو اور جو جناب الٰہی کا درشن کرے اس کا انجام بخیر ہو۔ یہ ساری باتیں رسول کریم ﷺ کے حق میں احسن طریقہ سے پوری ہوئی ہیں۔

اعتراض: بہشت میں نہریں ہوں گی بعض کہتے ہیں کہ وہ دودھ اور شہد کی نہریں (ترک اسلام سوال 39)

اسی طرح تارک اسلام نے بہشت میں اہل جنت کو دیگر نعماء حور عین غلمان، ریشمی کپڑے اور سونے کے کپڑے دیئے جانے پر اعتراض کیا ہے۔ (اعتراضات 41,40,39,38)

اسی طرح سوامی دیانند جی نے بھی کتاب ستیارتھ پرکاش میں سوال 9 میں بہشت کی نعماء پر اعتراض کیا ہے۔

جواب:

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے۔ جس نے اعمال حسنہ اور اعمال سیۂ کی جزا و سزا کا کسی نہ کسی رنگ میں ذکر نہ کیا ہو۔ قرآن مجید کی رو سے بہشت اور دوزخ کی ابتداء اس دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ جو اپنے رب سے خائف ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔

دوزخیوں میں آتا ہے وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا جو شخص اس دنیا میں (روحانی) اندھا ہے اور وہ آخرت میں بھی (روحانی اندھا ہوگا)

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ بہشت اور دوزخ کی بنیاد اخلاق حسنہ اور اخلاق سیۂ کی روشنی میں اس دنیا میں پڑ جاتی ہے۔ گویا بہشت اور دوزخ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کے اظلال اور آثار ہیں۔ بہشت انسان کے اس دنیا کے ایمان اور اچھے عمل کا نتیجہ اور ظل ہیں۔ اور دوزخ انسان کے اعمال سیۂ کا ظل گویا بہشت اور دوزخ اعمال حسنہ اور اعمال سیۂ کا عملی اظہار ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل بجالاتے ہیں ان کے لیے جنت ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

یہی وہ آیت ہے جس پر معترض نے اعتراض کیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ سے تشبیہ دی ہے۔ اور نہروں کو اعمال صالحہ سے جس طرح جو تعلق باغ کا نہروں سے ہے کوئی باغ پانی کے بغیر نہ پھل دیتا ہے اور نہ سر سبز رہ سکتا ہے اس طرح ایمان اور اعمال حسنہ کے درمیان رشتہ ہے ایمان بغیر اعمال صالحہ کے زندہ ایمان نہیں اور نہ اعمال صالحہ بغیر ایمان کے کوئی حیثیت رکھتے ہیں ایمان اس وقت فائدہ مند ہے جب اس کے ساتھ اعمال صالحہ ہوں اور اعمال صالحہ اس وقت مثمر ہوں گے جب ان کے ساتھ ایمان کی دولت ہوگی۔ بہتر نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے ایمان کے ساتھ

اعمال صالحہ ہوں اور اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان ہو۔ متقیوں (جو ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت سے مالا مال ہوں گے) کو بہشت میں نعماء الٰہی دودھ شہد اور ہر قسم کے پھل، حور وغلمان دیا جانے کا وعدہ ہے بلکہ قرآن مجید میں آتا ہے جس چیز کی خواہش کریں گے ان کو دیا جائے گا قرآن مجید میں آئندہ زندگی کے متعلق جو بیان کیا گیا ہے وہ محض بطور مثال کے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ (محمد 15:47) اس جنت کی ایک مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑ کر بدبودار نہیں ہوتا اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہیں بدلتا شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے باعث لذت ہے صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔

مذکورہ آیت میں لفظ مثل ظاہر کرتا ہے کہ جنت کی نعماء بطور مثال بیان ہوئی ہیں۔ جنت کی نعماء اور اس کی دنیا کی نعماء میں صرف نام کا اشتراک ہے حضرت ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت ہے لایشبه شی مما فی الجنة ما فی الدنیا الا فی الاسماء یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں۔

قرآن مجید میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدہ 17:32) بس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا قَالَ اللّٰهُ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری) جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی شے کے دل پر وہ گزرا ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا: مالم یسمعة ملك مقوب، انسان تو کجا کسی بڑے سے بڑے مقرب فرشتہ نے بھی ان بہشتی نعمتوں کو سنا تک نہیں۔

دنیا کی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں صرف نام میں اشتراک ہے ان کی کیفیت اور نوعیت بالکل الگ ہے۔ بہشت کے باغ نہریں اور عورتیں بھی وغیرہ ایسے نہیں ہیں جو اس دنیا میں ہیں۔ وہ تو بالکل الگ چیزیں ہیں اور ان کی کیفیت ہی اور ہے۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ جس چیز کو انسان نے کبھی دیکھا تک نہ ہو اُسے سمجھانے کے لیے دیکھی ہوئی چیزوں کی مثال دینی پڑتی ہے خواہ وہ مثال کتنی ناقص کیوں نہ ہو۔

الغرض معترض کے اعتراض کا بوداپن اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے جب حدیث اور قرآن سے یہ واضح ہو جائے کہ بہشت اور دنیا کی نعمتوں میں صرف نام کا اشتراک ہے۔ کیفیت اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل الگ ہیں۔

حور و غلمان کا تصور:

بہشت میں نعما الٰہیہ میں سے ایک نعمت حور ہے۔ حور ایک تو احور کی جمع ہے جو مرد پر بولا جاتا ہے دوسری حوراء کی جمع ہے جو عورت پر بولا جاتا ہے گویا لفظ حور جمع کے لحاظ سے مرد اور عورت پر بولا جاتا ہے۔

حور کے اصل معنی سفیدی ہیں جو صفائی اور پاکیزگی کی علامت ہے احور اس مرد کے لیے بولا جاتا ہے جس کی آنکھوں کی سفیدی غایت درجہ کی ہو اور سیاہی بھی غایت درجہ کی ہو اور ساتھ پاکیزہ اخلاق کا مالک بھی ہو۔ اسی طرح لفظ حوراء اس عورت پر بولا جاتا ہے۔ جس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی غایت درجہ کی ہو اور پاکیزہ اخلاق کی بھی مالک ہو احور اور حوراء دونوں الفاظ مرد اور عورت کی ظاہری اور باطنی حسن کو ظاہر کرتے ہیں۔ دوم بہشت کی نعماء مرد اور عورت دونوں کے لیے ہیں ارشاد الٰہی ہے وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى

وَمُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (المومن 40:40) جو نیکی کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو وہی بہشت میں داخل ہوں گے۔

فرمایا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء 124:4) اور جو نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مرد اور عورت دونوں اعمال کے نتائج کے لحاظ سے برابر ہیں جس طرح صالح مرد کے لیے جو نعمائے جنت ہیں وہی نعماء جنت عورت کے لیے بھی ہیں۔

اب چند ان آیات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں ''حور'' بطور نعمت کے ذکر کیا گیا ہے۔ واضح ہو جائے گا۔ کہ اس نعمت سے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ .... وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الدخان 44:51-55) متقی امن کی جگہ میں ہوں گے باغوں اور چشموں میں ...... ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ .... مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (الطور 52:17-20)

متقی باغوں اور نعمتوں میں ہیں .... بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے ہوئے اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔ قرآن مجید میں زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ کے الفاظ میں لفظ ''حور'' میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور کہیں بھی زَوَّجْنٰهُمْ حوراء نہیں آیا لہٰذا یہ واضح ہوتا ہے کہ حور بہشت کی نعمت ہے جو مرد اور عوت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ دونوں آیات میں لفظ متقین میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اسی طرح ایک اور آیت وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ .... حُوْرٌ عِيْنٌ (الواقعہ 56:10-21) اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہیں وہی مقرب ہیں نعمتوں والے باغوں میں .... اور خوبصورت حوریں۔

اس آیت میں السابقون السابقون میں بھی مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ دونوں جنت میں ہوں گے وہاں بطور نعمت ''حور عین'' ان کے ساتھی ہوں گے۔ آخر یہ الفاظ ہیں جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الواقعہ 56:24) (یہ اس کا) بدلہ (ہے) جو وہ عمل کرتے ہیں۔ گویا یہ نعما جنت اہل جنت (مرد/زن) کے اعمال کی جزاء ہیں ان کے اپنے پاکیزہ اعمال ان نعماء کی شکل میں متمثل ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے یہ ذکر کیا گیا ہے لفظ حور پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس لیے انسان کی اپنی پاکیزگی اور طہارت ہی حور کی شکل اختیار کرے گی۔ لہٰذا جنت کی حور کو اس دنیا کی عورتوں کی مانند جاننا کھلی جہالت ہے۔

بعض مفسرین نے حور سے مراد اس دنیا کی نیک صالحہ بیویاں مراد لی ہیں۔ وہ جنت میں اپنے خاندوں کی ساتھی ہوں گی۔ لیکن جنت میں جنسی تعلق کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا ہے۔

ولدان اور غلامان:

ولدان، ولد کی جمع ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہیں قرآن مجید میں آتا ہے يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (الواقعہ 56:17) ان پر ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے لڑکے پھر رہے ہوں گے۔ یعنی ان میں استحالہ نہیں ہوگا۔

دوسری جگہ آتا ہے وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (الطور 52:24) اور ان کے آس پاس ان کے غلام پھرتے ہوں گے۔ گویا کہ وہ پوشیدہ موتی ہیں۔

ولدان اور غلامان بھی حور کی طرح جنت کی ایک نعمت ہیں کیونکہ بچے بھی پاکیزگی کی علامت ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے غلمان اور ولدان سے صالح لوگوں کی وہ اولاد مراد لی ہے جو بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ صالحین کی اولاد کو جنت میں ان سے ملا دے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ (الطور 21:52) ہم کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔

جواب ثانی:

قرآن مجید وہ اسرار و رموز اور معارف و مطالب کا خزانہ ہے جس کا احاطہ کرنا انسانی ذہنی طاقت سے باہر ہے۔ ایک جواب تو متکلمین کے علم کلام کی روشنی میں دیا جا چکا ہے۔ اس اعتراض کا جواب اب دوسرے پہلو سے دیا جاتا ہے۔

جن آیات پر معترض نے اعتراض کیا ہے۔ ان میں مسلمانوں کی کامیابیوں سے متعلق عظیم الشان پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ جو پوری ہوئیں۔ نہر کے معنی کثرت کے ہیں اور نہر کے معنی ندی کے بھی ہیں۔ ان آیات میں ایمان اور اعمال صالحہ بجالانے کے بدلے صحابہ اکرام کو ریگستان عرب کے بدلے وہ ملک عطا کیے جانے کی خوش خبری دی جا رہی ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں گی، باغات ہوں گے۔ خلفاء راشدین کے دور مسعود میں ہی وہ ملک مسلمانوں نے فتح کیے جن میں دجلہ، فرات، جیحوں، سیحون اور نیل بہتے تھے۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ کی اتباع کی برکت سے ہندوستان کے مالک ہوئے جس میں گنگا، جمنا اور سرسوتی بہتے ہیں۔ ان نعمتوں کے حصول کا ذکر قبل از وقت کیا گیا تھا اور وعدہ خداوندی کے تحت وہ نعمتیں مسلمانوں کو عطا کی گئیں۔

اس پیشگوئی میں اشارہ النص کے طور پر یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب تک مسلمان ایمان اور اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ رہیں گے۔ اور اسوہ حسنہ رسول ؐ پر چلتے رہے گے۔ تو وہ کامیابیوں سے ہمکنار رہیں گے۔ جب ان کا قدم اتباع رسول سے ہٹ جائے گا۔ وہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائیں گے۔ آیئے ان الفاظ کے حقائق کے سمجھنے کے لیے کتب تعبیر الرویا کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ نہر کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے۔

النهر يدل على اقليمة كسيحون وجيحون والفرات والنيل

والنهر في المنام عمل صالح او رزق

ونهر اللبن دليل على الفطرة ونهر الخمر دليل على السكر من حب الله تعالىٰ و البغض عن محارمه نهر العسل دليل على العلم والقران (تعطير الانام ص 226) نہر سے یہ مراد ہے کہ ایسی اقالیم جن میں نہریں ہیں جیسے سیحون اور جیحون اور فرات اور نیل (اسلام کے قبضہ میں آجائیں گے آخر وہ آ گئیں)

اور خواب میں نہر کو دیکھنے سے مراد یہ ہوتا ہے عمل صالح اور دائمی رزق (یہ بھی مسلمان کو میسر ہوا۔

دودھ کی نہر دیکھنے سے مراد فطرہ صحیحہ اور شراب کی نہر سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے نشہ سے سرشار ہونا اور اس کی حرام کردہ اشیاء سے بغض رکھنا اور شہد کی نہر سے مراد علم اور قرآن کا حاصل ہونا نهر الكوثر في المنام نصرة على الاعداء بقوله تعالىٰ انا اعطينٰك الكوثر (تعطیر الانام ص 325) نہر کوثر کا خواب میں دیکھنا دشمن پر مظفر ہونے پر دلیل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انا اعطينٰك الكوثر سے مستنبط ہوتا ہے۔

معترض ذرا رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی مکی زندگی میں بے بسی کمزوری، مظلومیت پر نگاہ دوڑائے۔ پھر مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی کو اپنی آنکھوں کے سامنے لائے۔ پھر اس پر عیاں ہو جائے گا کہ کسی طرح غیب کی خبریں روز روشن کی طرح پوری ہوئیں۔

معترض نے چاندی سونے کے کنگنوں پر اعتراض کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے، حُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ (الدھر) يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ

اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (کہف)

حُلُّوا کا ترجمہ زیور دے گئے یُحَلَّوْنَ کا ترجمہ ہے زیور دیے جائیں گے۔

معترض کو یہ یاد رکھنا چاہیے یہ بھی ایک غریب عرب کو وعدہ تھا اور زبردست پیشگوئی تھی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے سراقہ بن مالک بن ھشم المدلجی کو اس وقت یہ خوشخبری دی تھی جب وہ رسول کریم ﷺ کو پکڑ کر اہل مکہ کے سپرد کر کے اونٹوں کا گراں بہا انعام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ پیشگوئی اس وقت پوری ہوئی۔ جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا۔ کسریٰ شہنشاہ کے کنگن مال غنیمت میں مدینہ پہنچے تو حضرت عمر نے اس عربی مدلجی کو وہ کنگن پہنائے۔ اور وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو رسول کریم ﷺ نے اس وقت کی تھی جب آپؐ بے بسی کے عالم میں مکہ سے نکل کر یثرب جا رہے تھے۔ یہ روایت تاریخ اسلام کی ہر کتاب میں موجود ہے۔

......☆☆☆......

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

سیرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم

محمد رسول اللہ

حصہ سوم

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ